رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
www.Paksociety.com

ابتدائیہ

مغربی ادب سے انتخاب

متفرق

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

سچی کہانیاں

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 ملنے کا مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

ڈنک

مشتاق احمد قریشی

کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں

پنجاب کے دل لاہور میں ڈینگی کی وبا کے بعد اچانک ایک سرکاری اسپتال میں تواتر کے ساتھ مریضوں کی اموات نے شہریوں میں خوف وہراس پھیلا دیا ہے۔ آخری اطلاعات تک اموات کی تعداد ایک سوپچیس سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس کا پہلا تاثر تو یہ سامنے آیا کہ یہ مریض دو دواؤں میں پائے جانے والے زہریلے مادے کے باعث ہلاک ہوئے یعنی زندگی بخشنے والی دوا قاتل بن گئی۔ حسب معمول اور حسب عادت حکومت نے سب سے پہلے عملے کے خلاف کارروائی کی پھر دواساز اداروں کا نمبر آیا یہ دوا اسپتال کو تین دوا سازاداروں اور عالمی ادارۂ صحت کی جانب سے فراہم کی گئی تھی۔ حکومت کے ساتھ ساتھ ان واقعات کا سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھی نوٹس لیا اور تینوں دواساز اداروں کے مالکان کو فوری گرفتار کرلیا گیا۔ ان اداروں کا موقف ہے کہ اس دوا میں جو زہریلا عنصر پایا گیا جس کی وجہ سے اموات ہوئیں وہ اس دوا کی تیاری میں استعمال ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ ادویات غیر محفوظ طریقے سے رکھنے کے باعث خراب ہوئیں۔ یعنی یہ ادویات خراب ہونے کے باعث موت کا سبب بنی یا پھر یہ زہر اسپتال ہی میں ان ادویات میں شامل کیا گیا۔ جس کے بعد عدالت نے ایک غیر رجسٹرڈ ادارے کے مالک کے سوا دواداروں کے مالکان کو شخصی ضمانت پر رہا کر دیا وفاقی حکومت نے حسب عادت اس کا الزام صوبائی حکومت پر دھرا ہے کہ ان کی ناقص پالیسیوں کے باعث ایسا ہوا اور پنجاب حکومت نے بھی حسب معمول اپنی توپوں کا رخ وفاق کی جانب کر دیا۔ اس طرح ایک انسانی مسئلہ سیاسی مسئلہ بن کر رہ گیا۔ مرنے والے ایک سوپچیس افراد جن میں خواتین بھی ہیں اور مرد بھی۔ بچے بھی ہیں اور ضعیف افراد بھی۔ ان کے لواحقین حیران اور پریشان ہیں کہ کس کے ہاتھوں پر اپنے پیاروں کا لہو تلاش کریں۔ پنجاب حکومت ہو یا وفاقی حکومت دونوں نے ہی اپنے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے ہیں۔

ایک بار خلیفہ دوئم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر فرمایا تھا کہ اگر فرات

کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک اور پیاس کے مارے ہلاک ہوگیا تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گا۔ واضح رہے اس دور میں مدینہ منورہ اور عراق کا فاصلہ مہینوں پر محیط تھا۔ یعنی مسلمان حاکم کے نزدیک ایک جانور کی اتنی اہمیت ہے پھر انسان کی کتنی اہمیت ہوگی۔ ہمارے حکمرانوں کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انسان بے بسی کے عالم میں کبھی وبائی امراض تو کبھی دھماکوں، ڈرون حملوں میں مرتے رہتے ہیں اور وہ چند روپوں کی امداد کا اعلان اور وہ بھی صرف اعلان کی حد تک کر کے رہ جاتے ہیں۔ کوئی بھی حاکم ذمہ داری کے کٹہرے میں آنے کو تیار نہیں کہ اسے استثنیٰ حاصل ہے۔ وہ جواب دینے کا پابند نہیں۔ خلق خدا مرتی ہے تو مرتی رہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کا تو یہ عالم تھا کہ ایک عام آدمی کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ یا امیر المومنین مال غنیمت میں سے کپڑا تو آپ کو اور مجھے یکساں ملا تھا۔ مگر آپ کے کرتے میں کپڑا زیادہ کیوں؟ اور عرب سے لے کر ایران تک حکومت کرنے والا خلیفہ ہاتھ باندھے قاضی کے سامنے انصاف کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، مگر آج ایک سوپچیس افراد کی ہلاکت کے بعد کوئی ہمیں یہ بتانے کو تیار نہیں کہ یہ ناقص ادویہ اسپتالوں تک کیسے پہنچیں۔ غیر رجسٹرڈ ادارے سے ادویات خریدنے کی منظوری کس نے دی اور کس نے کتنا کمیشن کھایا؟ اسپتال میں ادویات کا معیار جانچے بغیر اس کے استعمال کا ذمہ دار کون ہے؟ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے۔ ''قسم ہے وقت کی بے شک انسان خسارے میں ہیں۔'' اس خسارے سے صرف وہی لوگ بچ سکتے ہیں جن کا ایمان کامل ہو اعمال صالح ہوں جو دوسروں کو حق و سچ کی نصیحت کرتے ہوں بلکہ خود بھی اس پر عمل کرتے ہوں۔ جو صبر کرتے ہوں اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہوں۔ جو اقتدار اعلیٰ کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھتے ہوں۔ ہم سب نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ مگر اس کے حضور جا کر ہم سب نے اپنی زندگی بھر کے اعمال اور موت کا حساب دینا ہے۔ خواہ وہ صدر مملکت ہو وزیر اعظم ہو وزیر اعلیٰ ہو یا کوئی وزیر اور حزب اختلاف کا رہنما ہو۔ وہاں کسی کو استثنیٰ حاصل نہیں ہوگا۔ کوئی بھی دنیا میں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ اہل پاکستان کو ایمان حق سچ کی دولت سے سرفراز کرے اور چوروں، لٹیروں، جعل سازوں، بے ایمانوں سے بچائے اور اپنی پناہ نصیب فرمائے۔ آمین

گفتگو

عمران احمد

> ایمان واسلام کی علامت
> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان ومال کے بارے میں امن میں ہوں اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو نافرمانی کی راہ ترک کردے۔" (مشکوٰۃ)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

ماہ مارچ کا شمارہ حاضر ہے۔

اس ماہ لاہور میں ایک المناک سانحہ پیش آیا' ویسے تو سانحات ہمارا مقدر بن گئے ہیں۔ کبھی بارشوں سے تباہی کی خبر آتی ہے۔ کبھی زلزلے اور سیلاب سے بربادی کی کہیں حادثات سے درجنوں ہلاکتوں کے واقعات رونما ہوتے ہیں تو کہیں ڈینگی مچھر سیکڑوں گھروں میں صف ماتم بچھا دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ جیسے تسبیح کے دانے گر رہے ہیں۔ جس کا تذکرہ احادیث میں کیا گیا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ کیا قدرت نے فیصلہ کرلیا ہے؟ کیا یہ سب قدرتی واقعات وآفات ہیں؟ اگر ہم بنظر غائر ان واقعات وحادثات کا تجزیہ کریں تو ہمیں قدرت سے زیادہ اس میں انسانی ہاتھ کارفرما نظر آئے گا لیکن اس کے باوجود ہم اللہ کو موردِ الزام ٹھہرانے پر تلے رہتے ہیں۔ اس رب رحیم وکریم کو جو کہتا ہے میں اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ ماں کے پیار کا اندازہ اور تجربہ ہم سب ہی کو ہے۔ بچہ چھینک بھی مار دے اسے ذرا سی حرارت ہی ہوجائے تو ماں رات جاگ کر گزار دیتی ہے۔ اپنی اولاد کے لیے وہ جان تک دے دیتی ہے۔ جب ایک ماں کا پیار اتنا ہے تو اس کی شفقت کتنی ہوگی جو ستر ماؤں سے زیادہ ہم سے پیار کرتا ہے کیا وہ ہمیں بھوک پیاس سے بلکتے' بیماریوں سے سسکتے دیکھ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں ہم نے خود اس کے نظام سے چھیڑ خانی کرکے فضاؤں کو آلودہ کیا۔ جنگل اجاڑ کر طوفانوں اور سیلابوں کو دعوت دی۔ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ ایڈز ڈینگی اور دیگر بیماریوں کے جراثیم لیبارٹریوں میں تیار کیے گئے اور تجربہ گاہ افریقہ اور غریب ایشیائی ممالک کو بنایا گیا۔ جعلی ادویات تیار کرنے اور سپلائی کرنے والے اللہ کے فرشتے نہیں ہم جیسے انسان تھے۔ اشیاء کی گرانی کی ذمہ دار قدرت نہیں بلکہ ہم خود ہیں حادثات کے ذمہ دار بھی ہم خود ہیں اسے بھی ہم ناگہانی نہیں کہہ سکتے۔ فرصت کے لمحات سے چند گھڑیاں کشید کرکے آئینہ میں اپنا جائزہ ضرور لیجیے گا۔ شاید آپ کو ہم سب کو اپنے اندر چھپا ابلیس نظر آجائے۔

رواں ماہ سے ہم قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لیے "اسماء الحسنیٰ" کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ یہ تحریر وتحقیق جناب حسام بٹ کی ہے۔ یقیناً یہ سلسلہ آپ کو پسند آئے گا۔

اب آیئے اپنے تلخ وشیریں ناموں کی طرف پہلا خط ہے۔ منگلا ڈیم ضلع جہلم سے ریاض حسین قمر کا! آپ لکھتے ہیں۔ محترم ومکرم جناب عمران احمد صاحب سلام مسنون! امید ہے کہ آپ مع تمام اسٹاف کے باخیریت ہوں گے۔ گزشتہ ماہ نامہ ارسال کیا تھا۔ شاید ڈاک کی نذر ہوگیا۔ خدا اس محکمہ کو ہدایت عطا فرمائے۔ جب سے ڈاک کا لفافہ چار روپے سے یکدم آٹھ روپے کا ہوا ہے۔ اس محکمہ کی بے قاعدگی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ ہمارے وطنِ عزیز میں دستور ہے کہ چیز مہنگی ہوتی ہے تو اس کا معیار بھی گر جاتا ہے۔ فروری کا نئے افق باصرہ نواز ہوا۔ اس دفعہ ٹائٹل کافی منفرد تھا۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے "سیاسی ہوا کا تازہ جھونکا" عنوان کے تحت سیاسی صورتِ حال پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ خدا کرے قوم کی توقعات کسی طور پوری ہوں اور اس اکھڑی سانسوں والی قوم کی سانس میں سانس آئے۔ ویسے تو ہر نئے آنے والے مداری سے توقعات وابستہ کرتے کرتے پینسٹھ سال ہونے کو آئے ہیں اور ہم نے منزل کی مخالف سمت خیر سے کافی لمبا سفر طے کرلیا

ہے۔ عمران بھائی گفتگو کے آغاز میں آپ نے مہنگائی کے جس منہ زور گھوڑے کا ذکر کیا ہے وہ بے لگام بھی ہے اور اس کی دولتیوں نے قوم کو ادھ موا کردیا ہے۔ آج آپ ایک چیز سو روپے کی لاتے ہیں تو کل وہ چیز ایک سو پچاس روپے کی ہوجائے گی کوئی بھی یہ نہیں بتا سکے گا کہ ایک سو کے پیچھے پچاس کیسے بڑھ گئے۔ تاجر لوگوں نے مہنگائی کو بہانہ بنا کر اپنے منافع کی شرح میں بے پناہ اضافہ کرلیا ہے۔ گفتگو میں جناب محمد ارشاد قریشی کا دعائیہ خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ خداوند قدوس اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ان کی دعاؤں کو قبول فرمائے آمین۔ جناب مجاہد ناز عباسی صاحب نے سب دوستوں کو یاد رکھا شکریہ۔ مجاہد ناز عباسی صاحب جناب ریاض بٹ صاحب نے جریدے پر بھرپور تبصرہ کیا۔ محمد اسلم جاوید صاحب کا خط بھی ان کی شاعری کی طرح قابلِ ستائش ہے۔ عبدالحکیم ساجد صاحب کا تبصرہ خوب ہے۔ عبدالحکیم ساجد بھائی آپ نے میرے بیٹے کی شادی پر مبارک باد دی ہے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جناب سید عبداللہ شاہد کے خط نے طوالت کے باوجود بڑا مزہ دیا۔ شاہد جی آپ نے جس اپنائیت سے میرے بیٹے کی شادی کی مبارک دی ہے۔ وہ لائق تحسین ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہر میدان میں کامیابی عطا فرمائے۔ عصمت اقبال عین صاحبہ آپ کا کلام ماشاء اللہ دن بہ دن نکھرتا جارہا ہے۔ خط میں بھی انفرادیت ہوتی ہے۔ بیٹے کی شادی پر مبارک باد کا بے حد شکریہ۔ جاوید اقبال ورک صاحب تجاویز کے ساتھ تشریف لائے۔ جاوید جی آپ کی پہلی تجویز میری سوچ کے مطابق قابلِ عمل نہیں ایک پورا ناول ایک شمارے میں دینے سے بہت سی تحاریر چھپنے سے رہ جائیں گی۔ جناب محمد بخش لنگاہ صاحب حسب سابق سب کے لیے نیک تمنائیں لے کر تشریف لائے ہیں۔ اصل میں وہ اس بزم کی جان ہیں۔ خدا انہیں صحت' تندرستی اور عمر دراز عطا فرمائے آمین۔ عبداللہ عاطر صاحب محفل میں تشریف لائے۔ بہت خوشی ہوئی۔ محترمہ قمر جہاں صاحبہ کی تکالیف کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدائے لم یزل انہیں صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے آمین۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ اس بار بزم میں تشریف نہیں لائیں کمی شدت سے محسوس ہوئی اور بھی کئی ساتھی اس بار محفل سے غائب تھے۔ خدا سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ اقرأ میں لائق صد احترام جناب طاہر قریشی صاحب نے وعدہ خلافی کے بارے میں احادیث کی روشنی میں ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ جن باتوں کو ہم معمولی سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جناب روبین احمد نے بزم سخن خوب سجائی ہے۔ شعروں کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ خوش بوئے سخن میں محترمہ سیما بنت عاصم نے اچھی اچھی غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب میں کامران شاہ کامی' عصمت اقبال عین' رابعہ حسن صابر لنگاہ' محمد ارشاد قریشی' محمد عبداللہ عاطر' محمد اسحاق انجم' عمیر قدیر بھٹی' زین شانی اور محترم پروفیسر واجد نگینوی کا کلام پسند آیا باقی شعراء سے گزارش ہے کہ وہ اپنا کلام کسی مقامی اچھے شاعر کو دکھالیا کریں۔ باقی جریدے کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔

شہناز بانو...... کراچی! محترم بھائی عمران احمد! بہت خوش رہیں۔ ادارہ نئے افق اور تمام قارئین کے لیے اللہ کی رحمت کی ڈھیر ساری دعاؤں کے بعد عرض ہے کہ سنائیں آپ سب کیسے ہیں۔ اللہ کرے سب خیریت سے ہوں۔ ماہ فروری کا پرچا وقت پر موصول ہوگیا۔ اس لیے مطالعہ بھی ہوگیا اور آپ سب سے مخاطب ہونے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ سارے قارئین جنہوں نے میری تحریر گردش کا خیر مقدم کیا اور پسند کیا۔ ان سب کا شکریہ۔ میں ان شاء اللہ پوری کوشش کروں گی کہ آپ سب کے معیار اور توقعات پر پوری اتر سکوں۔ آپ سب بھی میرے لیے دعا کیجیے گا کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحت اور ہمت دے کہ میں اس کام کو بہ حسن وخوبی انجام دے سکوں۔ اچھے بھائی عبداللہ شاہد آپ کی حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ بھائی محمد ارشاد قریشی آپ کی ناسازی صحت کے بارے میں جان کر تشویش ہوئی میری دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کو صحت کلی عطا کرے۔ بھائی افقیر محمد بخش لنگاہ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ اللہ آپ کو بھی صحت عطا فرمائے۔ بھائی ریاض بٹ کیسے مزاج ہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے آپ کی "تلاش مجرم" اچھی تھی۔ آپ سے ایک شکایت ہے کہ آپ نے اتنا لمبا چوڑا خط لکھا لیکن گردش کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آپ کو میری نظم پسند آئی بہت شکریہ۔ محمد اسلم جاوید صاحب آپ نے بہت خلوص کے ساتھ نئے افق کے اسٹاف اور قارئین کو دعائیں دی ہیں اللہ کرے کہ وہ سب دعائیں آپ کو بھی لگ جائیں۔ آپ صحت مند رہیں۔ سدا سلامت رہیں اور ہمارے ساتھی بنے یوں ہی تبصرہ کرتے رہیں۔ تبصرہ کرنا آپ کو مشکل فن کیوں لگتا ہے؟ بس سچائی کے ساتھ جو محسوس کریں وہی لکھ دیں۔ عبدالحکیم ساجد صاحب آپ کے تخن آباد والے دیگر ساتھی کہاں غائب ہوگئے۔ سب کی خیریت

مطلوب ہے۔ بھئی اگر کسی سے کوئی شکوہ اور شکایت ہے تو آ کے دور کرلیں۔ ناراض ہو کر الگ ہو جانا اچھی بات نہیں ہے۔ گردش کے سلسلے میں آپ نے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اللہ کرے میں آپ کی توقعات پر پوری اتروں۔ عبداللہ شاہد آپ کو شاذ نے جو چیلنج دیا تھا اسے آپ نے بہت اچھی طرح سے پورا کیا ہے اس کی گواہی تو تمام قارئین دیں گے۔ آپ نے بہت تفصیل کے ساتھ بہت بہترین تبصرہ کیا ہے۔ آپ نے شکایت کی ہے کہ میں نے گردش لکھنے کی ذمہ داری کیوں قبول کرلی تو بھئی کیا کریں۔ عمران احمد میرے بہت بہت پیارے بھائی ہیں۔ انہوں نے بھی بڑے مان سے کہا۔ (مجبور نہیں کیا) تو میں انکار نہ کرسکی۔ رہی الگ طویل کہانی کی بات تو نئے افق میں یہ پابندی لگی ہے کہ ایک ہی رائٹر کی بہ یک وقت دو کہانیاں شائع نہیں ہوسکتیں۔ مجبوری ہے۔ آپ کو انتظار تو کرنا پڑے گا فی الحال آپ شہنی کی کہانیوں سے اپنی تسکین کا سامان کریں۔ اس ماہ شہنی کی کہانی میں نے ہی شہنی کو سنا کر کہا تھا کہ تم اسے لکھو۔ یہ میری خود کی بچپن کی کہانی ہے۔ شہنی نے اسے اپنے انداز میں اچھی لکھی ہے۔ دسمبر میں پاکستان ٹور پر جانا ہوا تو آزاد کشمیر بھی گئے نازش کو پتا چلا تو اس نے ایس ایم ایس اور فون کر کر کے مجھے مجبور کردیا کہ میں اس کے گھر جاؤں۔ میری پوری فیملی ساتھ تھی۔ نازش نے جس خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا اور خاطر تواضع کی اس کے تشکر کے لیے میری پوری فیملی کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ خاص طور پر میرے ہزبینڈ کو نازش بہت پسند آئی۔ وہ بھی اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔ ارشد اسعد مہوش سب تمہارا بہت شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ نازش نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی بہت سی چیزیں مجھے گفٹ کیں۔ خاص طور پر تمہارا میرے نام کا پینٹ کیا ہوا مگ' نازش میں نے اسے اپنے بیڈروم میں سجا کر رکھ لیا ہے۔ تاکہ وہ کبھی خراب نہ ہو' تمہاری امی بھی بہت اچھی لگیں۔ اب ان کی طبیعت کیسی ہے۔ میرا اسلام کہنا۔ پنڈی میں میرا بہت دل چاہا کہ اگر میرے پاس جاوید مقبول صدیقی صاحب کا کونٹیکٹ نمبر ہوتا تو ان سے بھی ضرور ملاقات کرتی۔ لاہور صرف ایک رات کے لیے آنا ہوا۔ طاہرہ جبیں سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ طاہرہ اتنے کم وقت میں سب لوگ یہ چاہ رہے تھے کہ وہ تفریح کریں۔ میں اکیلی تم سے ملنے کیسے آتی اس لیے میں نے تمہیں ہوٹل میں بلایا تھا مگر تمہاری طبیعت خراب تھی۔ پھر لاہور سے ہی ہم کراچی واپس آگئے۔ پلیز تم ناراض مت ہو دوستی میں امیری غریبی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مہوش کے بہت سے رشتے دار لاہور میں ہیں لیکن وقت کی کمی کے سبب کہیں نہیں گئی۔ زندگی بخیر رہی اور دوبارہ لاہور آنا ہوا تو ضرور ملاقات ہوگی۔ عصمت اقبال عین صاحبہ آپ کا منگلا ڈیم تو مجھے بے حد پسند آیا۔ بہت پرسکون جگہ ہے۔ بھائی فقیر لنگاہ تو لگتے ہیں کہ اپنی بہن سے بہت زیادہ ناراض ہیں۔ محفل میں ہم سے منہ پھیرے بیٹھے رہے۔ سلام دعا بھی نہیں کی۔ کیسے ہیں بھائی آپ طبیعت کیسی ہے؟ اللہ آپ کو صحت مند اور سلامت رکھے۔ بھئی ناراض مت ہوا کریں۔ بھائی ناراض ہو جائیں تو بہنوں کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ہائے قمر جہاں تمہیں کیسے چوٹ لگ گئی۔ اللہ کرے تم جلدی سے فٹ فاٹ ہو جاؤ' تمہاری کہانی مجھے بہت اچھی لگی۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ جب کوئی تکلیف دیتا ہے اور اس کا بندہ اس تکلیف کو صبر سے برداشت کرتا ہے تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھاڑ دیتا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں صحت کلی عطا فرمائے آمین۔ اب ذرا کہانیوں پر تبصرہ ہو جائے۔ کہانیوں میں اقرار گناہ' کینہ پرور' نیا سورج' پدر گرفتہ' تلاش مجرم بہترین لگیں۔ مغربی ادب سے اقرار محبت زیادہ اچھی لگی۔ حسام بٹ کی "بازی گر" بھی پسند آرہی ہے۔ خوش بو سخن میں نور صبا' محمد ارشاد قریشی اور محمد اسحاق انجم کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ آج کل پاکستان کے سیاسی حالات ایک نیا موڑ اختیار کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ کوئی مرد مومن اور مرد آہن ہمارا سربراہ بنے۔ دعویٰ تو سب کرتے ہیں لیکن اقتدار میں آنے کے بعد......! سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہم اچھا حکمراں چاہتے ہیں کہ تو ہمیں خود اپنی سوچ اور عمل کو بدلنا ہوگا۔ یہ یاد رکھنا ہوگا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہماری شریعت نافذ ہونے کے لیے ہے۔ جس کے لیے ہم سب کو کوشش کرنی ہوگی۔ خط بہت طویل ہو گیا ہے۔ گردش پر آپ سب کا تبصرہ چاہیے تاکہ میں بہتر کام کرسکوں۔ اس ماہ بہت سے ساتھی غائب ہیں۔ جناب جاوید مقبول صاحب آپ کے خطوط میں دوسرے ماہناموں میں پڑھ رہی ہوں۔ اس لیے آپ نئے افق سے غائب ہیں۔ واپس آجائیے جناب ہم آپ کو کہیں اور جانے نہیں دیں گے۔ آخر میں میری ایک تجویز ہے میں عمران بھائی سے کہہ رہی ہوں کہ وہ بھی نئے افق کا خوفناک نمبر یا پراسرار نمبر نکالیں۔ آپ سب کا کیا خیال ہے۔ ضرور بتایئے گا ایک ہی موضوع پر بہت سی کہانیاں پڑھنے کے لیے ملیں گی۔ اچھا بھئی اجازت دیں زندگی بخیر رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اس دعا کے ساتھ اللہ حافظ کہ سب خوش باش اور صحت مند رہیں۔ ہمارے ملک سے بھوک افلاس اور بدامنی ختم ہو جائے آمین

ریحانہ سعیدہ...... لاہور! محترم جناب عمران صاحب! السلام علیکم! خدا سے دعا گو ہوں کہ یہ نیا سال ہمارے پاکستان کے لیے اور تمام مسلم امہ کے لیے بہترین ہو۔ اللہ تعالیٰ ہماری مشکلات کو حل کرے۔ اس سے پہلے کہ آپ لوگ مجھے بھول جاتے۔ میں اپنے معصوم سے تبصرے ایک افسانے اور چند نظموں کے ساتھ حاضر ہوں۔ جناب کرپشن اور لوٹ مار' منافقت اور سیاسی چکر بازیوں کے سونامی میں گھرے ہمارے سیاست دان جو اپنے آپ کو انقلابی بھی کہتے ہیں اور چلن گزشتہ کرپٹ لوگوں جیسا اختیار کرتے ہیں۔ معاشی اور معاشرتی استحصال میں پسی ہم غریب عوام اور آپ کا دلچسپ رسالہ اوے ہوئے جیسے غریب' بھوکے کو ایک دم سے باربی کیو مل جائے۔ الماس صاحب نے ہسٹری جو کبھی کالج لائف میں بھی نہیں پڑھی تھی بیت المقدس پڑھتے ہوئے یاد کروادی۔ جناب اس میں داستان کی چاشنی بھی ڈالیں۔ جناب نسیم حجازی کی طرح کہ تاریخ بھی پڑھ لیں اور بوریت بھی نہ ہو۔ اسرار احمد کی پراسراری کہانی دلچسپ تھی۔ انتقام ہو تو ایسا ہو۔ راحیلہ تاج نے ایک نیا خیال متعارف کروایا ہے کہ آئس میں انڈر اسٹینڈنگ کے لیے گلاب کے پھول اور تاج محل ہی ضروری نہیں۔ گائے' بلی' مرغا بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اقبال بھٹی نے دلچسپ ترجمہ کیا ہے۔ بازی گر سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ تو حسام صاحب اس سے اندازہ لگالیں کہ میں آپ کی فین ہوگئی ہوں۔ Well Done نیا سورج کا تھیم اچھا تھا۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم اس کو ماڈرن سمجھتے ہیں جو عریاں ہوں ہمیں ذہنی طور پر بولڈ ہونے کی ضرورت ہے۔ ہماری ذہنی اپروچ ہمارا موڈ بناتی ہے۔ اف شہناز آپی آپ لاہور آئیں اور زندہ دلان لاہور سے یعنی ہم سے مل کر بالمشافہ ملاقات نہیں کی مانا کہ یہاں گیس پرابلم تھی پر ہم باربی کیو کر لیتے آپ نے تو ہمیں مہمان نوازی کا موقع ہی نہیں دیا بس جی ہم آپ کی گردش کی طرح گردش میں آگئے۔ پکی ناراضگی اس لیے اب گردش پر تبصرہ نہیں کروں گی۔ اس سے پہلے کہ آپ غصے میں آجائیں۔ میں آپ کو بتادوں کہ بازی گر کے بعد میں فوراً گردش پڑھتی ہوں۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں اور اے حمید صاحب کو تو میں بہت بچپن سے پڑھ رہی ہوں۔ اس دفعہ ''خطروں کا کھلاڑی'' دلچسپ قسط تھی۔ واقعی جناب اے حمید تو نمبر ون یعنی اے ہیں ہیں بلکہ ''اے پلس''۔ ابن مقبول جاوید کے سنہری الفاظ دو تین چیزیں اچھی لگیں اور اس سے سیکھا بھی۔ رابعہ حسن کی نظم پسند آئی۔ عبدالرحمٰن کی ''چوہے'' بھی حقیقت کی عکاس تھی۔ تبصرہ طویل نہ ہو جائے اس لیے اب اجازت چاہتی ہوں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال! السلام علیکم! ماہ فروری 2012ء کا شمارہ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ منفرد سرورق سے مزین ہے۔ دھند میں لپٹا ہوا پرندہ ایک الگ کہانی سنا رہا ہے۔ اس بار میری کہانی پھر موجود ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی اور تمام قارئین کی پسندیدگی میرے اندر لکھنے کا جذبہ جوان رکھے ہوئے ہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی سیاسی ہوا کا تازہ جھونکا۔ موجودہ حالات کی بالکل سچی تصویر پیش کر رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ واقعی عمران خان کی آمد (سیاست میں) ہوا کا تازہ جھونکا ہی ثابت ہو اور وہ قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو اس طرف لے جائے جہاں خوش حالی ہو' امن ہو اور سکون کے لمحے ہوں آمین ثم آمین۔ اب بڑھتے ہیں اپنی رنگارنگ محفل کی طرف یہاں پر عمران احمد صاحب کی تلخ باتیں ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے تلخ حقیقت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ویل ڈن عمران بھائی۔ آپ نے قلم کا حق ادا کردیا ہے۔ محمد ارشاد قریشی صاحب آپ کے خیالات ارفع و اعلیٰ ہیں۔ محمد ناز عباسی آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ جو عزت اور پزیرائی ہمیں نئے افق کی طرف سے ملتی ہے اس کا کوئی بدل نہیں' کوئی ثانی نہیں۔ سید عبداللہ شاہد آپ کا خط گو کہ طویل ہے۔ لیکن خاصا موثر اور جامع ہے بھائی پچھلی بار شاید میرا خط محکمہ ڈاک والوں کی نظر عنایت کا شکار ہو گیا تھا۔ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اب مل گیا ہو۔ میری تحریر کردہ کہانی زرگزیدہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ بہن عصمت اقبال عین خدا آپ کا اقبال بلند کرے میری کہانی زرگزیدہ آپ کو بھی پسند آئی بہت شکریہ۔ بھائی فقیر محمد اشرف لنگاہ اور برخوردار حسنین و ثقلین لنگاہ آپ کے خطوط محفل کی جان ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں کو میری کمی محسوس ہوئی۔ یہ تو

آپ کی محبتیں ہیں جو مجھے سنبھالے ہوئے ہیں۔آپ سب کی صحت اور سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔میری تحریر کردہ کہانیاں پسند کرنے پر یہ بندۂ ناچیز مشکور و ممنون ہے۔محمد عبداللہ عاطر آپ کی حاضری بھی اطمینان کا باعث ہے۔بہن قمر جہاں آپ کی کہانی کینہ پرور پسند آئی۔خدا بزرگ و برتر آپ کو صحت دے آپ کا پاؤں ٹھیک ہو جائے اور پہلے کی طرح آپ زندگی کی بہاریں لوٹ سکیں۔آمین۔اب بات ہو جائے باقی کہانیوں کی۔الماس ایم اے کی بیت المقدس ہمیں تاریخ کے جھروکوں سے روشناس کروا رہی تھی اور ہمارے لہو کو گرمائی ہوئی ہمارے ایمانی جذبوں کو جھنجوڑ رہی تھی۔بہت خوب الماس صاحب۔ ہمارے یہی جذبے تو سو گئے ہیں۔اسرار احمد کی سازشی ذہن ایک جاگتے ذہن کے حامل شخص کی داستان ہے۔لوگن نے خوب انتقام لیا۔اب ذرا بات ہو جائے بہن شہناز بانو کی سلسلے وار کہانی گردش کی۔زنجیر کے بعد یہ ایک اچھی کاوش ہے۔ قدم قدم چابکدستی سے کہانی کو آگے بڑھانا ان کا ہی خاصہ ہے۔واقعات کو بیان کرنا وہ بھی اس طرح کہ بوریت نہ ہو۔ان کے قلم کا ہی کارنامہ ہے۔بہر حال نظر یہی آ رہا ہے کہ جوں جوں کہانی آگے بڑھے گی ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لے گی۔اس بار پھر شہنی ارشاد اقرار گناہ میں ایک اچھی کہانی لے کر آئیں ویل ڈن۔بہن امید ہے یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔باقی کہانیوں میں ناز سلوش ذشے کی پریشان لمحات طاہرہ جبیں کی خالی دامن اور پدر گرفتہ یونس خلش کی پسند آئیں۔جی تو چاہتا ہے کہ ان کہانیوں پر بھی تفصیل سے تبصرہ کروں لیکن اگر خط زیادہ لمبا ہو گیا تو کسی اور بہن بھائی کی حق تلفی ہو گی کیونکہ ہر خط لکھنے والا یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کا خط شائع ہو۔

عالیہ انعام الٰہی...... کراچی! محترم عمران بھائی! السلام علیکم امید ہے کہ رب تعالیٰ کے حکم سے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔آپ کی ہمت قوی اور حوصلہ بلند کا انداز و یقین نئے افق کے ہر ماہ شائع ہونے والے خوب سے خوب تر شمارے سے ہوتا رہتا ہے اور دل مستقل آپ کی ترقی و کامرانی کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ہر کسی کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے ہر ماہ پرچا جاری کرنا واقعی ایک مشکل ترین کام ہے جیسے کہ روزانہ ایک بھرے پرے خاندان کی پسند و ناپسند کے مطابق کھانے کا مینو تیار کرنا جس میں ہم جیسی اکثر خاتونِ خانہ ناکام نظر آتی ہیں۔آپ نے میری رائے کو اہم جان کر سرورق کے حوالے سے جو تبدیلی کی ہے تو یقین جانیں دل خوش ہو گیا ہے۔روایتی میگزین سے ہٹ کر ماڈلز کی تصاویر کی اشاعت سے یہ گریز بہت اچھا لگا۔یقیناً مجھے یہ خوش فہمی نہیں کہ ایسا میرے کہنے سے ہوا ہے بلکہ یہ بہت سے قارئین کی آرا اور تقاضے کے باعث ہی کیا گیا ہو گا۔نئے افق کا اس ماہ کا سرورق بھی آپ کو تصور کی ایک ایسی دنیا میں کھینچ کر لے جاتا ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا یقیناً کافی مشکل ہے۔ایک بکھری ہوئی اور ویران دنیا کا تصور جہاں زندگی کی رونق ایک سراب کی صورت نل سے بہتے ہوئے پانی اور امید کی چڑیا کے وجود سے ملتا ہے۔زندگی واقعی ایک ایسی شے ہے جو جنگل کی اداسی میں کسی درندے کی بھیانک چاپ کی صورت میں بھی ابھر سکتی ہے اور بہتے ہوئے پانی کے جلترنگ میں بھی چھپی ہوتی ہے۔آگے چلیے تو مشتاق انکل موجودہ سیاسی منظر نامے پر طاری تبدیلیوں کا احوال لیے بیٹھے تھے۔ان کا نقطہ نظر جان کر اور ان کی فکر کا انداز دیکھ کر ہم کو کافی اچھا لگتا ہے۔اچھا تو ہمیں اس وقت بھی لگتا ہے جب ہم خود کو گفتگو کی محفل میں شریک پاتے ہیں۔مگر اکثر اپنی ہی نالائقی کی بدولت اس اعزاز سے محروم رہ جاتے ہیں۔آپ بھی شکر ہے کہ کبھی کبھار اپنی رائے اور نقطہ نظر کے اظہار کے ساتھ دکھائی دینے لگے ہیں۔جو کہ کافی اچھا ہے ورنہ ہم تو ہمیشہ کم گوئی سے شاکی رہے ہیں۔خاص طور سے جب خطوں میں موجود جواب طلب باتوں کے باوجود آپ زحمت گویائی سے گریز کیا کرتے ہیں تو الجھن ہوتی ہے آپ ضرور بولتے رہا کریں کہ دل کو اچھا لگتا ہے بخش انکل کے محبت بھرے انداز نے دل خوش کر دیا۔جب یقین ہو کہ کوئی آپ کی فکر کرتا ہے دعا میں آپ کو یاد رکھتا ہے تو بڑا اطمینان ملتا ہے۔زندگی کی تکلیفیں کافی کم لگنے لگتی ہیں۔میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ان دیکھے چاہنے والوں کی دعائیں اور محبتیں وافر مقدار میں میسر ہیں۔شہناز باجی کا خلوص اور محبت تو میرے لیے نعمت سے کم نہیں۔شہنی کی فکر میرے لیے مسرتوں کی پیامبر ہوتی ہے اور اب تو عبداللہ شاہد بھائی کی شکوہ کنائی بھی میرے لیے خوش قسمتی بنتی جا رہی ہے کہ وہ شکایت ہی سہی مجھے کسی قابل تو سمجھتے ہیں۔میں نے ان کی تعریف میں پچھلے سے پچھلے ماہ ایک بات کی تھی وہ نجانے کیوں دل پر لے گئے کہ پچھلے ماہ کافی غصے میں دکھائی دیے۔ان کے طنز نے مجھے میرے قلم کو گنگ کر دیا۔ان کے طنز نے میری گویائی چھین لی کہ

ہماری محبت کی گئی رائے زنی ان کے نزدیک لن ترانی ٹھہری اور عمران بھائی آپ کو بھی مجھ ناچیز کی باتیں سننے کا طعنہ سہنا پڑا۔ میں چاہتے ہوئے بھی جواب نہ دے سکی کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے رویے کے وار سے آپ اچانک مر جاتے ہیں۔غلط فہمی کا چابک اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کی طاقت سلب کر لیتا ہے۔کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا پھر اپنے آپ پر ہی ندامت محسوس ہوئی کہ زیادتی تو شاید مجھ سے بھی سرزد ہوئی ہے کہ ان کی اتنی محنت سے لکھی گئی تحریر ''کالی عورت'' کو قابلِ تبصرہ بھی نہ گردان سکی تو یقین جانیں اس تحریر کا مطالعہ ہی میں نے ان کی شکایت کے بعد کیا اور بڑا افسوس ہوا کہ یقیناً میری کوتاہی نے شاہد بھائی کو تکلیف پہنچائی کہ وہ اتنا سخت سست کہہ گئے۔ان کی تحریر بلاشبہ بہت خوب صورت اور پر اثر تھی۔جو میں تنگی وقت کے باعث پڑھ نہ سکی اس ماہ بھی وہ میری ذات کے حوالے سے کافی شاکی دکھائی دے رہے تھے۔شاہد بھائی اپنا دل میری طرف سے صاف کر لیں۔میں یقیناً خود کو نئے افق پر اجارہ داری کے قابل نہیں سمجھتی ہاں البتہ ایک طویل تعلق کے باعث خود کو زعم میں مبتلا ضرور پاتی ہوں۔ورنہ ہر کسی کا حق تسلیم کرتی ہوں۔ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ نئے افق کا ہر قاری بڑا صاف ذوق مطالعہ رکھتا ہے۔ورنہ ''دیناکی عریانیت'' سے آنکھوں کو سینکنے والے غلیظ بدذوق لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔خوب صورت چہروں کو دیکھنے کی معصوم سی خواہش میرے نزدیک کوئی قابلِ گرفت بات نہیں ہے۔تاریخ کے حوالے سے آپ کا نقطۂ نظر سو فیصد درست ہے مجھے یقیناً خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ویسے میرے نزدیک تاریخ کے وہ اوراق باعث عبرت ہیں کہ جب ہمارے اسلاف نے بہت سے مواقع پر اپنی روایات سے انحراف کر کے تاریخ کے صفحات ظلم و استبداد سے سیاہ کیے ہیں جس کی ایک لمبی لسٹ ہے۔اگر بیان کروں تو صحیح نہ ہو گا کہ ابھی کہانیوں پر تبصرہ باقی ہے۔باقی اگر آپ کی دل شکنی میرے ہاتھوں ہوئی ہے تو درگزر فرمائیں۔اقرا کے سلسلے کو ہم اپنے لیے نعمت خیال کرتے ہیں۔جو ہمیں سدھرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ ''سازشی ذہن'' یوں تو مغربی ماحول کا پس منظر لیے ہوئے تھی ورنہ درحقیقت یہ گھناؤنا موت کا کھیل ہمارے ملک کی سڑکوں پر عام طور پر کھیلا جاتا رہتا ہے۔جسے روکنے کے لیے کسی ادارے یا کسی فرد کے پاس ضمیر نامی جیسا بھی کوئی خیال موجود نہیں ہے۔ ''اقرارِ محبت'' ایک نرم گرم سی جذبوں کے اتار چڑھاؤ کی دلفریب تحریر تھی۔اچھے اور برے رویے معمول کی زندگی میں حصہ دار ہیں کہ ہمارے لیے راستوں کا تعین کرتے ہیں اور ہماری منزل تک رہنمائی کرتے ہیں۔ ''سچے موتی'' اخلاق و کردار کا پیکر بن کر مکروہ اور شیطانی کرتوتوں میں مبتلا گروہ کا احوال تھی۔نفسیاتی اور جذباتی ہتھکنڈوں سے معصوم اور بے ضرر لوگوں کو جرم میں شریک کر لینا واقعی کافی بھیانک خیال ہے جو اس تحریر کے ذریعے ہم تک پہنچا۔شہنی ارشاد کی ''اقرارِ گناہ'' یقیناً ایسے خاندانوں کے لیے تازیانہ تھی۔جو دولت کی چمک دمک کے لیے اخلاق کے چاند کو روپے کی سیاہی سے گہنا بیٹھتے ہیں۔جنہیں مال و دولت کی ہوس رشتوں کی حقیقتوں سے انحراف کی جانب مائل کر دیتی ہے اور جن کے باعث اچھی بھلی خوش حال زندگی عذاب بن جاتی ہے۔اپنے گھرانے کو آسائش اور آرام مہیا کرنے کی جستجو میں خود کو جدائی کی چکی میں پیسنے والوں کو بے رحمی سے استعمال کرنے والے سگے رشتوں کی سفاکی کی یہ کہانی کافی پر اثر تھی۔قمر جہاں کی ''کینہ پرور'' عورت کی بے رحمی کی سرشت کا احاطہ تھی۔جس نے عقل کو ششدر کر دیا کہ عورت سے وابستہ سفاکی کی داستانیں بہت دکھ دیتی ہیں۔قمر جہاں صاحبہ کے حوالے سے ان کی تکلیف جان کر بہت دکھ ہوا۔اللہ ان کی تکلیف کو دور کرے اور انہیں صحت عطا کرے۔اگر ممکن ہو سکے تو میں یہ مشورہ دینا چاہوں گی کہ وہ کراچی میں او ایم آئی کلینک میں ڈاکٹر محمد علی شاہ سے مل لیں کہ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی ہے۔یقیناً آپ کو بھی افاقہ ہو گا۔آپ کی تکلیف جان کر مجھے کافی دکھ ہوا ہے۔جو آپ کو شاید لفظ گری لگے مگر حقیقت بیان کرنے کی میں استعداد شاید نہیں رکھتی۔ ''نیا سورج'' ایک اچھے ذہن اور ایک اچھی سوچ کا مظہر تھی۔ ''پریشان لمحات'' پریشان کن سوچ کا احاطہ تھی۔جس کے آخری پیراگراف سے مجھے اختلاف ہے کہ برے حالات انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔اگر تفصیل سے بحث کی یقیناً ناراضگی پیدا ہو جائے گی۔طاہرہ جبیں لکھنا تو خوب جانتی ہے۔مگر ان کی تحریروں میں کہانی برائے نام اور واقعات بالکل عنقا ہوتے ہیں وہ بس صرف اپنی سوچ اور اپنے نقطۂ نظر کے لفظی اظہار میں مشغول دکھائی دیتی ہیں۔ ''پدر گرفتہ'' رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر تھی۔مگر ہمارے معاشرے میں بے راہ روی اور بے ضمیری اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ بے غیرتی کے عفریت نے ہر پاکیزہ رشتے کو اپنے کریہہ شکم میں ہڑپ کر لیا ہے اور رسوائیوں کی دھول میں ہر

نازک آبگینہ باآسانی رل جایا کرتا ہے۔ ریاض بٹ حسب سابق اپنے مخصوص اندازِ تحریر کے ساتھ ایک قتل کا کیس لیے حاضر تھے۔ ان کی تحریریں کچھ الگ ہی انداز اور رنگ لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ خاص طور سے بہت سی باتوں کو پوشیدہ رکھ کر وہ کہانی آگے دھکیل دیتے ہیں کہ تفصیل آگے چل کر بتاؤں گا۔ ایسا کر کے وہ اچھا سسپنس پھیلایا کرتے ہیں کہ پڑھنے والے چاہ کر بھی کہیں دھیان نہیں لے جا پاتے۔ شاذ بھائی کی غیر حاضری بہت کھلنے لگی ہے۔ بھائی کچھ تو خیر خبر دیں نہ کوئی خط نہ کوئی تحریر مجھے تو کافی تشویش ہونے لگی ہے۔ عمران بھائی خط کافی طوالت اختیار کر گیا ہے۔ اس لیے آپ کو مزید مشکل میں ڈالنے سے پہلے اختتام کر رہی ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ خدا حافظ

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد! السلام علیکم ورحمۃ خدائے برحق سے امید قوی ہے کہ آپ خیر وعافیت سے ہوں گے اور اپنی تمام وحدتوں وسعتوں اور جہتوں سے رسالے کی ترقی و سربلندی خوشحالی و زرخیزی اور ابدی نیرنگیوں کی غرض سے برسرِ پیکار ہوں گے۔ اراکین مجلس ادارت کے احباب محترم اقبال بھٹی صاحب' محترم طاہر احمد قریشی صاحب' برادر عفان احمد صاحب' سیما بنت عاصم صاحبہ' روبینہ احمد' اسرار احمد صاحب اور دیگر ممبران کی خدمت میں سلام مسنون عرض کرتا ہوں۔ آپ سب کی خدمت میں ماہِ جشن ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایمان افروز سعادتیں اور مسرتوں کو بطور تحفہ پیش کرتا ہوں' قبول فرمائیے۔ گزشتہ دنوں تقدیر کی یاوری سے ذاتی کام کے لیے کراچی آنا ہوا تو موقع غنیمت سمجھ کر آپ کے دولت کدے پر میرا مطلب ہے کہ نئے افق کے دفتر پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اپنی کرسی پر بنفس نفیس موجود تھے اور اقبال بھٹی سمیت دیگر احباب مجلس سے بھی شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ جب سے نئے افق سے قلبی وابستگی طے پائی ہے سچے جذبوں کا ادراک ہوا ہے عشق کے بارے میں جو سنا پڑھا ہے وہ مجاز سے حقیقت کی جانب انسان کو محوِ سفر رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ کی صحبت سے حقیقت میسر آ گئی۔ میں آپ سے مل کر دفتر سے باہر آیا تو میرے دل و ذہن میں سکون اور طمانیت کا احساس ہلکورے لے رہا تھا لیکن میری آنکھوں سے دھڑ دھڑ آنسو رواں دواں تھے۔ کیا ساون بھادوں کا یہ جھل تھل عشق کی توضیح ہے۔ سمجھنے سے قاصر و عاجز ہوں۔ بہر غرض فروری کا تازہ شمارہ بروقت موصول ہو گیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ بھی گزشتہ سے پیوستہ کی مانند خوف ناک اور ماورائی دنیا کے پیشِ نظر میں مادی دنیا کی تلخ حقیقت کو اجاگر کرتا سرورق دیکھ کر حیرت سے مبہوت رہ گیا۔ چھتنار درختوں کے دیو قامت اور خزاں رسیدہ ڈھانچوں کے بیچ و بیچ دروازہ کسی جہانِ حیرت کی جانب کھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ ظن و تخمین انگشت بدنداں رہ گئے تھے اور خوف و دہشت سے رگ و پے میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ اللہ عزوجل مملکتِ خداداد کی حفاظت فرمائے آمین۔ اس دفعہ محترم بابا مشتاق قریشی کی دستک "سیاسی ہوا کا تازہ جھونکا" پاکستان کی غریب عوام کو تحریک انصاف کے بردبار لیڈر عمران خان کی پرجوش کوششوں سے آگاہ کرتے ہوئے ڈھارس دے رہے تھے۔ عرصہ دراز سے ہم عمران خان صاحب کی پاکستانی رعیت اور حکومتی ملوکیت پر حب الوطنی سے سرشار پرخلوص بیانات کی گونج سنتے آئے ہیں۔ اس دوران ولال قسم کے لوگوں کے منہ سے ان کی ذات وشخصیت کا تمسخر اڑاتے کہتے آئے ہیں کہ خان صاحب چند مخصوص حلقوں تک محدود ہیں اور پی پی نون لیگ (مسلم لیگ) کی اکثریت کی حامل پارٹیوں کے مابین کیا انقلاب برپا کر پائیں گی گزشتہ چار برسوں میں مذکورہ دونوں جماعتوں کی نااہلی نے ملکی معیشت کو بدحالی کی انتہاؤں تک پہنچا دیا۔ تمسخر اڑانے والے ٹولے نے تحریک انصاف کے عوامی جلسوں کے منہ زور سیلاب کو دیکھ کر حیرت کے مارے میں منہ میں انگلیاں داب لی ہیں۔ یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ آزمودہ عمران خان پاکستان کی خوددار اور غیور عوام کو جارحیت پسند مغربی طاقتوں کے شکنجے سے بچالیں۔ خدا کرے یہ انہونی حقیقت کا روپ دھار لے اور ہم حقیقی جمہوریت کے روشن اور تابناک دن دیکھ سکیں۔ محترم طاہر احمد قریشی صاحب اس مرتبہ اقرأ کے ایمان افروز صفحات پر ایفائے عہد اور بدعہدی پر درس دے رہے تھے اور ہم اس حدیث پر کہ وعدہ بھی ایک قرض ہے پڑھ کر ندامت سے اپنے گریبانوں میں جھانک رہے تھے۔ اللہ عزوجل ہمیں خلوص دل سے قرآن وسنت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے آمین۔ اس بار بھی مغربی تراجم ایک سے بڑھ کر ایک تھے تین کہانیاں سازشی ذہن" اسرار احمد" اقرار محبت" راحیلہ تاج" اور سچے موتی" اقبال بھٹی" میں سے جو اسٹوری سب سے بہترین لگی وہ اقرار محبت تھی۔ اس کے بعد "بیت المقدس" کی تیسری قسط کا مطالعہ کیا۔ اور تنازعہ فلسطین کے حقائق

سے کسی حد تک روشناس اور بہرہ ور ہوا۔ سچ بیانیوں میں اس مرتبہ پانچ خواتین مصنفین کے ساتھ دو مرد حضرات کی کاوشوں کا مقابلہ رکھا گیا تھا۔ ایک دو نی دو میں نزہت جبیں ضیا' نیا سورج' دیگر خواتین میں بازی لے گئی۔ جشن سال نو مناتے ہوئے ایک ماڈرن فیملی ڈاکوؤں کے ہاتھ برباد ہونے سے بچ گئی اور اپنے خالق و مالک کے رحم و کرم کے آگے سر بسجود ہو گئی۔ جب کہ دو دونی چار میں یونس خلش کی خوب صورت کہانی "پدر گرفتہ" ایک بے مثال سچی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے سرفہرست رہی۔ انہوں نے مختصر کہانی کو نپے تلے لفظوں میں لکھا اور سسر بہو کے تعلقات پر گھناؤنی حقیقت کو افشا کر کے چونکا گئے۔ ان کے انداز تحریر میں وہ احتیاط اور توقع محسوس ہوتی تھی کہ انسانی عیوب کی نشاندہی کرتے ہوئے رشتوں کے تقدس کو بھی نبھا گئے۔ محترمہ قمر جہاں طویل غیر حاضری کے بعد تحریر لے آئی تھیں۔ ان کی سچی کہانی "کینہ پرور" ایک مدبھری بپتا تھی۔ قمر جہاں کی اس کوشش میں ایک آنچ کسر باقی تھی۔ تشنگی کا احساس کچھ سوا کی ضد کر رہا تھا۔ ادھر مشاقِ قلم کی نمائندہ مصنفہ شبنم ارشاد بھی خوبی اور باہمی رشتوں پر اپنی سچ بیانی لے کر براجمان ہوئی تھیں۔ "اقرارِ گناہ" رشتوں کو جوڑنے اور خاندانی نظام کو مستحکم اور مضبوط کرنے والی ایک بے حد معیاری اور خوب صورت تحریر تھی۔ شبنم' تم نے جس فکر و تدبر کو اپنی تحریر میں بیان کیا وہ ہمارے خاندانی سسٹم میں وبائی مرض کی صورت میں موجود ہے۔ یہ کڑوا سچ ہے کہ ہم پرائی بہنوں' اور بیٹیوں کو حق ملکیت کے ساتھ گھر لاتے ہیں اور اس پر ظلم و جبر کرنے میں دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑتے لیکن جب ہم اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں تو اپنی عزت داری اور خاندانی وقار کی دھمکیاں دینے لگتے ہیں اور ہم سے اپنی بیٹیوں پر ظلم و استبداد برداشت نہیں ہوتا حالانکہ مکافات اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ مگر سچ خوانیوں میں پریشان لمحات (ناز سلوش ذشے) خالی دامن (طاہرہ جبیں تارا) اچھی اوسط درجے کی کہانیاں تھیں۔ اس مرتبہ ذوق آگہی میں اسرار علی کی لعنت' مجاہد ناز عباسی کی محبت دمشق اور محترم ریاض بٹ کی تین سوئمنگ پول لاجواب تحریریں تھیں۔ خوشبوئے سخن میں سیما بنت عاصم نے بھی معیاری غزلیں منتخب کیں۔ ریاض حسین قمر' ناز سلوش ذشے' غمیر قدیر بھٹی' محمد عبداللہ عاطر' محمد ارشاد قریشی اور عصمت اقبال عین کی خوب صورت غزلوں نے کوئے شاعری کا مزا دوبالا کر لیا۔ بزم سخن میں روبینہ احمد صاحبہ نے بھی دل بستگی کا سامان کر رکھا تھا۔ اس بار بعض شناسا دوست واحباب بھی محفل میں دکھائی دے رہے تھے۔ مجاہد ناز عباسی' فقیر محمد بخش لنگاہ' صدف سلیمان' مہرین' کرن آفتاب' ریاض بٹ' اقصیٰ' مہک' سید فرقان' احمد ندیم' دلاور خان' طفیل' ناز سلوش ذشے' سبین احمد' عبدالمالک کیف' دلدار حسین' مہر گل بانو' ثنا' کاشف ملک کے اشعار اچھے اور معیاری تھے۔ اے حمید کا سفرنامہ جو سلسلے وار ناول کی صورت میں آخری صفحات کی قدر و قیمت میں دو چند اضافہ کر رہا ہے اپنے اندازِ اسلوب اور دلچسپ اور سہل پیرائیوں میں ذوق مطالعہ کو دوبالا کر رہا ہے۔ ادبی دنیا میں اے حمید کو جو قدر و منزلت حاصل ہے وہ شک و شبے سے ماورا ہے اسے پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ جیسے پڑھنے والا بھی ان کے ہم قدم سفر کر رہا ہے۔ اپنے گرد و پیش پر جو تلاش و جستجو کی سعی کی ہے اور زمان و مکان کی ایک ایک بات کو یوں بیان کیا ہے کہ جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ اب آتے ہیں گفتگو کے دوست واحباب کی جانب......! اس مرتبہ خطوط کی محفل میں دیرینہ ساتھی چھٹی پر دکھائی دیے۔ عمران بھائی ایسا کیوں ہو جاتا ہے۔ اس محفل میں بعض سینئر تبصرہ نگاروں کی موجودگی سے محبت' مشفقت اور خلوص کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے جملوں میں سچے جذبوں اور سگے رشتوں کی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ اب دیکھیے نا' اس دفعہ ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی' ریاض حسین قمر' محمد فہد' ایم اے مجاہد' شہناز بانو' کامران شاہ کامی' محمد انجم ساحلی' ناز سلوش ذشے' محمد اسحاق انجم وغیرہ سب ندارد ہیں۔ مائی ڈیئر خواتین وحضرات جلد محفل میں حاضر ہو جائیں ورنہ میں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ تین مہینے کی چھٹی کے بعد سلام و یاد آوری نہ کی جائے۔ بھلا اس متلون مزاجی اور کج کلاہی کا کیا فائدہ؟ کہ کوئی آپ کی غیر حاضری سے دل جلا بیٹھے۔ اس مرتبہ کرسی صدارت پر محمد ارشاد قریشی نظر آ رہے تھے۔ انہیں میری جانب سے مبارک باد۔ وطنِ عزیز کی غیور افواج کے بارے میں آپ کے جذبات قابل تعریف ہیں۔ مجاہد ناز عباسی آپ کا موبائل گم ہو گیا ہے افسوس ہوا۔ ویسے موبائل کی اہمیت زمانے کی رفتار سے ہم آہنگ تو ہے لیکن ان کے عذابات سے میں کافی عبرت پکڑ چکا ہوں۔ ریاض بٹ' خاکسار کا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ اس بار تفتیشی اسٹوری تلاش مجرم لاجواب تھی۔ عبدالحکیم ساجد' تمہارے بھرپور تبصرے میں پہلے سے بہتری نظر آ رہی ہے۔ اس مرتبہ غزل نہیں ہے کیوں بھئی؟

میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ! عصمت اقبال عین نے تلے لفظوں میں رائے زنی کر رہی تھی۔ تبصرہ اور غزل دل میں ترازو ہو گئی۔ محمد عبداللہ عاطر، قمر جہاں، محمد اسلم جاوید، فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کے بھرپور اور جامع تبصرے محفل کی شان بڑھا رہے تھے۔ آپ سب کی خدمت میں سلام اور نیک خواہشات......! محمد جاوید اقبال صاحب کو محفل میں پہلی بار آمد پر ویلکم کہتا ہوں۔ آخر میں عمران بھائی! اپنی کہانیوں اور غزلوں کے بارے میں درخواست کرتا ہوں اور دعاؤں میں یاد رکھنے کی دردمندانہ التجا۔ مایوس نہیں کیجیے گا، دعا گو۔ خدا حافظ

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد! السلام علیکم آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ ماہ فروری 2012ء کا تازہ پرچا دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا یہ ایک خوب صورت رسالہ ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مارکیٹ میں یہ ایک معیاری پرچا ہے اس بار سرورق نے بہت بور کیا کوئی دلکشی نہیں تھی۔ ذرا نئے افق پر توجہ دیں تو بہتر ہوگا۔ ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر شدت سے رسالے کا انتظار ہوتا ہے۔ اس بار آپ نے غزل شائع نہیں کی آخر کیا بات ہے، ہم سے ناراض ہو بھیا ہم تو آپ کو بڑی چاہت سے خط لکھتے ہیں چلو خیر آپ کی مرضی ہم کیا کر سکتے ہیں۔ طویل خط شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ کہانیاں اور مترجم کہانیاں یہ بھی ایک اچھا یادگار سلسلہ ہے۔ بزم سخن اور خوش بو سخن بھی اچھے سلسلے ہیں۔ خالی دامن، نیا سورج، اقرار گناہ اچھی تحریریں تھیں۔ قلم کاروں کو میری طرف سے دلی مبارک باد۔ گردش، بازی گر، مجرم اور خطرناک کھلاڑی اور سلسلہ وار تحریر بیت المقدس سے میں بے حد متاثر ہوا۔ آپ ہم سے دور ہونے کی وجہ سے ہمارے دل میں بسے رہتے ہیں خدا آپ کو محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ خط لکھنے کا بھی ایک فن ہے چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ پہلے کی طرح اب بھی تعاون کریں گے ماہ جنوری کے تمام دن اداسی اور بے قراری میں گزرے حالات ناساز گار ہیں کام کا شدید بحران ہے آپ کو کیا بتائیں۔ خدا آپ کو عمر دراز کرے اور صحت دے آپ کے چاروں طرف خوشیوں کے رنگ برنگے پھول ہمیشہ ہوں۔ خدا آپ کی اپنی امان میں رکھے اور کوئی خاص بات نہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اس کے ساتھ ہی اجازت۔ اللہ حافظ

منیر احمد ساغر...... میاں چنوں! محترم عمران احمد صاحب! السلام علیکم امید ہے کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف بخیریت ہوگا۔ میں مارکیٹ میں اپنا فیورٹ ڈائجسٹ جسے میں ریگولر پڑھتا ہوں لینے گیا تو وہ ملا نہیں۔ ذرا لیٹ تھا۔ وہیں نئے افق نظر آیا۔ تو وقت گزاری کے لیے نئے افق ہی خرید لیا۔ اس کا مطالعہ کیا تو بہت اچھا لگا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں اتنا عرصہ نئے افق ڈائجسٹ سے محروم رہا۔ بہر حال نئے افق ایک اچھا، معیاری ڈائجسٹ ہے۔ جس کی تعریف میں لازماً کروں گا۔ چونکہ نئے افق بھی میرا فیورٹ رسالہ بن چکا ہے۔ اس لیے آپ کی محفل گفتگو میں حاضر ہو رہا ہوں۔ امید ہے خوش آمدید کہیں گے اور مایوس اور دل آزاری نہیں کریں گے۔ اگر آپ لوگوں نے حوصلہ افزائی کی تو نئے افق سے مستقل رابطہ رہے گا۔ میں خط کے ساتھ اپنی شاعری اور غزلیں لے کر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ شائع کر کے حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔ نئے افق میں لکھنے والے دیگر احباب مجھے پہچان ہی گئے ہوں گے امید ہے خیال خوش گوار عیاں کریں گے۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم! محترم عمران بھائی! السلام علیکم امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ فروری کا نئے افق سامنے ہے۔ اس مرتبہ ٹائٹل مافوق الفطرت ماحول کے ساتھ حقیقی مناظر اور رومانوی رنگوں سے سجا خوب صورت لگ رہا تھا۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے عمران خان کو ہوا کا تازہ جھونکا قرار دیا۔ اقرأ میں ایفائے وعدہ اور وعدہ خلافی کے موضوع پر ایمان افروز احادیث کا انتخاب کیا گیا۔ معاشرے میں سدھار تب ہی آ سکتا ہے جب ہم ان باتوں پر عمل کریں۔ جہاں تک کہانیوں کی بات ہے تو سب کہانیاں اپنے اندر الگ الگ انداز سے خوب صورتی اور دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ بزم سخن کا انتخاب ہمیشہ کی طرح متاثر کن تھا۔ ذوق آگہی میں ناز سلوش ذیشے کا انتخاب پسند آیا۔ خوشبو سخن میں شامل تمام نظمیں اور غزلیں اچھی تھیں لیکن جناب ریاض حسین قمر صاحب کی غزل عمدہ تھی۔ خاص طور پر غزل کا مطلع۔ گفتگو کے تمام قارئین کو سلام محمد ارشاد قریشی صاحب مجاہد ناز عباسی عبدالحکیم ساجد، سید عبداللہ شاہد، محترم فقیر محمد بخش

صاحب اور محمد عبداللہ عاطر صاحب اشعار پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ عمران بھائی آپ کی ہدایت کے مطابق مختصر خط لکھا ہے۔ حالانکہ ابھی میں نے آپ کے بارے میں بھی کچھ لکھنا تھا جو رہ گیا ہے۔ چلیں پھر سہی دعا ہے کہ رب تعالیٰ آپ اور آپ کے ادارے کے تمام اراکین کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین

مجاہد ناز...... سنجر پور! السلام علیکم امید کرتا ہوں کہ آپ سب خیر و عافیت سے ہوں گے۔ اس بار شمارہ کچھ لیٹ ملا کیونکہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور میں مارکیٹ بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن نئے افق کا پیار مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا کہ ناز بھائی جلدی آؤ اور مجھے یہاں سے لے جاؤ تھک گیا ہوں میں تمہارا انتظار کر کر کے۔ پھر میں نے ہمت کی اور مارکیٹ چلا گیا۔ وہاں شاہین بک ڈپو سے ڈائجسٹ خرید لایا۔ پھر جا کے سکون ملا اور تو اور میرا بخار بھی نئے افق کو دیکھ کر اتر گیا۔ سب سے پہلے میں ان تمام حضرات کو تمام قارئین کو جو نئے افق میں دلچسپی رکھتے ہیں شوق سے پڑھتے ہیں پھر ان تمام ستاروں کو جو نئے افق کی شان و شوکت بڑھا رہے ہیں تمام شہریوں کو میری طرف سے جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مبارک ہو۔ اب آتا ہوں رسالے کی طرف تو سب سے پہلے میں مشتاق احمد قریشی صاحب کی بات کرتا ہوں جنہوں نے آج کے سیاسی دور کے متعلق ہمیں سوچنے پہ مجبور کیا۔ جناب آپ نے ٹھیک کہا کہ یہ سیاست دان جتنا پیسا جلسوں میں لگاتے ہیں اتنا پیسا اگر غریبوں یا یتیموں میں تقسیم کریں تو بہتر ہے۔ یہ سیاستدان اپنے راج محلوں میں بیٹھے عوام کو لوٹنے کی پلاننگ بناتے ہیں جو لوگ B.M.W گاڑیوں کے سوا کسی اور گاڑی میں سفر کرنا بھی پسند نہیں کرتے وہ لوگ غریبوں کے بارے میں کیا خاک سوچیں گے۔ آج پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ لیکن یہ لوگ ان سیاست دانوں کے جلسے میں ضرور جاتے ہیں کہ شاید ہمارا لیڈر ہمارے بھلے کے بارے میں سوچے لیکن افسوس آج غریب کی کوئی نہیں سنتا۔ آج تو عوام کی آڑ میں غربت مکاؤ کے بجائے غریب مکاؤ مہم جاری ہے اور جناب رہی بات عمران خان کی تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ عمران ایک سچے لیڈر ہیں اور عمران خان ہی عوام کی امنگوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ گفتگو میں ارشاد احمد قریشی صاحب نے محفل اپنے نام کر لی۔ کیسے ہو بھائی؟ اور شکریہ میری غزل پسند کرنے کا۔ ریاض بٹ صاحب! مجھے آپ سے شکایت ہے آپ اس طرح عمران خان کے بارے میں اتنے دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دیں گے۔ (آپ کو کیسے پتا کیا آپ خان صاحب کے ہمسائے ہیں یا اس کے ساتھ تعلقات ہیں جس سے آپ کو یقین ہے کہ عمران خان کچھ نہیں کر پائیں گے پاکستان کے لیے) اگر میری بات بری لگی تو سوری۔ محمد اسلم جاوید نے بھی بہت اچھا لکھا۔ لکھتے رہو بھائی۔ عبدالحکیم ساجد کو بھی محفل گفتگو میں پا کر دل کو بہت راحت ملی۔ سید عبداللہ شاہد نے تو میرا دل جیت لیا۔ بھائی آپ کے لکھنے کا انداز بہت منفرد ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ ہم بچوں پر بھی ہاتھ رکھیں پھر ہمیں مزید لکھنے کا حوصلہ ملے گا۔ عصمت اقبال عین صاحبہ بہت بہت شکریہ میری تحریر "عورت کا کردار" پسند کرنے کا۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کیسے ہیں آپ اور بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ انکل آپ کا پیار ہمیں کبھی بھی آپ سے دور نہیں جانے دے گا۔ میری دعا ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں ہنستے مسکراتے رہیں۔ جاوید اقبال، محمد عبداللہ عاطر اور قمر جہاں کو بھی محفل گفتگو میں پا کر سکون ملا۔ کہانیوں میں شمی ارشاد کی "اقرار گناہ" ریاض بٹ کی "تلاش مجرم" اور نزہت جبیں کی "نیا سورج" بہت پسند آئیں۔ بزم سخن کا سارا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔ خوشبو سخن میں وسیم اختر، ناز سلوش ذیشے، محمد ارشاد قریشی، زین شانی، اور نور صبا کی غزلیں قابل تعریف تھیں۔ ذوق آگہی میں افتخار احمد اور سفیان اشرف نے نمبر لے لیے۔

دعائے صحت کی اپیل

ہمارے دیرینہ رفیق سینئر کہانی کار محترم یعقوب جمیل فالج کا شکار ہو کر بستر علالت پر ہیں۔ ہماری تمام قارئین سے اپیل ہے کہ وہ محترم یعقوب جمیل کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا کرے اور انہیں جلد ہمارے لیے اچھی اچھی کہانیاں تخلیق کرنے کے قابل بنائے۔ آمین

اسماء الحسنیٰ

حسام بٹ

یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ کے ان گنت صفاتی نام ہیں جن میں سے بیش تر کا علم صرف اسی عَلِیْمُ الْخَبِیْر کو ہے۔ میں کوئی عالم فاضل یا مفتی نہیں ہوں لہٰذا کسی علمی بحث کو چھیڑنا یا تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینا میری علمی ہمت اور بساط سے باہر ہے اور یہاں پر یہ میرا مقصود اور موضوع بھی نہیں۔ میں دین کی واجبی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا ایک عام سا دنیا دار انسان ہوں۔ البتہ اس بات پر مجھے فخر ہے کہ اس ذاتِ باری نے مجھے جتنا بھی علم و ہنر عطا کیا ہے اس کا درست استعمال جانتا ہوں اس کے باوجود بھی اگر اس کارِ خیر کے دوران مجھ سے کہیں کوئی بھول چوک یا بے ادبی ہو جائے تو وہ رؤف الرحیم میری چھوٹی بڑی ہر خطا کو معاف فرمائے جس کے اسماء الحسنیٰ پر قلم اٹھانے کی میں نے جرأت کی ہے۔

قارئین کی آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مستند روایت کو بنیاد بنا کر ماہ نامہ "نئے افق" کے لیے اس تعمیری و اصلاحی اور دنیا و آخرت کے معاملات کے لیے یکساں مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہوں۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تسعہ و تسعین اسماما ئۃ الا واحدا من احصاھا دخل الجنۃ

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں۔ جس نے ان ناموں کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔ میں بھی "نئے افق" کے ان صفحات پر قادرِ مطلق کے انہی ننانوے یعنی ایک کم سو اسماء الحسنیٰ کا تذکرہ کروں گا۔ اپنی جائز اور نیک حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارنا اور اس ذات پاک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہونا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت کے بعد دعا کرنا ایک لازمی عمل ہے۔ حدیث کے مطابق "دعا" ہر نوعیت کی عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تفصیل اور تشریح سے قبل میں دعا کے معاملے پر روشنی ڈالنا نہایت ہی اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان لطیف روحانی تقاضوں کو پورا کیے بغیر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی کی جگہ تیزاب پلائیں اور اس سے پھر بھی خوش ذائقہ پھل یا خوش نما پھول کی توقع رکھیں۔ اگر درج ذیل راہ نما اصولوں کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے دعا کی جائے تو اسے روح الامین کے پَر لگ جاتے ہیں۔

● ہر دعا کے ساتھ اول آخر حسبِ توفیق درود شریف پڑھنا نہایت ہی کار آمد اور ضروری ہے۔ اس عمل سے آپ کی دعا کے ساتھ اللہ کے محبوب کی تائید بھی شامل ہو جاتی ہے۔

● کسی بھی دعا سے پہلے نیکی اور بھلائی کا کوئی کام کرنا چاہیے۔ اگر کسی بڑی نیکی کا موقع میسر نہ ہو تو انسانوں کی گزر گاہ سے کوئی پتھر یا کانٹا ہی ہٹا دیں یا مسکرا کر کسی کو سلام ہی کر ڈالیں۔

● ناممکن اور ناجائز کاموں کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔ وہ ذاتِ کریم مثبت صفات کا مالک ہے۔ اس سے ہمیشہ بھلائی، خیر اور تعمیری مقاصد کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔

● اگر حصول مقصد میں دیر ہو رہی ہو تو بددل یا مایوس ہر گز نہ ہوں بلکہ پوری دل جمعی سے دعا کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس مالک الملک کی رحمت سے مایوس ہونا گناہِ عظیم ہے۔

● اگر کسی دعا گو شخص کی نیت صاف، دل شفاف، کھانا پینا اور لباس رزقِ حلال کا رہینِ منت ہو تو رحمتِ خداوندی اس کی دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی جوش میں آ جاتی ہے۔

"احد"

معانی:۔ ایک، اکیلا، یکتا، تنہا، یگانہ۔

تاثیر:۔ اسمِ جمالی۔

اعداد:۔ 13

مفرد عدد:۔ 4

ا	ح	د
1	8	4

ورد:۔ "یا احد"

فضائل و وظائف:۔

● اگر کوئی شخص نہایت ہی پابندی کے ساتھ صبح و شام اکتالیس، اکتالیس بار "یا احد" کا ورد کرے تو......

ا:۔ اس کا خاتمہ بالخیر اور کامل ایمان پر ہوگا۔

۲:۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی خاص محبت اور توجہ حاصل ہوگی۔

۳:۔ اولادِ نرینہ کی خواہش پوری ہوگی۔ فرزند صالح ہوگا۔

● اگر کوئی شخص کسی اہم کام کے لیے گھر سے روانہ ہوتے وقت نو، گیارہ یا تیرہ مرتبہ "یا احد" پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک مارے اور پھر ہاتھوں کو چہرے پر پھیر لے تو......

ا:۔ متعلقہ شخص اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئے گا۔

۲:۔ اس کا مطلوبہ مقصد پورا ہوگا۔

۳:۔ واپسی کے سفر میں اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے گا۔

● اگر کوئی شخص ایک سو ایک مرتبہ "یا احد" پڑھ کر سانپ کے کاٹے ہوئے پر دم کرے یعنی پھونک مارے اور اپنا لعاب دہن متاثرہ مقام پر لگائے تو......

ا:۔ زہر کا اثر بتدریج زائل ہونے لگے گا۔

۲:۔ گھائل شخص بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

۳:۔ اگر متاثرہ شخص بے نمازی ہے تو وہ نمازی بن جائے گا۔

● اگر کوئی شخص زبان کو حرکت دیے بغیر یا احد کا بکثرت ذکر خفی کرے تو......

ا۔ بتدریج مکروہاتِ زمانہ سے اس کا تعلق جاتا رہے گا۔

۲۔ وہ بہ سرعت اپنے خالق، مالک اور رزاق سے قریب ہوتا چلا جائے گا۔

۳۔ بہت جلد وہ دینی و دنیاوی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔

۴۔ اس کے علم و فضل کا چرچا چار دانگ پھیل جائے گا۔

☆ میرا معبود محض ربّ المسلمین ہی نہیں بلکہ وہ ربّ العالمین ہے لہٰذا غیر مسلم حتیٰ کہ اس کے وجود سے انکاری افراد بھی اسماء الحسنیٰ کے فیوض و برکات سے کماحقہٗ استفادہ کر سکتے ہیں۔

ا:۔ غیر مسلم افراد متذکرہ بالا اسم مبارک کو اپنے جائز اور نیک مقاصد کے حصول کے لیے طلوعِ آفتاب سے پہلے والے ایک گھنٹے میں کسی بھی وقت یا غروب آفتاب کے بعد والے ایک گھنٹے میں کسی وقت بھی، بیان کردہ تعداد اور طریقے کے مطابق پڑھ سکتے ہیں۔

۲:۔ منکر خدا افراد جب جی چاہے اور جتنا جی چاہے اس اسم پاک کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان کی ہر مثبت اور تعمیری تمنا ان شاء اللہ پوری ہوگی۔ وہ نہیں جانتے مگر مجھے معلوم ہے کہ میرا خالق، ربّ کائنات ان کا بھی خالق، مالک اور رزاق ہے۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

(۲۱۶)

(ترجمہ) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ جس شخص نے کسی دوسرے شخص سے (کسی جگہ آ کر ملنے کا) وعدہ کیا' پھر نماز کے وقت تک ان میں سے ایک نہیں آیا (اور دوسرا وقت معین پر مقرر جگہ پر پہنچ گیا' اور نہ آنے والے کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ نماز کا وقت آ گیا) اور یہ پہنچ جانے والا نماز پڑھنے کے لیے مقررہ جگہ سے چلا گیا' تو اس کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔

(رزین)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جب وعدہ کے مطابق یہ شخص مقررہ جگہ پر پہنچ گیا' اور کچھ دیر تک دوسرے آدمی کا انتظار بھی کرتا رہا تو اس نے اپنا حق ادا کر دیا' اب اگر نماز کا وقت آ جانے پر یہ شخص نماز پڑھنے کے لیے چلا جائے' یا اپنی کسی دوسری ضرورت سے چلا جائے تو اس پر وعدہ خلافی کا الزام نہیں آئے گا اور یہ گناہگار نہیں ہوگا۔

(۲۱۷)

(ترجمہ) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔ جب کسی آدمی نے اپنے کسی بھائی سے آنے کا وعدہ کیا' اور اس کی نیت یہی تھی کہ وہ وعدہ پورا کرے گا' لیکن (کسی وجہ سے) وہ مقررہ وقت پر آیا نہیں تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(سنن ابی داؤد' جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا اور نیت اس کو پورا کرنے کی ہی تھی لیکن کسی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا تو عنداللہ گناہگار نہ ہوگا' لیکن اگر نیت ہی وعدہ پورا کرنے کی نہ تھی اور اس کا یہ وعدہ ایک طرح کا فریب تھا' تو اس کے گناہ ہونے میں شبہ نہیں۔

تواضع وخاکساری اور غرور وتکبر:۔

تواضع یعنی فروتنی اور خاکساری ان خاص اخلاق میں سے ہے جن کی قرآن وحدیث میں بہت زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے اور بڑی ترغیب دی گئی ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بندہ ہے اور بندہ کا حسن وکمال یہی ہے کہ اس کے عمل سے بندگی اور نیازمندی ظاہر ہو' اور تواضع اور خاکساری بندگی اور عبدیت ہی کا مظہر ہے' جیسے کہ اس کے بالکل برعکس تکبر کبریائی کا مظہر ہے' اور اسی لیے وہ

شانِ بندگی کے قطعاً خلاف اور صرف خدا ہی کے لیے زیبا ہے۔

(۲۱۸)

(ترجمہ) عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی اور حکم بھیجا ہے کہ تواضع اور خاکساری اختیار کرو جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کوئی کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابلہ میں فخر نہ کرے۔

(سنن ابی داؤد)

(۲۱۹)

(ترجمہ) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک دن خطبہ میں برسر منبر فرمایا:۔ لوگو! فروتنی اور خاکساری اختیار کرو' کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' آپ فرماتے تھے:۔ جس نے اللہ کے لیے (یعنی اللہ کا حکم سمجھ کر اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے) خاکساری کا رویہ اختیار کیا (اور بندگان خدا کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا کرنے کے بجائے نیچا رکھنے کی کوشش کی) تو اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرے گا' جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے خیال اور اپنی نگاہ میں تو چھوٹا ہوگا لیکن عام بندگان خدا کی نگاہوں میں اونچا ہوگا...... اور جو کوئی تکبر اور بڑائی کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرا دے گا' جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عام لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل وحقیر ہو جائے گا' اگرچہ خود اپنے خیال میں بڑا ہوگا لیکن دوسروں کی نظر میں وہ کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل اور بے وقعت ہو جائے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(۲۲۰)

(ترجمہ) حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ کہ میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو (معاملہ اور برتاؤ میں اکھڑ اور سخت نہ ہو' بلکہ) عاجزوں کمزوروں کا سا اس کا رویہ ہو' اور اس لیے لوگ اس کو کمزور سمجھتے ہوں (اور اللہ کے ساتھ اس کا تعلق ایسا ہو کہ) اگر وہ اللہ پر قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دکھائے اور کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ' بدخو اور مغرور شخص۔

(بخاری ومسلم)

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

بیت المقدس

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول اور وہ شہر ہے جہاں سے مولائے کائنات پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش بریں کا سفر کیا۔ وہ شہر جو مسلمانوں کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ شہر جو نصف صدی سے یہودیوں کے زیر تسلط ہے۔ جہاں کلمہ گو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ جہاں یہودیوں کے مظالم پر دنیا نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ وہ شہر جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے جہاں متعدد پیغمبروں اور صحابہ کرام کے مزارات واقع ہیں۔ یہ شہر آج بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کسی صلاح الدین ایوبی کا منتظر ہے۔ یہ شہر کیسے فتح ہوا اور کس طرح اس کا سقوط ہوا آئیے اسے ممتاز مورخ اور ادیب الماس ایم اے کی نظر سے دیکھیے۔

تاریخ کے جھروکوں سے ابھرکر ماتی ایمانی جذبوں کو جھنجھوڑتی تحریر

پھر ۱۲۴۰ء میں ڈیوک آف کارلائل ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا اور فرانسیسی لشکر کے ساتھ یافا کی طرف بڑھا۔ اس وقت مصر اور دمشق میں ایک بار پھر ٹھن گئی تھی۔ یہاں تک کہ اہل دمشق نے صلیبیوں کے ساتھ مل کر مصر پر حملے کا فیصلہ کیا۔ سلطان نے طبریہ، عقلان اور بیت المقدس صلیبیوں کو دے کر صلح کرلی لیکن یہ قبضہ صرف دو سال رہا اور خوارزمیوں نے بیت المقدس کو بحال کرالیا۔

یہاں ''خوارزمی'' کی وضاحت ضروری ہے۔ پس جاننا چاہیے کہ خوارزمی وہ لوگ تھے جو چنگیز خان کے خوف سے خوارزم سے مصر بھاگ آئے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح ادھر ادھر پھرتے تھے۔ سلطان مصر نے انہیں پیش کش کی کہ اگر وہ صلیبیوں اور شامیوں کے خلاف اسے مدد دیں تو وہ انہیں آباد ہونے میں مدد دے گا۔ چنانچہ جب تاتاری غول بلاد فلسطین اور شام سے لوٹ گئے تو خوارزمی، ملک مصر کی فوجوں کے تعاون سے بیت المقدس پر قابض ہوگئے۔

اس سلسلے میں جو جنگ ہوئی اس میں سلطان دمشق اسماعیل نے عیسائیوں کا ساتھ دیا لیکن غزہ کے میدان میں ملک المصر کے سالار رکن الدین بیبرس کی قیادت میں رومی اور شامی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی اور خوارزمی آگے بڑھ کر بیت المقدس پر قابض ہوگئے اور بیت المقدس سلطان مصر کے تابع ہوگیا۔ اس بار پھر یورپ میں کہرام برپا ہوگیا۔

ادھر پاپائے روم نے فرانس پہنچ کر صلیبی جہاد کی تبلیغ شروع کردی اور القدس کے نام پر یورپ کے مختلف ممالک میں ''عشر'' وصول کیا جانے لگا۔ پس ۱۲۴۹ء میں صلیبی لشکر شاہ فرانس لوئیس کی زیر کمان ساحل عکہ پر اترا۔ مسلمان اس وقت باہمی جنگوں میں مشغول تھے۔ شاہ لوئیس کی آمد سے مسلمان اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے لڑے بغیر شہر خالی کردیا۔ شاہ فرانس دمیاط پر قبضہ کرکے آگے بڑھا مگر مصری لشکر ابھی صلیبیوں سے نبرد آزما تھا لیکن سلطان مصر کا انتقال ہوگیا۔ ملک الصالح کا بیٹا توران شاہ دارالسلطنت سے باہر تھا لیکن ملک الصالح کی بیوی شجرۃ الدر نے دانائی سے کام لیتے ہوئے ملک الصالح کی موت کو پوشیدہ رکھا۔ اہم اہم عہدے داروں کو اعتماد میں لیا اور ملک الصالح کے نام سے

احکام جاری ہوتے رہے۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ملکہ کو سلطانی افواج کے دریائے نیل کے کنارے پسپا ہونے کی خبر ملی۔ اُس نے فوراً ملک بیبرس کو ایک لشکر کے ساتھ میدان میں بھیجا۔ اس لشکر نے میدان میں پہنچتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ پندرہ سو صلیبی گرفتار ہوئے۔ ہزاروں مارے گئے۔ صرف چند لوگ جانیں بچا کر دمیاط واپس پہنچ سکے۔ اس شکست نے صلیبیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ شاہ لوئیس مسلمانوں کے حسب منشاء شرائط پر صلح کرنے پر تیار ہو گیا اور صلح نامہ تیار ہو گیا۔

اس معاہدہ کے بعد شاہ چار سال تک ساحل عکہ پر رہ کر یروشلم کو آزاد کرانے کے لیے تڑپتا رہا اور آخر ۱۲۵۴ء میں نامراد واپس ہو گیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ اس کے ۳۲ جہاز مسلمانوں نے پکڑے۔ خود شاہ لوئیس معہ اپنے بھائی اور امرائے لشکر کے مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا اور دس ہزار زرِ سرخ ادا کر کے رہائی حاصل کی۔

تاتاری اور فرنگی گٹھ جوڑ

ہلاکو خان کا تاتاری سیلاب ۱۲۵۷ء میں بغداد پہنچا۔ ظالم ہلاکو خان نے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو قالینوں میں لپیٹ دیا۔ اس طرح اس کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گیا۔ دار الخلافہ کا سر ننگا ہو گیا اور عظمت کا جھومر ماتھے سے گر گیا۔

ہیرالڈ لیم لکھتا ہے۔

''ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے صلیبیوں نے مملوک مصر کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اس کا بدلہ انہوں نے اس طرح لیا کہ شاہ آرمینیا اور شاہ انطاکیہ نے ہلاکو خان کو اکسایا کہ وہ مصر پر حملہ کرے اور خود بھی اپنا لشکر لے کر عکہ پہنچے۔ ہلاکو خان نے اسی تعاون اور دوستی کے تحت دمشق کی کئی مسجدوں کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے ان مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ ۱۲۵۹ء کا زمانہ تھا۔ ابھی ہلاکو خان فلسطین کی سرحد تک پہنچ پایا تھا کہ اسے منگو خان خاقانِ اعظم کے مرنے کی اطلاع ملی۔ ہلاکو خان واپس ہو گیا مگر دس ہزار تاتاری عیسائیوں کی مدد کے لیے چھوڑ گیا۔ پس ہلاکو خان کی اس مدد کے زور پر عیسائی لشکر اور تیزی سے یروشلم کی طرف بڑھا مگر غزہ کے میدان میں الملک الظاہر بیبرس بندقدار نے عیسائیوں اور تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو وہ مار ماری کہ وہ بلادِ فلسطین اور شام سے نکل بھاگے۔ بیبرس بندقدار نے آگے بڑھ کر دمشق پر قبضہ کر لیا اس سے اس کا ستارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ یہ واقعہ ۱۲۶۰ء کا ہے۔

مملوک مصر:

ملک الظاہر بیبرس بندقدار، ملک العادت کے پوتے ملک الصالح کا غلام تھا۔ جس وقت ملک الصالح کا انتقال ہوا اس وقت صلیبی قاہرہ کے قریب منصورہ میں مصری فوجوں سے دست و گریباں تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ملک الصالح کی بیوی ملکہ شجرۃ الدر نے اپنی دانائی اور جرات سے صورت حال کو سنبھالے رکھا اور اس نے ملک الصالح کی موت کو اس وقت تک پوشیدہ رکھا جب تک اس نے ملک الصالح کے بیٹے کی امیروں سے بیعت نہ لے لی۔

لیکن توران شاہ نالائق نکلا۔ اس نے ماں کی توہین کی۔ بحریہ کو ذلیل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء نے توران شاہ کو ٹھکانے لگا دیا اور ملکہ شجر کو تخت پر بٹھا دیا۔ ملکہ شجر نے اپنے سپہ سالار معز الدین سے شادی کر لی مگر معز الدین کو بھی جلد ہی قتل کر دیا گیا اور اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس تمام عرصہ میں سردار بیبرس بندقدار نے جو ایک جرنیل تھا۔ سب حاکموں کی اطاعت اور فرماں برداری کی پھر جب نورالدین کے بعد سیف الدین قطر تخت نشین ہوا تو بیبرس بندقدار نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر اس نے ۱۲۶۳ء میں بامراللہ کو خلیفہ قرار دے کر مصر میں عباسی خلافت کو زندہ کر دیا۔

غزہ میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے پاس ساحل سمندر پر صرف تیس قلعے بچ گئے تھے۔ ملک الظاہر نے جب اندرونی حالات پر قابو پا لیا تو اس نے صلیبیوں پر کاری زخم لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار بیبرس بندقدار کو بھی صلاح الدین کی طرح ہر وقت جہاد کا خیال ستایا کرتا تھا۔

چنانچہ اس نے ۱۲۶۵ء میں صلیبیوں سے قیصریہ، حیفہ اور ارسوف کے قلعے چھین لیے اور دوسرے سال یافا، مالفورٹ، انطاکیہ اور بعض دوسرے قلعوں پر بھی قابض ہو گیا۔ جب یہ اطلاع یورپ والوں تک پہنچی تو شاہ فرانس لوئیس نہم نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور وہ ۱۲۷۰ء میں ٹیونس کے ساحل پر اترا مگر قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے لشکر کو طاعون نے آ گھیرا اور شاہ فرانس اس مرض سے مر گیا۔ اس مہم میں شاہ انگلستان بھی شریک تھا اور وہ عکہ پہنچ چکا تھا۔ جہاں اسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی اور وہ بددل ہو کر واپس چلا گیا۔

ادھر بیبرس بندقدار نے ۱۲۷۱ء میں حصن الاکراد اور عکہ کے سامنے نائٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر لیے۔ پھر بیبرس، عیسائیوں کے غرور کو توڑنے کے لیے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کر اس نے جنگ چھیڑ دی۔ وہ اس جنگ میں مصروف تھا کہ ۱۲۷۵ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اس پار سے حملہ آور ہوئے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور انہیں بیبرس بندقدار کے ہاتھوں دوسری شکست اٹھانا پڑی۔ مگر افسوس کہ ایک مجاہد یعنی بیبرس بندقدار اس جنگ میں ایسا زخمی ہوا کہ اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس عظیم سردار اور مجاہد کا ۱۲۷۷ء میں انتقال ہو گیا۔ بیبرس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا مگر سلطان قلاؤں نے اسے الگ کر کے تخت سلطنت پر خود قبضہ کر لیا۔

عثمانی ترک

مسلمانوں اور منگولوں کی جنگ بلکہ جنگوں میں عثمانی ترکوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ پس قدرت نے ''ترکان عثمان'' کو ایشیائے کوچک کی سلطنت بخش دی۔ دوسری طرف ایران میں ایل خانی سردار اباقا خان نے حکومت بنالی۔ سلطان قلاؤں کے عہد میں اباقا خان نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ آرمینیا اور جارجیا کے تیس ہزار عیسائی اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ شام کے عیسائی بھی اس کے ساتھ ہو گئے اور یہ مشترکہ لشکر ۱۲۸۱ء میں حمص میں نمودار ہوا۔ حمص کے قریب سلطان قلاؤں کی فوجوں سے معرکہ آرائی ہوئی لیکن خون ریز جنگ میں اباقا خان شکست کھا کر بھاگ گیا۔

اس موقع پر سلطان قلاؤں نے کہا۔ ''اگر فرشتے مدد نہ کرتے تو فتح ممکن نہ تھی۔''

اباقا خان کی واپسی پر صلیبیوں کی شامت آ گئی اور ۱۲۸۵ء میں سلطان نے المرقب اور طرابلس کے عیسائی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر عکہ کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا ملک الخلیل جانشین ہوا۔ اس نے باپ کی مہم کو زور و شور سے جاری رکھا اور عکہ پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ صلیبیوں نے پہلے تو مقابلہ کیا مگر جب انہیں اپنی شکست نظر آنے لگی تو جہازوں میں سوار ہو کر بھاگنے لگے۔ ان میں کئی جہاز ساحل کے قریب ہی غرق ہو گئے۔ کئی جہازوں کو

مسلمانوں نے پکڑ لیا اور عکہ فتح ہوگیا۔

اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ ادھر عکہ صلیبیوں سے خالی ہوا اور اس کے ساتھ ہی پورا فلسطین عیسائیوں سے خالی ہونے لگا۔

اس کے چھ سال بعد یعنی ۱۲۹۱ء میں پوپ نکولس نے اٹلی کا بحری بیڑا بھیجا اور قبرص سے شاہ ہنری نے فلسطین کی طرف قدم بڑھائے مگر دونوں ہی ناکام و نامراد واپس لوٹے، یہی نہیں بلکہ ان کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ وہ ساحل فلسطین پر عثلیث اور طرطوس کے قلعے بھی مسلمانوں کے حوالے کر گئے۔

اس کے بعد ۱۲۹۹ء میں منگول تیسری مرتبہ ایل خانوں کی قیادت میں فرات کو عبور کر کے حملہ آور ہوئے اور مملوکوں کو شکست دے کر دمشق پہنچ گئے۔ ایل خانیوں کو بھی صلیبیوں نے بلایا تھا لیکن صلیبی نہ پہنچ سکے اور وہ مایوس ہو کر فروری ۱۳۰۱ء میں مفتوحہ علاقے خالی کر کے لوٹ گیا۔ ۱۳۰۳ء میں ایل خان غزن مر گیا اور یوں بیت المقدس کو منگولوں کے خطرے سے مستقل طور پر نجات مل گئی۔

صلیبیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے مگر وہ کوشش کرتے رہے۔ شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اس کے بعد بھی اپنی کوشش میں لگے رہے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران ترکوں نے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنا دفاع مضبوط کر لیا۔

پس ہیر الڈلیم مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے۔

”ہم یروشلم کی صلیبی ریاست بحال نہ کر سکے جس کے لیے صدیوں تک ہمارے آباؤ اجداد برسرِ پیکار رہے اور آج بھی وہ مزارِ مسیح کے سائے تلے محو خواب ہیں۔“

۱۳۶۵ء سے ۱۳۶۷ء تک پیٹر آف سائبرس وغیرہ مجاہد بن کر مصر و شام میں لڑتے رہے مگر ناکام رہے۔ ۱۴۵۳ء میں محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا تو پیوثانی نے قسطنطنیہ کی واپسی کے لیے جنگ کو مذہبی رنگ دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۵۱۶ء میں ترکان عثمان نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکوں کے زیرکمان آ گیا۔

ترک دورِ حکومت میں بیت المقدس اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے عروج پر پہنچ گیا۔ ۱۵۳۶ء میں سلطان سلیم اعظم نے شہر کی فصیل کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ سات سال میں مکمل ہوئی۔ فصیل کا گھیراؤ ڈھائی میل ہے اور وقتی پیمائش کے لحاظ سے فصیل ۱۲۳۵۰ فٹ لمبی ہے۔

جولائی ۱۸۱۷ء میں ترکی نے ایک فرمان کے ذریعہ مزارِ مقدس شاہ فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ ۱۸۰۸ء میں گرجا میں آتش زنی کی واردات ہوئی جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ یہودیوں کی سازش تھی۔

۱۸۳۱ء میں برطانوی وزیراعظم بیت المقدس آیا۔ اس کے دورہ کے بعد اس علاقے میں فتنے جنم لینے لگے جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئے۔

۱۸۳۲ء میں مصر کے محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ مئی ۱۸۳۳ء میں ایک صلح نامہ کے ذریعہ محمد علی پاشا نے شام و فلسطین اور مصر کی گورنری کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا منظور کیا۔

۱۸۳۹ء میں پہلا برطانوی قونصل بیت المقدس آیا۔ اس کے ایک سال بعد فرانس کی شہ پر محمد علی نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر دی۔ مگر شکست کھا کر شام و فلسطین سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

۱۸۵۶ء میں سلطان ترکی نے اپنی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔ اسی سن میں ایک شاہی

فرمان کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر قرار دیے گئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت دی گئی لیکن وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

چالاک یہودی

یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت ملی تو انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہی وہ قدم ہے جس کے زور پر یہودیوں نے سازشیں کرنا شروع کیں۔ عالمی صیہونیت نے انہیں شہ دی اور انہوں نے وہاں اپنی نو آبادیاں بنانا شروع کر دیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے دور اقتدار میں نصرانیوں اور یہودیوں سے انتہائی فراخدلانہ سلوک روا رکھا مگر اس کا احسان ماننے کی بجائے ان دونوں اقوام نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

سلطان محمود ثانی ۱۸۵۹ء میں بیت المقدس آئے اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی۔ اس وقت سلطان نے یہودیوں کی ان شکایات کی چھان بین کی جو وہ سلطانی عمال کے خلاف کرتے تھے مگر تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تمام شکایات جھوٹی اور بالکل بے بنیاد تھیں۔ اسی طرح ۱۸۶۲ء میں ایڈورڈ ہفتم بیت المقدس کی زیارت کو آیا تو اس نے بیت المقدس میں نابیناؤں کے لیے ایک اسکول جاری کیا۔ یہ پہلا غیر ملکی ادارہ تھا۔ اسی وقت یہودیوں کو پیش کش کی کہ اگر یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دی جائے تو وہ نہ صرف ترکی کے تمام قرضے ادا کر دیں گے بلکہ آئندہ ضرورت پڑنے پر ان کی حسب ضرورت مدد بھی کریں گے۔ اس پیش کش کا سلطان عبدالحمید نے برا منایا اور یہودی رہنما کرزل کو سختی سے جواب بھجوایا کہ وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ کیونکہ عثمانی سلطنت کا ہر فرد و بشر اس طرح کی پیش کش کو اپنی توہین سمجھتا ہے اور اگر یہودی اپنی ساری دولت بھی پیش کریں تو بھی انہیں فلسطین میں ایک انچ زمین بھی نہیں دی جا سکتی۔

ادھر سے مایوس ہو کر یہودیوں نے قیصر جرمنی کا دامن پکڑنے کی کوشش کی کیونکہ وہ سلطان مرحوم کا ذاتی دوست تھا۔ پس قیصر نے یہودیوں کے لیے کوشش بھی کی لیکن سلطان نے اس کی بات رد کر دی۔

آخری جنگ

تاریخ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ جب سلطان نے یہودیوں کا مطالبہ یکسر رد کر دیا تو قیصر جرمنی کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے سلطان کو انجام بد کی دھمکی دی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ ترکی کی انجمن ”اتحاد و ترقی“ نے سلطان کو معزول کر کے محمد ارشاد کو خلیفہ بنا دیا۔ اسی دور میں خلافت ترکی نے نیا آئین بنا کر شام اور فلسطین کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ لیکن اس وقت تک برطانیہ نے لارنس آف عربیہ کے ذریعے ترکوں کے زیر اقتدار عرب علاقوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ لارنس نے یہودیوں کو بھی ملا لیا اور پھر عربوں نے ہر جگہ ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔

اس صورت حال کے پیش نظر آٹھ اور نو دسمبر ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب ترکوں نے بیت المقدس خالی کر دیا۔ پھر دس دسمبر ۱۹۱۷ء کی صبح جنرل شیا بیت المقدس پہنچا۔ ترکوں نے دوپہر کے وقت چابیاں اس کے حوالے کر دیں اور گیارہ دسمبر کو جنرل ایلن بائی، مصری اور فلسطینی افواج کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔

اس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کا مقدس شہر ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں تلے آ گیا۔ اس مرتبہ مصری اور فلسطینی ان کی مدد کر رہے تھے۔ برطانیہ کے انگریز اسے آخری صلیبی جنگ قرار دیتے ہیں

جسے تیرہویں صلیبی جنگ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایلن بائی کے یروشلم میں داخلے سے پہلے سات سو پچیس سال تک یروشلم نے کبھی کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کی صورت نہ دیکھی تھی۔

برطانیہ کے وزیراعظم چرچل نے اپنی تاریخ ”جنگ عظیم“ میں لکھا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترک بیت المقدس سے دست بردار ہوگئے۔ ان کے چار سو سالہ منحوس دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف باشندگانِ بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا۔

اسی طرح مسٹر نلسن تاریخ جنگ جلد ۲۳ میں پرمسرت الفاظ میں یوں رقم طراز ہے۔

”آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور اگر سینٹ لوئیس اور رچرڈ شاہ انگلستان اس جرات افزا افواج کو دیکھتے تو ان کی روحیں حیران رہ جاتیں۔ کیونکہ بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجزیری اور ہندی مسلمان، عرب قبائل، ہندوستان کے ہزار ہا فرقوں کے ماننے والے افریقی، حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھیں جنہوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔“

افسوس کہ وہ مسلمان جنہیں بیت المقدس کی حفاظت کرنی تھی وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ مل گئے تھے۔ جنگ عظیم اول میں شام، عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا ۲/۵ حصہ تھے۔

جارج ٹاؤن، گرانڈ ورک آف برٹش ہسٹری میں لکھتا ہے۔

”بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ اور تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بائی بڑے دن سے پندرہ دن پہلے بیت المقدس میں داخل ہوا۔“

یہی مصنف آگے جاکر لکھتا ہے۔

”قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بائی نے فلسطین میں شاندار پیش قدمی کی اور اس پیش قدمی کا سہرا خاص طور پر ہندوستانی افواج کے سر ہے۔“

اسی طرح ٹامسن نے اپنی کتاب ”عرب میں لارنس کے ساتھ“ میں لکھا ہے۔

”ایلن بائی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لاکھوں مسلمانوں کی متبرک زمین ہے۔“

اسی طرح برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے چیخ کر پارلیمنٹ میں اعلان کیا۔

”آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے۔“

فتح بیت المقدس کے بعد جنرل ایلن بائی کو حکومت برطانیہ نے دیگر اعزازات کے علاوہ پچاس ہزار پونڈ کا نقد انعام دیا اور جارج پنجم نے اس کی خدمات کا خاص طور پر اعلان کیا۔

جلال الدین سیوطی ایک مستند حوالے سے لکھتا ہے کہ:۔

”بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے ۴۹۱ھ تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات دن تک مسلمانوں کی بڑی تعداد کو بے دریغ تہہ تیغ کرکے جام شہادت پلایا۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ میں ۷۰ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا اور صخرہ سے سونے چاندی کے برتن اور بے شمار دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھی، نکال کر لے گئے۔ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کو خدائے تعالیٰ نے بیت المقدس کی آزادی کے لیے مامور کیا۔

کیونکہ وہ سب سے زیادہ شیر دل اور دہکتی ہوئی آگ کا پتلا تھا...... مگر آہ! بیت المقدس پھر غلام ہوگیا۔ اور اس کے سقوط نے ترکی کے زوال کو سہارا دیا۔“

تاریخ شاہد ہے کہ بیت المقدس نے ترکوں کے عہد میں زبردست ترقی کی اور اس مقدس شہر میں مکروہات پر مکمل پابندی عائد رہی تھی۔

مقدس یروشلم کا امریکی مصنف اس دور کے بیت المقدس کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

”قدیم شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ شہر کا محل وقوع ہیرو داور اس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ بعض مقامات پر قدیم محراب اور عمارتیں اب تک قائم ہیں لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک داؤد اسٹریٹ، یافہ گیٹ سے مشرقی جانب چلتی ہوئی شہر کے دوسری طرف سینٹ اسٹیفن گیٹ سے جاملتی ہے۔ کرسچین اسٹریٹ، داؤد اسٹریٹ سے کلیسائے نشور تک جاتی ہے اور ایک تیسری گلی شمال کے باب دمشق کو جنوب کے صیہون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم زمین خالی نظر آئے گی۔ گو یہ شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے لیکن ۱۳۵ ایکڑ رقبہ مسجد اقصیٰ میں گھرا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں میں گھری ہوئی ہے۔ اور اس سے دوگنی زمین مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں مساجد، گرجا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ یہ بطور رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتیں اس لیے بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ ۵۵ ہزار آدمی ایک سوا ایکڑ زمین پر آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان و مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔“

بیت المقدس کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس شہر میں ہر طرف مینار ہی مینار دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی گلی یا کوچہ ایسا نہیں جہاں مسجد یا گرجا نہ ہو۔ مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۳۷ مساجد اور ہیں اور چھوٹے بڑے

گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد ۲۰ کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گھنٹہ بعد شہر کی فضا عبادت کے لیے بلاتی ہوئی گھنٹیوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اللہ اکبر کی صدا مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔"

شہر کے انتظام کے لیے سلطان ترکی نے "پاشا" کو مقرر کر رکھا ہے جس کی انتظامی کونسل ۹ مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رکن پر مشتمل ہے۔ اس شہر میں ہر ملک کے قونصلیٹ موجود ہیں اور وہ تمام امور جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت اسی ملک کا قونصلیٹ کرتا ہے لیکن اگر فریق مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔

پورے شہر میں نہ کوئی اوپیرا ہے اور نہ کسی کھیل یا کنسرٹ کی اجازت ملتی ہے۔ تمام بازار آفتاب غروب ہوتے ہی بند کر دیے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ جلد سو جاتے ہیں اور صبح کو جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ زمانہ کی تہذیبی ترقیوں کا ابھی اس شہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ قدیم شہر کی دیواروں سے باہر شمال و مغرب میں پچھلے کئی برسوں سے ایک نیا یروشلم عالم وجود میں آ گیا ہے۔ اس نئے یروشلم نے مختصر عرصہ میں بہت ترقی کر لی ہے۔ اس نئے شہر یروشلم میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت یہودیوں کی آباد کاری پر پابندی ہے اس کے باوجود وہ مسلسل چلے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر رابنسن کے مطابق ۱۸۳۸ء میں شہر کی آبادی گیارہ ہزار تھی۔ ان میں تین ہزار یہودی تھے۔ ۱۸۴۹ء میں ولیم کے مطابق یہودیوں کی تعداد تین ہزار سے بڑھ کر سات ہزار ہو گئی تھی۔ پھر ۴۵ سال بعد اس کی آبادی میں دس گنا اضافہ ہوا۔ یہودی اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے کی فکر میں رات دن کوشاں رہتے تھے۔ یہودی ہاتھ پیر پھیلاتے رہے تھے مگر عربوں نے حالات کا رخ نہ پہچانا اور اپنی سادہ لوحی میں لارنس کا شکار ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ برطانیہ نے عربوں کو اس جنگ میں فریب دے کر اپنے ساتھ ملایا تھا اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان پر ان کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی مگر ۱۹۲۰ء کی صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کے زیر اثر کر دیا گیا اور سر رابرٹ فلسطین کا پہلا ہائی کمشنر بن کر بیت المقدس پہنچا۔ رابرٹ خود یہودی تھا اور اس نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔

برطانیہ کے اس مصنف نے لکھا ہے۔

"اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا رابرٹ کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس کے لیے جو سازش پس منظر میں پوشیدہ ہے۔ اس سے بے خبر ہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رابرٹ کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنا دیا ہے۔"

رابرٹ کے آتے ہی بیت المقدس میں یہودیوں کے آنے کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور وہ برطانیہ کی شہ پر اور کھل کھیلے۔ آخر ۱۹۳۶ء میں "عرب ہائی کمیٹی" قائم ہوئی جس کی اپیل پر برطانیہ کے "مسلم کش" رویہ اور یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومت برطانیہ نے مفتی صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے۔ آپ مسجد اقصیٰ میں اعتکاف میں بیٹھ گئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کر لیا لیکن مفتی اعظم بھیس بدل کر اس محاصرے سے نکلے اور

شام سے ہوتے ہوئے لبنان پہنچ گئے۔ یہ وہی سال تھا جب یہودیوں نے حکومت برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ یہودی فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ پس ملک گیر فسادات شروع ہو گئے اس طرح بیت المقدس کی گلیاں بار بار انسانی خون سے رنگین ہوئیں۔ یہودی برطانیہ کے تعاون سے روز بروز طاقت پکڑ رہے تھے۔

الحاج الیاس برنی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں۔

"القدس میں یہودیوں کے نئے نئے محلے بن رہے ہیں۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی بن رہی ہے۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو بہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان قرار دیا ہے اور ریلوے ٹائم بھی عبرانی زبان میں شائع ہونے لگے ہیں۔"

محمد عاشق میرٹھی لکھتے ہیں۔

"قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اندرون شہر فصیل سے محصور ہے جس کے سات دروازے ہیں۔ باب داؤد اور باب المغاربہ، مشرق میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب الساحرہ، باب النصرہ اور باب الجدید ہیں۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد ابا صیری، شیخ قرمی، شیخ محمد المثبت، شیخ بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین رومی، شیخ فرید اور شیخ حسن کے مزارات ہیں۔ جو زیارت گاہ عوام ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شداد بن اویس انصاری اور عبادہ بن صامت کے مزارات ہیں۔ کوہ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار ہے۔ اس کے متصل قبہ شہداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب حضرت سلمان فارسی دفن ہیں۔ شہر کے شمالی جانب سیدنا عکاشہ، سیدنا تمیم اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا سلطان ابراہیم ادھم اور شیخ حسن راعی کے مزارات ہیں۔"

اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن نے "راہِ وفا" میں جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی اس طرح لکھا ہے۔

"ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے زمینوں کے ٹکڑے وقف کر دیے تھے جن پر ان ملکوں کے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لیے مسافر خانے تعمیر ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناظر حسن انصاری نے "زاویہ ہندی" کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستان شہداء میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہید ساتھی دفن ہیں۔ صحن حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومت برطانیہ کا اثر ہے۔ جس کی وجہ سے اس سرزمین قدس پر ہنگامہ دارو گیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق ان کی معبدگاہیں، جائیدادیں اور جان و مال خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا ہے یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ حالانکہ آج سے ستر برس قبل الخلیل (حبرون) کو جاتے ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ماہ شورم (یعنی سو گھر) تھی۔ قدیم شہر میں بیس نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور شہر میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۳۸ مساجد ہیں لیکن جو عظمت اور حرمت مسجد اقصیٰ کو حاصل ہے اس کے مرتبہ کو کوئی اور مسجد نہیں پہنچتی۔"

خلیفہ ثانی:

خلیفہ ثانی یعنی حضرت عمرؓ کا زمانہ اسلامی تاریخ کا بہترین دور ہے۔ چند برس کے اندر مسلمانوں نے عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر کے علاقے فتح کر لیے۔ ان تمام جنگوں کا احوال اس جگہ تفصیل سے تو بیان نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب نہ ناول نہ یہ تاریخی صحیفہ صرف فلسطین اور بیت المقدس تک محدود ہے لیکن اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے تاکہ بیت المقدس کی تمام و کمال عظمت کا نقشہ آپ کی نظروں کے سامنے آ جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ خلافت ۶۳۴ء سے ۶۴۵ء تک بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ستائیسویں برس میں اسلام قبول کیا۔ آپ قریش کے قبیلہ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کو جوانی میں شہسواری، پہلوانی، خطابت اور فنون سپہ گری میں کمال حاصل تھا اور آپ کی اس غیر معمولی قابلیت کی بناء پر قریش مکہ نے آپ کو عہدۂ سفارت پر مامور کیا تھا۔ آپ کی عظمت و جبروت کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے اسلام لانے سے پہلے مسلمان پوشیدگی سے نماز ادا کرتے تھے مگر آپ کے اسلام لانے کے وقت مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کھلے میدان میں نماز ادا کی۔ ہر چند کہ اس وقت حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ ان میں موجود تھے مگر مسلمان پھر بھی فریضہ نماز پوشیدگی میں ہی ادا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چند سال بعد آپ نے حضور نبی کریم ﷺ کے حکم سے بیس آدمیوں کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف اعلانیہ ہجرت کی۔ مدینہ میں آپ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور ہر جنگ میں اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ عہد صدیقیؓ (حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ) میں آپ صلاح کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ آپ کی قابلیت اور اسلام کی بے لوث خدمت کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ صدیق نے آپ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

عراق و ایران

اس وقت ایران کی مجوسی (آتش پرست) سلطنت کا شمار دنیا کی عظیم اور طاقت ور سلطنتوں میں ہوتا تھا۔ عراق اس وقت ایران کا ایک حصہ تھا۔ ایرانی سلطنت اور عرب کی اسلامی سلطنت کی حدود میں چند نیم آزاد ریاستیں تھیں جن میں عیسائی آباد تھے۔ ایرانیوں کے ظلم سے تنگ آ کر ان عیسائیوں نے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے امداد کی درخواست کی جس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی کمان میں ایک چھوٹی سی فوج بھیجی۔ حضرت خالدؓ نے ابھی دریائے فرات تک کا علاقہ فتح نہیں کیا تھا کہ انہیں ملک شام کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔

پھر جب حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالی تو انہوں نے ایک بڑا لشکر ایرانیوں کے مقابلے کے لیے بھیجا یہ لشکر قادسیہ تک پہنچا۔ ادھر ایران نے رستم کی ماتحتی میں ایک عظیم لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اس وقت اسلامی لشکر کے سالار مسعودؓ بن ابی وقاص تھے۔ انہوں نے رستم کے سامنے اسلام پیش کیا مگر رستم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں رستم مارا گیا اور ایرانی لشکر بابل تک ہٹ گیا۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے بابل، مدائن اور جلولا پر قبضہ کر لیا۔ اب شہنشاہ ایران یزدجرد خود خراسان پہنچا اور اس نے مسلمانوں کے خلاف ڈیڑھ لاکھ کا لشکر روانہ کیا۔ ادھر حضرت عمرؓ نے تیس ہزار فوج مسلمانوں کو کمک کے طور پر بھیجی۔ چنانچہ نہاوند کے مقام پر ایک شدید میدانِ کارزار گرم ہوا جس میں مسلمان کمک کے کمانڈر حضرت نعمانؓ نے شہادت حاصل کی مگر اسلامی لشکر کو فتح حاصل ہوئی اور

مسلمانوں کا سلطنت ایران پر قبضہ ہو گیا۔

اس جنگ کے نتیجہ میں کوفہ، بصرہ اور موصل کے شہر آباد ہوئے۔

فلسطین اور شام:

ادھر حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں اجنادین کے میدان میں رومی لشکر کو زبردست شکست دی اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اسلامی لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اسلامی لشکر نے دمشق، اردن اور حمص پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت شاہ روم ہرقل نے ایک متحدہ لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اس کا مقابلہ مسلمانوں سے یرموک کے میدان میں ہوا اور حضرت خالدؓ بن ولید نے رومیوں کو شکست دے کر سارے شام پر قبضہ کر لیا۔

دوسری طرف فلسطین کے محاذ پر حضرت عمروؓ بن العاص نے چند مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد "بیت المقدس" کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے صلح کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی اور ان کی درخواست پر خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

فلسطین کے بعد مصر جہاں شہنشاہ روم کا باجگزار مقوقس حاکم تھا۔ مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ اس طرح لیبیا سے ابی سینیا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

مورخ واقدی کے بیان کے مطابق مٹھی بھر صحرا نشینیوں نے حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بارہ برس کے قلیل عرصہ میں چھتیس ہزار شہر اور قلعے، ایک ایک دن میں نو نو شہر فتح کیے۔

واقعہ جسر کے سوا مسلمانوں نے کہیں بھی شکست نہ کھائی۔ مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات کا سبب عیسائیوں نے یہ بتایا کہ ایران و روم کی سلطنتیں اپنی خانہ جنگیوں، باہمی آویزشوں اور مذہبی اختلافات کے باعث اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ مسلمانوں کے لیے ان کو مغلوب کرنا آسان امر تھا۔ مگر یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ خانہ جنگیوں کے باوجود ایران اور روم کی سلطنتیں اپنے مادی ذرائع، اسلحہ و ہتھیار اور سپاہیوں کی تعداد کے لحاظ سے عربوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔ عرب جیسی بے مایہ قوم کسی جنگی معرکہ میں بیالیس ہزار سپاہیوں سے زیادہ جمعیت فراہم نہ کر سکی اور ان کا مقابلہ ڈھائی لاکھ سے چالیس لاکھ سپاہیوں کے لشکر جرار سے ہوتا تھا۔ فوجی تنظیم و تربیت اور آلات جنگ کے لحاظ سے ایرانیوں اور رومیوں کی برتری ایک مسلمہ حقیقت تھی۔

اس وقت کے آلاتِ جنگ مثلاً زرہ بکتر، جوشن، خود، چار آئینہ وغیرہ کے استعمال سے ان کے سپاہی بخوبی واقف تھے۔ اس کے برعکس مسلمان سپاہی چمڑے کی زرہیں استعمال کرتے تھے۔ ان کے تیر معمولی اور نیزے معمولی قسم کے ہوتے۔ جنگ قادسیہ کے شروع ہونے سے پہلے ایک ایرانی افسر نے عربوں کے تیروں کو دیکھ کر حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا کہ "یہ تکلے ہیں"۔

ٹھوس حقائق کے پیشِ نظر خلفاء اربعہ کے زمانہ میں عربوں کی فتوحات کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

ا۔ مسلمانوں کی فتوحات کا حقیقی راز ان کے جذبۂ ایمان میں مضمر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کو وہ سعادت ازلی سمجھتے تھے اور اس کے حصول کی خاطر وہ ہر قسم کے مصائب جھیلنے پر کمر بستہ رہتے تھے۔ مسلمانوں کے آہنی عقیدہ اور عزم بالجزم

کے سامنے پہاڑوں کی حقیقت رائی کے برابر تھی۔ اس عظیم الشان ہتھیار سے مسلح ہو کر مسلمان سپاہی اپنے حریفوں کے جرار لشکروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیتے تھے۔

۲۔ مسلمانوں کا اخلاق حسنہ ان کی عظیم الشان فتوحات کا دوسرا راز تھا۔ رسول ﷺ کی ۲۳ سالہ تربیت نے عرب قوم کے افراد کو بے چوں و چرا اطاعت، عزم و استقلال، سردار بننے کی قابلیت اور اعتماد نفس کا سبق پڑھایا تھا۔ آخری فتح حاصل کرنے میں کسی قوم کا بلند اخلاق اور مصیبتوں کے جھیلنے کا عزم سب سے پہلے اپنا کام کرتے ہیں۔ قوم کے مالی ذرائع یا ہتھیاروں کی کثرت کا مقام دوسرے یا تیسرے درجہ پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عرب کے مسلمان ایرانیوں اور رومیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھے۔ اس لیے ان کی آخری فتح یقینی تھی۔

۳۔ مسلمانوں کا جذبہ اتحاد و اتفاق ان کی فتوحات کا تیسرا سبب تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی بے نظیر تعلیم کے باعث عرب کے جنگ جو قبیلے ایک ایسی متحدہ قوم بن گئے تھے جس کے افراد ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی مانند تھے۔ وہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوتے تھے۔ اس کے برعکس مخالفوں میں بغض و عناد تھا۔ ایران اور روم کی رعایا آقا و غلام اور امیر و غریب کی تمیز تھی۔ محکوموں اور حاکموں کے درمیان نفرت اور نفاق کی خلیج تھی۔ عربوں کے قومی اتحاد کے مقابلے میں ایرانیوں اور رومیوں کی شکست ان کے طبقاتی نزع کی وجہ سے یقینی تھی۔

۴۔ شام میں غسانی قبیلے کے لوگ اور سلاطین حیرہ (علاق) قومیت کی بناء پر عرب تھے۔ یہ لوگ قیصر روم اور ایران کے کسریٰ کے مظالم سے نالاں تھے۔ عیسائی ہونے کے باوجود ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ ابتدائی جھڑپوں کے بعد تعاون کیا اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے ان کے معاون بن گئے۔ ان کے تعاون سے مسلمانوں کو فتوحات حاصل کرنے میں آسانی ہوگئی۔

۵ مسلمان جرنیلوں میں مکمل اتفاق و اتحاد تھا۔ ان کی اطاعت امیر کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیا تو انہوں نے بخوشی سالاری کے بجائے حضرت ابوعبیدہ کی ماتحتی میں کام کرنا پسند کیا۔ حضرت عمرؓ ذاتی طور پر تمام محاذات جنگ اور فوجوں کی نقل و حرکت کے متعلق احکام جاری کرتے تھے۔ اس کے برعکس ایرانی اور رومی جرنیلوں میں آپس میں نفاق اور بغض تھا۔ اس لیے ان کی ریشہ دوانیاں ان کی شکست کا باعث ہوئیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی

حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی بھی ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس واقعہ یا حکم میں علم و حکمت، تسلیم و رضا اور حقوق اور ان کے استعمال کے کتنے ہی پہلو پائے جاتے ہیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی ۶۳۸ء مطابق ۱۷ ہجری میں ہوئی۔ کیونکہ ملک شام کی فتوحات اور واقعات میں حضرت خالدؓ کی معزولی کے مختلف پہلو نکلتے ہیں جن پر مورخین نے طرح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں۔

عام مورخین کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی حضرت خالدؓ کو معزول کر دیا اور شاید یہ ان کی خلافت کا سب سے پہلا حکم تھا۔ ابن اثیر نے اس سلسلے میں یہ غلطی کی ہے کہ انہوں نے خود ہی ۱۳ ہجری میں خالدؓ کی معزولی بیان کی ہے اور پھر ۱۷ ہجری میں ان کی معزولی کا ایک الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی طرح کے واقعات نقل کیے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ حضرت عمرؓ جناب خالدؓ کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان سے ناراض ہوئے تھے مگر آغازِ خلافت میں انہوں نے اس سے درگزر کیا تھا مگر خالدؓ بن ولید کی یہ عادت تھی کہ وہ حساب کے کاغذات دربار خلافت نہیں بھیجتے تھے۔ اس لیے ان کو تاکید کی گئی کہ وہ آئندہ اس کا خیال رکھیں مگر حضرت خالدؓ نے صاف جواب دینے کے بجائے بات کو الجھا دیا۔ انہوں نے خلیفہ حضرت عمرؓ کو لکھا۔

"میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔"

حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ کا یہ سخت جواب پسند نہیں آیا۔ وہ رقم کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ پھر بھلا وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیوں خالدؓ کے ہاتھ میں دے سکتے تھے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت خالدؓ کو لکھا۔

"تم اس شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو۔"

حضرت خالدؓ نے خلیفہ کی یہ شرط منظور نہیں کی اور اس بناء پر انہیں سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ انہیں ابوعبیدہؓ بن الجراح کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷ ہجرہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالدؓ نے ایک شاعر کو خوش ہو کر دس ہزار روپے انعام میں عطا کر دیے۔ چنانچہ اسی وقت پرچہ نویسوں نے حضرت عمرؓ کو پرچہ کے ذریعے اطلاع دی۔ اس اطلاع کی بناء پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا۔

اگر خالدؓ نے شاعر کو دس ہزار انعام میں دیے ہیں اور اپنی گرہ سے دیے ہیں تو اسراف کیا ہے اور اگر اس نے بیت المال سے لے کر دیئے تو خیانت کی۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔"

خالد بن ولیدؓ جس کیفیت سے معزول کیے گئے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ قاصد جو معزولی کا خط لے کر دربار خلافت مدینہ پہنچا تھا۔ اس نے مجمع عام میں خالدؓ سے دریافت کیا۔

"یہ انعام تم نے کہاں سے دیا؟"

خالد اگر اقرار کر لیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ انہیں درگزر کیا جائے۔ لیکن حضرت خالدؓ خطا کے اقرار پر رضامند نہ ہوئے۔ مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر حضرت خالدؓ کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لیے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی۔

یہ واقعہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ ایک ایسا سپہ سالار جس کی نظیر لشکر اسلام میں موجود نہ تھی۔ جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور وہ دم نہیں مارتا۔ یہ واقعہ ایک طرف تو حضرت خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی کھلی ہوئی شہادت ہے اور دوسری طرف خلیفہ اسلام کی سطوت و جلال کا بھی ایک کھلا ہوا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ نے حمص پہنچ کر ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا۔

"امیر المومنین عمرؓ نے مجھے شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجھے معزول کر دیا گیا۔"

حضرت خالدؓ کے اس کلام پر ایک سپاہی نے کھڑے ہو کر کہا۔

"اے سردار! چپ رہ، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔"

خالدؓ نے جواب دیا۔

"ہاں، مگر عمرؓ کے ہوتے ہوئے فتنہ کا کیا احتمال ہے۔"

پھر حضرت خالدؓ مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔

"اے عمرؓ...... خدا کی قسم تم میرے معاملے میں ناانصافی کرتے ہو۔"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟"

خالدؓ نے جواب دیا۔

"مالِ غنیمت سے۔" اس کے ساتھ ہی کہا۔

"ساٹھ ہزار سے زیادہ جتنی رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں۔"

چنانچہ بیس ہزار زیادہ نکلے اور وہ بیت المال میں داخل کر دیے گئے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ سے کہا۔

"خالد تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے عمالان ملکی کو ایک سرکلر بھیجا جس میں لکھا گیا تھا کہ:۔

"میں نے خالد کو ناراضی یا خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا۔ لیکن چونکہ میں دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں اس لیے میں نے ان کو معزول کرنا بہتر سمجھا۔ تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔"

ان واقعات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خالدؓ بن ولید کی معزولی کے کیا اسباب تھے اور اس میں کیا مصلحتیں تھیں۔

معزولی کے بعد حضرت خالدؓ مدینہ سے واپس حمص چلے گئے اور آپ نے بقیہ زندگی وہیں گزاری اور وفات پا کر وہیں دفن ہوئے

عمواس کا طاعون

۱۷ ہجری کے آخر میں عراق اور شام میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ اس کا زور ۱۸ ہجری تک رہا۔ عمواس، ملک شام کا ایک شہر ہے جہاں سے یہ وبا پھیلی تھی۔ اس وبا نے اسلام کی بہت سی مقتدر اور عظیم ہستیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں مقتدر صحابہ حضرت ابوعبیدہؓ، معاذ بن جبلؓ، یزید بن ابی سفیانؓ، حارثؓ بن ہشام اور عقبہ وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً پچیس ہزار مسلمان اس وبا کا شکار ہوئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس وبا کی خبر سے بڑا تردد ہوا اور خود انہیں بھی حفاظتی تدبیر کی خاطر وہاں سے شام جانا پڑا۔ لیکن مقام سرغ پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وبا کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ آپ صحابہؓ کے مشورے سے ملک شام سے واپس آ گئے۔ تاہم آپ نے ابوعبیدہؓ کو حکم دیا کہ نشیبی مقام کو چھوڑ کر بلند مقام پر افواج کو لے جائیں۔ چنانچہ وہ افواج کو جابیہ لے آئے۔ مگر وہ خود اس وبا کا شکار ہو گئے۔ وہ معاذؓ بن جبل کو اپنا جانشین بنا گئے۔ مگر معاذؓ بھی اس وبا کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے عمروؓ بن عاص کو اپنا جانشین بنایا تھا۔

وبا کے فرو ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے پھر شام کا سفر اختیار کیا کیونکہ اس وبا نے کئی نئے حالات پیدا کر دیے تھے۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں قیصر روم شام پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ فوج کے ہزاروں افراد اس وبا کا شکار ہوئے جس سے کئی عہدے خالی ہو گئے۔ خلیفہ نے اکثر مقامات کا دورہ کر کے خالی جگہوں پر نئے افسر مقرر کیے۔ حضرت امیر معاویہؓ بن ابوسفیان کو اپنے بھائی یزیدؓ بن ابوسفیان کی جگہ شام کا گورنر مقرر کیا۔ ان انتظامات

کے بعد آپ مدینہ واپس آ گئے۔

اس وبا سے نجات ملی تو دوسرے سال یعنی ۱۸ ہجری میں مدینہ اور اس کے نواحی علاقوں میں قحط پڑ گیا۔ حضرت عمرؓ نے نہایت مستعدی سے انتظامات کیے اور ہزاروں مسلمانوں کو بھوکوں مرنے سے بچا لیا۔ آپ نے مفتوحہ علاقہ سے غلہ حاصل کیا اور اسے غرباء میں مفت تقسیم کرایا۔ انہوں نے اپنے گھر کے لیے اناج کا کوئی ذخیرہ نہ کیا۔ جب تک دوسروں کو کھانا نہ مل جاتا وہ خود بھی بھوکے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر میرا پیٹ بھر جائے تو مجھے ان کی تکلیف کا کیسے احساس ہوگا؟ چنانچہ آپ نے قسم کھائی کہ جب تک لوگوں کو سیر ہو کر کھانا نہ ملے گا وہ گھی، دودھ اور گوشت نہیں چکھیں گے۔

قیاریہ کی فتح

قیاریہ، بحر روم پر ملک شام کی ایک اہم بندرگاہ تھی۔ شام فتح ہو چکا تھا لیکن یہ شہر اب تک رومیوں کے قبضے میں تھا۔ یہاں سے رومی، شام میں فساد برپا کر سکتے تھے۔ پس ۱۷ھ میں عمروؓ بن العاص نے اس کا محاصرہ کیا مگر وہ شہر کو فتح نہ کر سکے۔ اگلے سال یزیدؓ بن ابوسفیان نے حملہ کیا مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ پھر ۱۹ھ میں امیر معاویہؓ نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ اب ملک شام کی فتح مکمل ہو گئی تھی۔

بلاذری لکھتا ہے کہ قیاریہ میں تین سو بازار تھے۔ آبادی مخلوط تھی۔ یہاں سے بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ اس کے بعد فرما، بلبیس، قلعہ بابلیون اور فسطاط فتح ہوئے۔ اسکندریہ، مصر کا دارالسلطنت تھا اور رومی طاقت کا ایک اہم مرکز تھا۔ ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے اسکندریہ رومی بحریہ کا مستقر بھی تھا۔ یہاں سے ساحل شام پر بحری حملہ کا خطرہ تھا۔ سکندر اعظم کے مسکن کے علاوہ یہاں عیسائیوں کا سب سے بڑا گرجا سینٹ مارک کیتھڈرل بھی تھا۔ اس کی عمارت کو ملکہ قلوپطرہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اگرچہ وہ رومی مذہب کی عبادت گاہ تھی لیکن عیسائیوں نے اسے گرجا میں تبدیل کر لیا تھا۔

اسکندریہ میں رومی فوجیں بڑی تعداد میں جمع تھیں۔ جب رومیوں کو بابلیون میں شکست ہوئی تو اسکندریہ میں ہر طرف سے فوجیں آ کر جمع ہونے لگیں۔ رومیوں کو اس مضبوط قلعہ پر بڑا ناز تھا۔ رومی بحری بیڑہ بھی یہیں مقیم تھا۔ اسلامی لشکر اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ اسکندریہ سے پندرہ میل مشرق کی جانب رومیوں کے ہراول دستوں نے اسلامی لشکر کی پیش قدمی کو روکنا چاہا لیکن شکست کھا کر اسکندریہ میں پناہ گزیں ہوا۔ عمروؓ بن العاص نے آگے بڑھ کر اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں کے پاس بحری بیڑہ نہ تھا اس لیے وہ رومیوں کو بحری راستے سے ملنے والی فوجی مدد کو نہ روک سکے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے پاس سامانِ حرب کی بھی کمی تھی اس لیے اسکندریہ کا محاصرہ طول کھینچ گیا۔

حضرت عمرؓ کو محاصرہ کے طویل ہو جانے سے پریشانی لاحق ہوئی۔ انہوں نے جناب عمروؓ بن العاص کو حکم بھیجا کہ جس دن میرا خط پہنچے تمام فوج کو اکٹھا کر کے جہاد پر خطبہ دو اور فوراً حملہ کر دو۔ عمروؓ بن العاص نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح ۲۰ھ میں چودہ ماہ کے محاصرے کے بعد اسکندریہ فتح ہوا۔ عمروؓ بن العاص نے اسکندریہ فتح ہونے کی خبر مدینہ بھیجی تو حضرت عمرؓ فاروق نے مسجد نبوی میں نماز شکرانہ ادا کی۔ اسکندریہ مصر کی کنجی تھا اس لیے مسلمانوں نے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

حضرت عمرؓ سے پہلے اور بعد میں بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں لیکن جو جذبہ ہمت و شجاعت، عدل

وانصاف اور حسن اخلاق کا فتوحاتِ فاروقی میں نظر آتا ہے وہ کسی اور فاتح کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ان فتوحات کا اگر جائزہ لیا جائے تو دس سال کے قلیل عرصہ میں صرف چین سے لے کر طرابلس تک تمام ممالک کی تسخیر کے واقعات ہی پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک ہی وقت میں اپنے وقت کی دو عظیم (مجوسی اور نصرانی) سلطنتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں جیسی حقیر اور بے سروساماں قوم کا روم اور ایران جیسی عظیم سلطنتوں کو دیکھتے ہی دیکھتے تہہ و بالا کر دینا تاریخ کا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے۔

فتوحاتِ فاروقی کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ان ممالک کو زیر نگیں کرنے کے لیے وہ ہتھکنڈے ہرگز استعمال نہیں کیے جو فاتحین عالم مفتوحہ علاقوں کو زیر تسلط رکھنے کے لیے عام طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ یعنی وحشت و بربریت کا مظاہرہ، عام شہریوں کا قتل عام، بستیوں اور آبادیوں کو تاراج کرنا اور دشمن کو بے دست و پا کرنے کے لیے ان کے علاقے کو بالکل پامال کر دینا۔ فصلوں اور عمارات کو نذر آتش کرنا۔ اس کے برعکس فتوحاتِ فاروقی میں شہروں کو تاخت و تاراج کرنا تو درکنار، درختوں اور فصلوں کو کاٹنے اور پامال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر تلوار اٹھانا قطعی ممنوع تھا۔ سوائے میدان جنگ کے دشمن کا کوئی شخص کہیں قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دشمن سے سوائے میدان جنگ کے اور کہیں دھوکہ بازی، فریب اور بدعہدی کی سخت ممانعت تھی۔

فتوحاتِ فاروقی کے دوران مسلمانوں نے جس ملک میں بھی قدم رکھا۔ اپنے عدل وانصاف اور حسن اخلاق سے وہاں کے باشندوں کو اپنا ایسا گرویدہ بنا لیا کہ وہ اپنی قوم کے بجائے مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے۔ انہیں شہری اور معاشرتی حقوق عطا کیے جاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے رحمت کا سایہ سمجھتے تھے اور ان کا ساتھ دیتے تھے۔ جنگ یرموک کے موقع پر جب مسلمانوں کو شام کے کچھ علاقے ایک قلیل عرصہ کے لیے خالی کرنا پڑے تو وہاں کے عیسائی روتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ مسلمان پھر وہاں واپس آئیں۔ یہودی ہاتھ میں ریت لے کے کہتے تھے کہ اب ہمارے جیتے جی قیصر یہاں نہیں آسکتا۔

یہ درست ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاتح مثلاً سکندر، چنگیز خان، امیر تیمور اور نپولین جیسے عظیم فاتحین نے ایک قلیل عرصہ میں کئی کئی ممالک ضرور فتح کیے ہیں لیکن ان کی فتوحات کو حضرت عمرؓ کی فتوحات سے نسبت دینا ایسا ہے جیسے زمین کو آسمان سے نسبت دی جائے۔ سکندر اور چنگیز خان وہ فاتح تھے جنہوں نے انسانیت کا بے دریغ قتل عام کیا اور انہوں نے ممالک کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فتوحات دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ وہ پانی کے بلبلے کی طرح آئیں اور مٹ گئیں۔ بے شک چنگیز خان اور سکندر ایک طوفان کی طرح دنیا پر چھا گئے لیکن جب طوفان تھما تو انسانی لاشوں اور عمارتوں کے کھنڈرات کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی فتوحات میں ایک قطرہ خون بلاوجہ نہیں بہایا گیا اور یہ اس قدر دیرپا ثابت ہوئیں کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسلامی پرچم مفتوحہ علاقوں پر آج بھی لہرا رہا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق

صرف ایک فاتح نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ پائے کے جہانگیر اور جہاندار بھی تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جہاں جہاں بھی اسلامی افواج پہنچیں وہاں فوراً نظم ونسق بحال ہوا اور حق وانصاف کا بول بالا ہو گیا۔

تمام بڑے بڑے فاتحین عالم مثلاً سکندر، چنگیز، تیمور، سیزر اور نپولین وغیرہ صرف سپاہی تھے اور انہوں نے اپنی عمریں جنگ کی نذر کر دیں۔ وہ لوگ خود فوجوں کی کمان کرتے تھے۔ برخلاف اس کے حضرت عمرؓ فاروق ایک تجارت پیشہ انسان تھے۔ آپ اپنے دورِ خلافت میں ایک بار بھی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور نہ آپ نے کبھی فوج کی کمان کی لیکن ان کا لشکرِ اسلام میدانِ جنگ میں یوں لڑتا تھا جیسے اس لشکر کی پشت پر کوئی تجربہ کار سالار اس کی رہنمائی کر رہا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنی جوانی میں ایک بہترین شمشیر زن اور اعلیٰ قسم کے سپاہی تھے۔ آپ نے تمام غزوات میں حصہ لیا تھا لیکن یہ سب کچھ خلافت کے زمانے سے پہلے ہوا تھا۔ جبکہ خلیفہ ہونے کے بعد آپ نے کبھی تلوار کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس لیے ہم اگر حضرت عمر فاروقؓ کو دنیا کا ایک عظیم بلکہ سب سے بڑا فاتح کہیں تو یہ غلط نہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی شہادت

۲۳ ہجری میں آپ حج سے واپس آئے تو جمعہ کے خطبہ میں فرمایا۔

”اے لوگو...... میں نے ایک خواب دیکھا ہے جسے میں اپنی موت کا پیغام سمجھتا ہوں۔“

نمازیوں نے حیرانی سے آپ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا۔

”میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لال رنگ کے مرغ نے مجھے تین ٹھونگیں ماریں۔“

علامہ طبری اور ابن اثیر وغیرہ کا بیان ہے کہ انہی دنوں آپ ایک دن بازار کا گشت لگانے نکلے۔ راستے میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام فیروز جسے ابولولو کہا جاتا تھا آپ کو ملا۔ اس نے شکایتاً آپ سے کہا۔

”مجھے میرے آقا مغیرہؓ بن شعبہ سے بچائیے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ ٹیکس (خراج) وصول کرتے ہیں۔“

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ ”تم کتنا ٹیکس ادا کرتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”روزانہ دو درہم ادا کرتا ہوں۔“

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ ”تم کام کیا کرتے ہو؟“

اس نے بتایا۔ ”میں بڑھئی، لوہار اور نقاش ہوں۔“

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

”تمہارے پیشوں کے پیشِ نظر خراج زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔“

وہ منہ بنا کے جانے لگا تو حضرت عمرؓ فاروق نے پوچھا۔

”سنا ہے تم ہوا سے چلنے والی بہت اچھی چکی بنا سکتے ہو؟“

اس نے ”ہاں“ میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا۔

”تو پھر ایک چکی میرے لیے تیار کر دو۔“

وہ بولا۔ ”اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہوگا۔“

حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ قتل کی دھمکی ہے۔ لیکن آپ نے کوئی توجہ نہ دی۔

دوسرے دن ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ فجر کی نماز کے وقت جونہی حضرت عمرؓ فجر کی نماز کی امامت کے لیے کھڑے ہوئے تو فیروز ابولولو نے دفعتاً پیچھے سے آ کر آپ پر خنجر کے پے در پے چھ وار کیے۔ ایک وار پیٹ کے زیریں حصے میں پڑا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ کھڑا

کر دیا اور خود زخموں کے صدمے سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے نماز پڑھائی مگر اس طرح کہ حضرت عمرؓ سامنے زخموں سے نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ فیروز کو گرفتار کرنے کے لیے بڑھے۔ اس نے ان میں سے تیرہ آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ جن میں سے چھ شہید ہو گئے۔ آخر ایک شخص نے کمبل ڈال کر اسے پکڑا مگر اس نے گرفتار ہوتے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ ''میرا قاتل کون تھا؟''

لوگوں نے عرض کیا۔ ''فیروز۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ''الحمدللہ..... میرا قاتل ایسا شخص نہیں جس نے اللہ کو ایک بھی سجدہ کیا ہو۔''

نمازی آپ کو گھر لے گئے۔ زخم کاری تھا۔ جب دوا دارو سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اکابر ملت نے درخواست کی۔

''اپنا جانشین نامزد کر جایئے۔''

انہوں نے فرمایا۔

''اگر میں کسی کو نامزد کردوں تو کر سکتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا۔ اور اگر خلیفہ نامزد نہ کروں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا۔ آخر لوگوں کے اصرار پر حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرت سعدؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، یہ چھ صحابہ کرام جن کی اسلام کے لیے بڑی خدمات تھی اور جنہیں حضور پاک ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی۔ نامزد کر کے فرمایا۔

''ان میں سے جس پر کثرت رائے ہو جائے اسے خلیفہ بنا لیا جائے۔''

اور یہ تاکید کی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے ہو جانا چاہیے اور حضرت صہیب رومی کو حکم دیا کہ میری تجہیز و تکفین کے بعد ان چھ اصحاب کو ایک مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک وہ کسی ایک پر متفق نہ ہو جائیں اس وقت تک نہیں کھولنا۔ پھر اپنے صاحبزادے عبداللہ کے متعلق فرمایا کہ وہ مشورے میں شریک رہیں۔ مگر خلافت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر ارکان دو گروہوں میں بٹ جائیں تو عبداللہ کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ نیز کثرت رائے کے بعد اگر کوئی شخص خلافت کا مدعی رہے تو اسے قتل کر دینا۔ فیصلہ ہونے تک صہیب رومیؓ نماز پڑھائیں گے۔

حضرت طلحہؓ اس وقت مدینہ میں نہ تھے۔ ان کے لیے فرمایا کہ تین روز تک انتظار کیا جائے۔ آ جائیں تو بہتر ہے ورنہ مزید انتظار نہ کیا جائے۔ اس کے بعد اپنے جانشین کے لیے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں فرمائیں۔ مہاجرین اور انصار اور ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی ہدایات تھیں۔ لوگوں کو حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

جب حضرت عمرؓ کو بچنے کی کوئی امید نہ رہ گئی تو آپ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ کو حجرہ نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ عبداللہؓ، حضرت عائشہؓ کے پاس آئے۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ جب عبداللہ نے مدعا بیان کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا۔

''یہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی۔ لیکن آج عمرؓ کو اپنے اوپر ترجیح دوں گی۔''

عبداللہؓ نے واپس آ کر بتایا کہ حضرت عائشہ نے اجازت دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

''الحمدللہ۔ یہی سب سے بڑی آرزو تھی۔'' بعد ازاں فرمایا۔

''میرے مرنے کے بعد جنازہ اٹھا کر لے جانا۔ حضرت عائشہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر

سلام کرنا اور کہنا کہ عمرؓ داخلہ کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ اجازت دیں تو بہتر ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔"

اس کے بعد ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے فرزند عبداللہؓ کو وصیت کی کہ میرے بعد میرا قرض ادا کر دینا۔ اگر میرے متروکہ مال سے ادا نہ ہو تو خاندان عدی سے درخواست کرنا۔ ان سے نہ ہو تو کل قریش سے۔ قریش کے علاوہ کسی اور سے نہیں۔" اس کے علاوہ بیٹے سے فرمایا۔

"مجھے اوسط درجہ کا کفن دینا۔ کیونکہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اسے اچھے لباس سے بدل دے گا۔ اور اگر اس کے برعکس ہوا تو وہ مجھ سے چھین لے گا اور بہت تیزی سے چھین لے گا۔ میری قبر بھی معمولی ہونی چاہیے۔ عورتیں میرے جنازے کے ساتھ نہ چلیں۔ اور میری تعریف میں وہ باتیں نہ کہی جائیں تو مجھ میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اللہ مجھے زیادہ جانتا ہے۔ جب تم میرا جنازہ لے کر نکلو تو تیز تیز قدم چلنا کیونکہ اگر مجھ میں اللہ کے نزدیک کوئی بھلائی ہے تو تم مجھے اس جگہ جلدی پہنچا دو گے جو میرے لیے زیادہ بہتر ہے اور اگر میں اس کے برعکس ہوں تو تم اپنے کندھوں سے وہ برائی اتار پھینکو گے جو تم اٹھائے پھرتے ہو۔"

ان وصیتوں کے بعد اور بروز بدھ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ ہجری مطابق ۴ نومبر ۶۴۴ء کو زخمی ہونے کے تین روز بعد حضرت عمر نے بروز ہفتہ ۹ ذی الحجہ وفات پائی اور بروز شنبہ یکم محرم الحرام ۲۴ ہجری کو اپنی خواہش کے مطابق جناب سرور کائنات ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ نماز جنازہ حضرت صہیب رومیؓ نے پڑھائی اور حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت زبیرؓ بن عوام نے آپؓ کو قبر میں اتارا۔ حضرت ابوبکرؓ کا سر شانہ رسالت ﷺ کے متوازی تھا۔ حضرت عمرؓ کا سر شانہ صدیقیؓ کے متوازی رکھا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس سے کچھ زیادہ تھی اور مدت خلافت دس سال چھ ماہ چار دن، وہ سب سے زیادہ عادل، سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے امیر تھے۔

❁❁❁

اب ہم ایک بار پھر فلسطین اور بیت المقدس کی طرف آ رہے ہیں مگر اس سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے۔ اس کی موٹی موٹی باتوں کو ایک بار پھر دہرایا جائے اور کتاب پڑھنے والے کو کسی طرح کی الجھن نہ محسوس ہو۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں رومی لشکر کو جنگ اجنادین میں شکست دی تھی۔ جنگ اجنادین جیتنے کے بعد اسلامی فوجوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس لڑائی کے تقریباً ایک ماہ بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسلامی فوجیں بدستور بڑھتی رہیں اور انہوں نے دمشق، اردن اور حمص کے مقامات پر قبضہ کر لیا۔

ہرقل شاہ روم نے مختلف صوبوں سے فوجیں اکٹھی کر کے مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجیں مگر یرموک کی فیصلہ کن جنگ میں حضرت خالدؓ نے انہیں شکست دے کر منتشر کر دیا۔ اس لڑائی کے بعد مسلمانوں کا سارے شام پر قبضہ ہو گیا۔ ادھر محاذ فلسطین کے سپہ سالار عمروؓ بن العاص نے چند اہم مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی اور ان کی درخواست پر حضرت عمرؓ خود بیت المقدس تشریف

لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ اس طرح بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

فلسطین کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد عمروؓ بن عاص نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے چار ہزار فوج کے ساتھ مصر پر حملہ کیا۔ ان دنوں مصر پر مقوقس کی حکومت تھی جو شہنشاہ روم کا باجگزار تھا۔ مسلمانوں نے چھوٹے چھوٹے شہر فتح کرنے کے بعد فسطاط کے مضبوط قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر سات ماہ کے محاصرے کے بعد مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ فسطاط سے فارغ ہو کر اسلامی فوج نے اسکندریہ اور طرابلس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح لیبیا سے ابی سینیا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

دشمنوں کے گٹھ جوڑ

ترقی کے اس دور میں دشمنوں کی کارروائیاں کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ آج کل بیت المقدس میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسے ہم اپنی کھلی آنکھوں سے روز ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ یہودی بے دھڑک فلسطینیوں کے احتجاجی جلسے، جلوسوں، مکانوں، دکانوں اور مسلم محلوں پر بمباری کر رہے ہیں۔ بڑے کیا، بچے کیا، عورت کیا، ان یہودیوں کو کسی پر ترس نہیں آتا۔ یہ ٹینکوں کے زور پر محلوں کو بم مار کر ملبہ بنا دیتے ہیں۔ اسکول کے بچے بچیوں پر مشین گنیں کھول دیتے ہیں۔ روز صبح سے شام تک بیت المقدس کے کسی نہ کسی محلے میں مسلح یہودی یلغار کرتے گھس جاتے ہیں۔ توڑ پھوڑ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔ انہیں کوئی روکنے یا منع کرنے والا نہیں۔

مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہودیوں نے بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ کبھی قبول نہیں کیا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جو حال مسلمانوں کا تھا وہی حال آج بھی ہے اور اس کا ثبوت ٹی وی کے وہ خوف ناک مناظر ہیں جو روز اسکرین پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہودیوں کے بلڈوزر مسلمانوں کے مکانات، دکانیں توڑ پھوڑ کر ملبہ بنا رہے ہیں۔ مگر وہ یہودی عمال کو دکھائی نہیں دیتے۔ اس لیے کہ طاقت کا توازن یہودیوں کے حق میں ہے۔ اس لیے کہ برطانیہ اور امریکا یہودیوں کے ساتھی ہیں۔ اس لیے کہ امریکا یہودیوں کا سرپرست ہے۔ اس لیے کہ امریکا کی پارلیمنٹ میں یہودیوں کا پورا پورا اثر و رسوخ ہے۔ اس لیے کہ امریکا کی حکومت دراصل امریکا کی نہیں بلکہ یہودیوں کی حکومت ہے۔ بظاہر حکومت میں عیسائی بھی ہیں مگر مسلمانوں کے خلاف عیسائی بھی یہودی بن جاتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ امریکا میں نصرانی حکومت نہیں بلکہ یہودی حکومت ہے اور وہاں یہودی قانون چلتا ہے۔

امریکا کے اس جانب دارانہ قانون نے امریکا کے رہائشی مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا ہے۔

پاکستان کے ایک سابق ممتاز سفارت کار نے جن کا نام قطب الدین عزیز ہے، برطانیہ اور امریکا سے واپسی پر حکومت کی توجہ بھارت، اسرائیل اور انتہا پسند عیسائی لابی کے گٹھ جوڑ کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ حکومت پاکستان اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکا کو آگاہ کرے اور پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف سہ جماعتی گٹھ جوڑ اور اس کے زہر آلود پروپیگنڈے کا توڑ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس زہریلے پروپیگنڈے کا توڑ سفارتی اور ابلاغ عامہ کی سطح پر کرنا پورے عالم اسلام کی ذمہ داری ہے۔

پاکستانی سفارت کار نے ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد پاکستان کے علاوہ عام مسلمانوں اور اسلام کے

خلاف اسرائیل، امریکا، برطانیہ اور بھارت کی انتہاپسند لابی کے حوالے سے جن حالات کی نشان دہی کی ہے وہ کوئی راز نہیں۔ یہی لابی حال ہی میں ایک کنونشن کے دوران فلسطین کو مکمل طور پر اسرائیل کے حوالے کر کے عربوں کو فلسطین سے نکالنے کا مطالبہ کر چکی ہے اور اسرائیل آج کل اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔

حکومت مصر کے مطابق ہزاروں فلسطینی ہجرت کر کے مصر پہنچ چکے ہیں اور اسرائیلی فوج مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی املاک کی تباہی میں مصروف ہے۔ امریکا اور تمام بڑی عیسائی طاقتیں اس پر مہر بہ لب ہیں اور اقوام متحدہ بھی خاموش ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ پاکستان میں حالیہ انتخابات میں "دینی جماعتوں" کی کامیابی کو مغرب کے خلاف خطرے کی گھنٹی قرار دے رہے ہیں۔ امریکا، آسٹریلیا، فرانس اور برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ نہایت ناخوشگوار واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مساجد پر چھاپے اور شک و شبہے کی بناء پر گرفتاریاں، مسلمانوں کے ساتھ توہین آمیز رویہ اور خواتین کی تذلیل نے ان ملکوں میں جمہوریت اور انسانی حقوق کے احترام کا پول کھول دیا ہے۔

اس حوالے سے سفارت کار کا یہ مطالبہ درست ہے کہ پاکستان کی حکومت کو جرأت مندی سے اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکا کو آگاہ کرنا چاہیے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے پورے عالم اسلام کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے ورنہ ذرائع ابلاغ کی دروغ گوئی اور الزام تراشی مسلمانوں کے لیے مزید مشکلات پیدا کرے گی۔ اس لیے ہنود، یہود اور نصرانیوں کی طرف سے عالم اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور سیاہ کاریوں کا جواب دینے کے لیے سفارتی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے ساتھ ساتھ امریکا اور یورپ میں دانش وروں اور اسکالروں کے ایسے وفود بھیجنے کی ضرورت ہے جو ان ممالک میں پاکستانیوں اور مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا موثر اور مستقل سد باب کر سکیں۔

ورنہ اگر امریکا نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو اختلاف کی یہ خلیج بڑھتے بڑھتے پھر کسی دوسرے "ستمبر" کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں کے مذہبی اختلاف کا مسئلہ ہے تو یہ آج کا نہیں بلکہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔ یہ اختلاف آغاز اسلام میں پیدا ہوا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "خدائے واحد" کا نعرہ بلند کیا اور دنیا کے تمام بتوں کو سرنگوں کر دیا۔

بیبرس بند قدار

آیئے تیرھویں صدی میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ ہلاکو خان اور فرنگی متحدہ لشکر پیش قدمی کرتا ہوا ۱۲۵۹ء میں سرحد فلسطین تک پہنچا تھا کہ خاقان اعظم منگو خان اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ خبر ہلاکو خان تک پہنچی تو وہ واپسی کے لیے مجبور ہو گیا۔ جاتے ہوئے وہ دس ہزار تاتاری فوج صلیبیوں کی مدد کے لیے چھوڑ گیا اس کا سردار کتغا خان تھا۔ یہ یروشلم سے ہوتا ہوا آگے بڑھا مگر غزہ کے میدان میں بیبرس بند قدار نے تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو زبردست شکست سے دوچار کیا اور تاتاری بلاد فلسطین سے نکل گئے اور بیبرس بند قدار آگے بڑھ کر دمشق پر قابض ہو گیا اور اس کا ستارہ چمکنے لگا۔ یہ واقعہ ۱۲۶۰ء کا ہے۔

غزہ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے پاس انطاکیہ سے حمص الاکرار تک ساحل سمندر پر تیس قلعے بچ گئے تھے۔ ملک الظاہر بیبرس بند قدار اندرونی اصلاحات اور انتظامات سے فارغ ہوا تو اس نے صلیبیوں پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بیبرس بند قدار کو بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرح ہر وقت جہاد کا شوق لگا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۲۶۵ء میں صلیبیوں سے قیصریہ، عتلیث، حیفہ اور ارسوف کے قلعے چھین لیے اور دوسرے سال یافہ، انطاکیہ، بلفورٹ اور بعض دوسرے قلعوں پر قابض ہو گیا۔

یہ خبر جب یورپ پہنچی تو شاہ فرانس لوئیس نہم نے زبردست جنگی تیاریاں شروع کر دیں لیکن جیسے ہی وہ ساحل تیونس پر اترا۔ اسے اور اس کی فوج کو طاعون نے گھیر لیا۔ شاہ فرانس اس مرض کا شکار ہو گیا۔ اس مہم میں شاہ انگلستان ایڈورڈ اول بھی شریک تھا۔ وہ عکہ پہنچ چکا تھا کہ اسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی جس سے وہ بددل ہو کر واپس چلا گیا۔

ادھر بیبرس بند قدار نے ۱۲۷۱ء میں حمص الاکرار اور عکہ کے سامنے نائٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر لیے اور عیسائی حملہ آوروں کے غرور کو توڑنے کے لیے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف بڑھا۔ وہ ایشیائے کوچک میں مصروف تھا کہ ۱۲۷۵ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اس پار سے حملہ آور ہوئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور ملک الظاہر بیبرس بند قدار کے ہاتھوں انہیں دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ملک الظاہر بیبرس بند قدار اس جنگ میں زخمی ہو گیا۔ افسوس کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور ۱۲۷۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن سلطان قلادون نے اسے الگ کر کے خود تخت و تاج سنبھال لیا۔

بار بار کی شکستوں سے صلیبیوں کے حوصلے پست ہو گئے لیکن ان کے دلوں میں بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھڑانے کی اب بھی آرزو تھی پس ۱۲۹۱ء سے ۱۳۱۰ء تک صلیبی جہاد کے نعرے لگاتے رہے۔ اس سلسلے میں انگلستان اور فرانس نے صلیبی جہاد کے لیے عشر بھی وصول کیا۔ نئے نئے منصوبے بنائے گئے مگر انہیں جنگ کی ہمت نہ ہوئی۔ ادھر ترکوں نے دریائے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنی دفاعی حیثیت خوب مضبوط کر لی۔

ایک صلیبی مورخ انتہائی مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے۔

"ہم یروشلم کی صلیبی ریاست بحال نہ کرا سکے جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد برسرپیکار رہے۔ اور آج بھی وہ مزار مسیح کے سائے تلے محو خواب ہیں۔"

اس کے بعد ۱۳۶۵ء سے ۱۳۶۷ء تک سائپرس، وارنا، نائیکو پوس وغیرہ مجاہد بن کر مصر و شام میں لڑتے رہے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بھی بہت سے پوپوں نے مذہبی جنگ کی تبلیغ کی مگر یورپ میں کسی جگہ کوئی حرارت نہ پیدا ہوئی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کی یلغار نے ترکی قبائل کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ ایشیاء کے مختلف علاقوں میں بھاگ نکلے۔ ان کا ایک قبیلہ جس کا سردار ارطغرل تھا اس نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کمزور فریق کا ساتھ دے کر اسے جنگ جتا دی اور تاتاری بھاگ گئے۔ ارطغرل نے جس گروہ کی مدد کی تھی وہ سلطان علاؤالدین سلجوقی کی فوج تھی جسے ارطغرل نے مدد دے کر تباہی سے بچایا تھا۔

چنانچہ سلطان نے ارطغرل کو اس بروقت مدد کے صلہ میں دریائے سقاریہ کے بائیں جانب سفوت کا زرخیز علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔ ارطغرل نے اپنی شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ وہ ترکوں کے حلیف بن گئے۔ پھر اپنی قوت بازو سے ترقی کر کے سلطان سلجوق کا نائب بن گیا۔ پھر ارطغرل نے تاتاریوں

اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو زبردست شکست دی۔ پس سلطان نے اس کی جاگیر میں اضافہ کر دیا۔

ارطغرل نے کبھی خودمختاری کا دعویٰ نہیں کیا اور مرتے وقت تک سلطان قونیہ کا وفادار جاگیردار رہا۔ ارطغرل کے مرنے پر اس کا بیٹا عثمان خان تخت نشین ہوا۔ اسی عثمان خان نے دولت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ سلطان علاؤالدین نے خوش ہو کر قراجہ حصار کا قلعہ اور نواحی مضافات عثمان خان کو دے دیے اور اپنا سکہ جاری کرنے، خطبہ میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جب ۱۳۵۹ء میں عثمان خان کا انتقال ہوا تو اس کا چھوٹا بیٹا اُورخان ۴۲ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ یوں سلاطین عثمانیہ کا سلسلہ چل نکلا۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس خاندان کی پوری تفصیل بیان کی جائے مگر مجبوری یہ ہے کہ ہمارے اس ناول کا نام فلسطین (بیت المقدس) ہے اس لیے ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ مگر اس عثمانی سلطان اورخان کے زمانہ میں ایک ایسا تاریخ ساز اور رومان انگیز واقعہ پیش آیا جسے تقریباً ہر مورخ اور تاریخی ادیبوں نے کم و بیش پوری تفصیل سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس رومان کو اپنے قارئین کے گوش گزار کرنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔

اس رومانی کہانی کا نام بعض مورخین نے ''تحفہ رونمائی'' اور بعض نے ''جوزیفائن قیصران'' لکھا ہے۔ بہرحال نام میں کیا رکھا ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ اب میں اس رومان کا آغاز کرتا ہوں۔

شاہی ہرکارہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قیصران کے پاس پہنچا۔

قیصران اپنے فوجی دستے کے ساتھ بروصہ کے میدان میں نیزہ بازی کی مشق کر رہا تھا۔ ہرکارے نے اسے پیغام دیا۔

''بارگاہ عالی میں آپ کو طلب کیا گیا ہے۔''

یہ اچانک اور بے وقت طلبی قیصران کے لیے پریشان کن تھی۔ قیصران نے اپنے سپاہیوں کو مشق جاری رکھنے کا حکم دیا اور ہرکارے کے ساتھ قصر سلطانی کی طرف روانہ ہوا۔

دولت عثمانیہ ترکی کا سلطان اورخان دربار خاص کے عقبی کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے قیصران کو وہیں باریابی کی اجازت دی۔

قیصران کمرے میں پہنچ کر تعظیم بجا لایا۔ سلطان ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ اس کا چہرہ فکرمند تھا۔ قیصران سر جھکائے کھڑا تھا۔

سلطان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''قیصران! تم کبھی باب الامارت گئے ہو؟''

اس زمانہ میں قسطنطنیہ کو باب الامارت کہا جاتا تھا۔ یورشیا کے تمام سلاطین اور بادشاہوں کا خیال تھا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والا یورپ اور ایشیا کا شہنشاہ ہوتا ہے۔

قیصران نے ادب سے جواب دیا۔

''عالی جاہ! اس غلام کا بچپن تو قسطنطنیہ کی فضاؤں میں پروان چڑھا ہے۔''

''بہت خوب۔'' یہ کہہ کر سلطان نے اس طرح سانس لی جیسے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہو۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ سلطان کی زبان سے قسطنطنیہ کا نام سن کر قیصران کا دل سینے میں اچھل پڑا تھا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی دبا ہوا زخم ہرا ہو گیا۔

اس نے قسطنطنیہ میں آنکھ کھولی۔ پل بڑھ کر جوان ہوا۔ ماں بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئی تھی۔ خالہ نے قیصران کی پرورش کی تھی۔ خالہ کی بیٹی جوزیفائن اس کی منگیتر اور دل کی ملکہ تھی۔ دونوں کے باپ قسطنطنیہ سے دور ریاست نائیسا کی نصرانی فوج میں ملازم تھے۔ جس وقت عثمانی لشکر نے نائیسا پر حملہ کیا۔ قیصران اس وقت باپ اور خالو کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ وہ بھی فوج میں بھرتی ہونے کا خواہش مند تھا لیکن سلطان اورخان نے نصرانی فوج کو تہہ تیغ کر کے نائیسا پر قبضہ کر لیا۔ اس دار و گیر میں قیصران کا باپ اور خالو دونوں ہی مارے گئے اور وہ گرفتار ہو کر ترکوں کے صدر مقام ''بروصہ'' پہنچا دیا گیا۔

قیصران مسلمانوں کی بہادری سے پہلے ہی متاثر تھا۔ یہاں ان کا اخلاق دیکھا تو مسلمان ہو گیا اور خان کی نئی تنظیم ینی چری (انکشاری) میں شامل ہو گیا۔ انکشاریہ میں صرف وہ جوان قیدی شامل کیے جاتے تھے جو مسلمان ہو کر فوجی خدمات انجام دینا چاہتے تھے۔

سلطان کے خیالات کا سلسلہ شاید ٹوٹ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر قیصران کو مخاطب کیا۔

''قیصران! ہم تمہیں ایک اہم کام سونپنا چاہتے ہیں۔''

''یہ ظل سبحانی کی بندہ پروری ہے۔'' قیصران نے جواب دیا۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا تھا؟ سلطان کو یقیناً اس پر اعتماد تھا۔

سلطان کے چہرے پر کچھ بشاشت آئی۔ اس نے قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کوچ نما کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلطان نے ٹھہر ٹھہر کر پراعتماد لہجے میں کہا۔

''قیصران! آج کل قسطنطنیہ اور سلطنت بازنطین کے حالات ٹھیک نہیں۔ شہنشاہ قسطنطین کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ ملکہ اینا نے کمسن شہزادہ جان پلیوگس کو تخت نشین کیا۔ حکومت نادان بچوں اور ناتجربہ کار عورتوں سے نہیں چلا کرتی۔ ملکہ نے مجبور ہو کر ایک سردار کنٹا کوزین کو شہزادے کا ولی مقرر کیا۔ اب نام تو ملکہ اور شہزادے پلیوگس کا ہے لیکن تمام امورِ سلطنت بلاشبہ کنٹا کوزین کے سپرد ہیں۔ اب ملکہ اور کنٹا کوزین میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور کنٹا کوزین نے ''نیکوڈیکا'' پہنچ کر علم بغاوت بلند کیا ہے۔ اس وقت ملکہ کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے قسطنطنیہ کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ ہمارا فیصلہ سلطنت قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومت کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔''

سلطان خاموش ہو کر قیصران کو دیکھنے لگا۔ قیصران کو خیال گزرا کہ شاید سلطان اس کے جواب کے منتظر ہیں۔

''سلطان عالم ارشاد فرمائیں۔ میں اس سلسلے میں کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں؟''

''ہم تمہیں اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیج رہے ہیں۔'' سلطان نے قیصران کو بغور دیکھا۔ ''تم ملکہ سے مل کر یہ معلوم کرو گے کہ اس مدد کے معاوضہ میں وہ ہمیں کیا اور کہاں تک مراعات دیں گی؟''

قیصران نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد عرض کیا۔

''غلام اس حکم کی بجا آوری کے لیے کب روانہ ہوگا؟''

مگر سلطان نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک اور سوال کیا۔

''قیصران! تم نصرانی ہو؟''

''نہیں سلطان عالی مقام۔ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔'' قیصران نے سنبھل کر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ہم تمہارے جواب سے خوش ہوئے۔'' سلطان بولا۔ ''اور ہاں۔ قسطنطنیہ میں ٹھہر کر تمہیں یہ اندازہ لگانا پڑے گا کہ ملکہ کا عوام پر کس حد تک اثر ہے؟''

قیصران کی تو جیسے دل کی مراد بر آئی۔ ہر چند کہ اس نے قسطنطنیہ واپس جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا مگر کسی وقت اس کا دل قسطنطنیہ کو ایک نظر

دیکھنے کے لیے بے چین ہو جاتا تھا۔ اس نے دل کے ایک کونے میں جوزیفائن کی یاد چھپا رکھی تھی۔ مسلمان ہو جانے اور عثمانی لشکر میں ایک ہزار انکشاری سردار ہو جانے کے باوجود وہ دل سے جوزیفائن کی یاد کو ختم نہ کر سکا تھا۔ اس کے دل میں کسی کسی وقت خیال آتا۔

”کیا جوزیفائن اب بھی میرا انتظار کر رہی ہوگی؟“

پھر خیال آتا چار سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

دوسرے دن قیصران کو قسطنطنیہ جانے کا پروانہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی حکم تھا کہ روانگی سے پہلے وہ ایک بار سلطان کے سلام کو حاضر ہو۔

قیصران کو تنہا قسطنطنیہ جانا تھا۔ اس لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی مگر وہ یہ سوچ کر ضرور الجھ رہا تھا کہ سلطان نے اسے دوبارہ گفتگو کے لیے کیوں بلایا ہے۔

دوسری شام قیصران حسب الحکم پھر سلطان کی ملاقات کو قصر شاہی پہنچا۔ سلطان کو اس کی حاضری کی اطلاع دی گئی اور سلطان نے اسے فوراً طلب کر لیا۔

قیصران جب شاہ کے حضور پہنچا تو اس وقت سلطان بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ سلطان نے قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سنگ سرخ کے ایک ستون پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ قیصران کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ لوگ تو سلطان کی صورت دیکھنے کے لیے ترستے تھے مگر اس کی دو دن میں یہ سلطان سے دوسری ملاقات تھی۔

سلطان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے کہا۔

”قیصران! ہم نے کل رات ایک ہزار شکرانے کے نفل کا نذرانہ اللہ کے حضور پیش کیا۔ تم پوچھو گے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ذوالجلال نے آج سلطنت عثمانیہ کو یہ عزت و عظمت بخشی ہے کہ شہنشاہ بازنطین کی ملکہ ہم سے فوجی مدد کی خواستگار ہے۔“

قیصران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بس اس نے شاہی ادب ملحوظ رکھتے ہوئے سلطان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سلطان، ستون سے ہٹ کر بالکل قیصران کے قریب آ گیا۔ قیصران پاسِ ادب سے جھک گیا۔ سلطان مسکرایا اور بولا۔

”قیصران! تمہیں مبارک ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ ملکہ سے دوران گفتگو کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے سلطنت عثمانہ ترکی کے وقار کو ٹھیس پہنچے۔ ہم نے اپنے امراء پر تمہیں اس وجہ سے فوقیت دی ہے کہ تم ان سے زیادہ خلوص اور دیانت کے مالک ہو۔“

قیصران دراصل سلطان کے خسروانہ سلوک کی وجہ سے دبتا جا رہا تھا اس لیے وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح سلطان کے سامنے سے ہٹ جائے مگر سلطان کی باتیں ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہی تھیں۔ چنانچہ قیصران نے سلطان کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

”اگر سلطان کا حکم ہو تو میں انکشاریوں کے لباس کے بجائے عام کپڑوں میں قسطنطنیہ کا سفر اختیار کروں؟“

سلطان نے چند لمحے قیصران کی تجویز پر غور کیا۔ پھر کہا۔

”بے شک...... بے شک۔ بلکہ یہ اور زیادہ بہتر ہوگا کہ تم ایک عام شہری کے لباس میں قسطنطنیہ میں داخل ہو۔ قیصران! ہم تمہاری عقل کے ابھی سے قائل ہو گئے ہیں۔ جو بات ہم بھول رہے تھے وہ تم نے یاد دلا دی۔“

سلطان اُورخان کے عہد میں سلطانی فوج میں دو طرح کے لشکر تھے۔ ایک تو عام ترکوں کا لشکر اور دوسرا انکشاریوں کا جو نصرانی اسیران جنگ پر مشتمل تھا۔ جس وقت اُورخان نے انکشاریہ کا لشکر ترتیب دیا تو

شیخ المشائخ بکتاش کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کا طالب ہوا۔

شیخ نے اس نئے لشکر کے لیے دعا فرمائی اور خود انہوں نے اس کا نام ”ینی چری“ رکھا جو عربی میں انکشاری ہے۔ حاجی بکتاش اونچی ٹوپی پہنتے تھے جس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی تقلید میں سلطان نے حکم دیا کہ انکشاری لشکر کا ہر فرد سفید اونچی ٹوپی پہنے گا۔

قیصران جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی وردی یعنی سفید اونچی ٹوپی پہن کر قسطنطنیہ میں گیا تو فوراً پہچان لیا جائے گا کہ وہ نصرانی النسل ہے۔ اس لیے اس نے سلطان سے دوسرا لباس استعمال کرنے کی اجازت مانگی تھی اور سلطان اس وجہ سے اس کی دور اندیشی کا قائل ہوا تھا۔

پھر رات سونے سے پہلے قیصران ان تین بازنطینی سرداروں کے ساتھ قسطنطنیہ روانہ ہوا جو ملکہ اینا کا پیغام عثمانی سلطان کے پاس لے کر آئے تھے۔

❁❁❁

قیصران عام ترکی لباس میں بازنطینی سرداروں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ انہیں کسی طور پر بھی شبہ نہ ہوا کہ ان کا نیا ساتھی نہ صرف نصرانی النسل ہے بلکہ ان کا ہم وطن بھی ہے۔ بازنطینی سرداروں نے کئی بار قیصران سے گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر قیصران صرف ہاں، ہوں کر کے خاموش ہو جاتا تھا۔

قیصران عثمانی تربیت کی وجہ سے تیز رفتاری کا عادی تھا۔ اس کا گھوڑا بار بار ساتھیوں سے آگے نکل جاتا تھا اور اسے رک کر بازنطینی سرداروں کا انتظار کرنا پڑتا۔

بازنطینی اس کے قریب پہنچ کر پہلے اپنا سانس درست کرتے پھر آگے قدم بڑھاتے تھے۔ ایک بار تو قیصران کا گھوڑا اسے اس قدر آگے لے گیا کہ اسے ایک چشمے کے پاس ٹھہر کر کافی دیر تک ساتھیوں کا انتظار کرنا پڑا۔

بازنطینی قریب آئے تو وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان کے پیٹ میں سانس نہ سماتی تھی اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ قیصران کو ان کی حالت پر ہنسی آ گئی۔ اس نے سوچا مسلمانوں اور نصرانیوں میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے اسے یہ بات منہ سے نکالنا پڑی۔ جب نصرانیوں کے حواس درست ہوئے تو ان میں سے ایک سردار نے کہا۔

”قیصران! کیا تمہارا گھوڑا اتنی ہی تیز رفتاری سے دوڑتا ہے یا تم ہمیں پریشان کرنے کے لیے اسے تیز بھگا رہے ہو۔“

قیصران کو آخر دل میں آئی ہوئی بات کہنا پڑی۔ پس اس نے ہنس کے کہا۔

”معزز سردار! نصرانی سپاہی اور عثمانی سپاہی میں یہی سب سے بڑا فرق ہے۔ جو فاصلہ آپ تین دن میں طے کرتے ہیں وہ ہم ایک دن میں طے کر لیتے ہیں۔“

بازنطینی سردار کیا جواب دیتا۔ وہ تو بس قیصران کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب بات آ ہی پڑی تھی تو قیصران نے خود ان سے کہا۔

”میرا نام قیصران ہے۔ مگر آپ کو یہ میرا نام کس نے بتایا؟“

ان سرداروں میں سے ایک نے جواب دیا۔

”ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ایک ہزار دستوں کے سردار ہیں۔“

قیصران کو بڑی حیرت ہوئی۔ اور اب وہ سوچنے لگا کہ کہیں ان سرداروں کو یہ تو نہیں معلوم ہو گیا کہ میں نصرانی ہوں۔ لیکن قیصران نے اپنے جذبات چہرے پر نہ آنے دیے اور صرف حیران نظروں سے

انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

اور آخر ان سرداروں میں سے دوسرے سردار نے خود ہی اس معمہ کو حل کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”قیصران! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ باتیں ہمیں خود آپ کے سلطان نے بتائی ہیں۔“

قیصران کو قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن اس نے اپنے دل کی خلش دور کرنے کے لیے ان سے سوال کیا۔

”سلطان معظم نے میرے بارے میں آپ کو اور کیا کچھ بتایا ہے؟“

قیصران کے سوال پر سرداروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا پھر ان میں سے ایک بولا۔

”ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ سلطان کے بہت قریب ہیں۔ اتنے قریب کہ سلطان نے ملکہ قسطنطین کی درخواست پر جو کچھ فیصلہ کیا۔ آپ اس سے بھی آگاہ ہیں۔“

قیصران فوراً سمجھ گیا کہ مخالف سردار بڑی چالاکی سے سلطان کی آڑ لے کر اس کے منہ سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے لیے مطلب کی ہو۔ چنانچہ جواب دینے سے پہلے قیصران جست لگا کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس کے فوراً بعد گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب قیصران کا گھوڑا آگے آگے اور مخالف سردار اس کے پیچھے پیچھے گھوڑے بھگاتے آرہے تھے۔

بازنطینی سردار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ وہ قیصران سے کچھ بھی نہ پوچھ سکے۔ قیصران نے کچھ آگے جا کر گھوڑا آہستہ کر لیا اور جب بازنطینی سردار اس کے پاس پہنچ گئے تو وہ سب ایک ساتھ چلنے لگے۔

قیصران کو قسطنطنیہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس نے اس سے پہلے سوچا بھی نہ تھا کہ اسے اپنا وطن دیکھنے کا موقع مل سکے گا یا وہ اس ارمان کو اپنے ساتھ ہی لے کر دنیا سے اٹھ جائے گا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کا دل کبھی کبھی یہ ضرور کہتا تھا کہ قیصران صبر کر۔ تو اپنی محبوبہ سے ضرور ملے گا۔ جوزیفائن بھی اسی آگ میں جل رہی ہے جس آگ میں تو سلگ رہا ہے۔

قیصران کو خود قسطنطنیہ پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ اس کا تیز رفتار گھوڑا بار بار زور کرتا کیونکہ وہ اور اس کا سوار اس سست روی کے عادی نہ تھے۔ قیصران مختلف راستوں سے بھی واقف تھا لیکن اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا پڑ رہا تھا۔ بازنطینی سواروں نے صاف اور طویل راستہ اختیار کیا تھا حالانکہ وہ اگر بحر اسود کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تو آبنائے باسفورس تک بہت جلد پہنچ سکتے تھے لیکن وہ بازنطینیوں کو شارٹ کٹ (مختصر راستہ) بتا کر کسی قسم کے شک وشبہ کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

آخر یہ لوگ خدا خدا کر کے تیسرے دن آبنائے باسفورس پر پہنچے۔ یہ آبنائے ایشیاء اور یورپ کی حد فاصل ہے۔ آبنائے کے مشرقی جانب براعظم ایشیا اور مغرب میں براعظم یورپ ہے۔ اس وقت بازنطینیوں کے تمام ایشیائی علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یورپ میں بازنطینی حکومت مقدونیہ اور یونان کے ایک مختصر اور محدود علاقے پر قابض تھی۔

قیصران کے پاس سلطنت عثمانیہ ترکی کا پروانہ راہداری تھا اور بازنطینی سرداروں کے پاس ملکہ قسطنطین کا اجازت نامہ تھا۔ اس لیے انہیں بارڈر پار کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ آبنائے باسفورس پار کر کے قسطنطنیہ کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی قیصران کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہی کوچہ و بازار، وہی رونقیں اور چہل پہل۔ پچھلے چار سال کے دوران قسطنطنیہ میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ شہر میں کہیں

کہیں فوجی نقل وحرکت دکھائی دیتی تھی۔ امن کے زمانہ میں فوجی سواریاں یا گاڑیاں سڑکوں پر دکھائی نہ دیتی تھیں۔ لیکن آج کل فوجی سوار اور پیادے ادھر ادھر پہرہ دیتے اور گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ جنگ قسطنطنیہ سے ابھی بہت دور تھی۔ کنٹا کوزین نے نیکوٹیکا میں اپنا مستقر بنایا تھا اور فوجیں اکٹھی کر کے قسطنطنیہ پر ایک بڑے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا صرف اتنا ضرور تھا کہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کہیں نہ کہیں ہو جاتی تھیں۔

شہنشاہ قسطنطین کا شاہی محل ایک ایسی شان دار اور دیدہ زیب عمارت تھی جس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ایک زمانہ میں بازنطینی سلطنت یوریشیا (یورپ اور ایشیا) کی عظیم ترین حکومت تھی۔ اس لیے وہاں کے شہنشاہ کا محل بھی اس دور کے عظیم محلات میں سے ایک تھا۔ قیصران کو اس محل کو دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ لیکن کام کی اہمیت اور خیالات کے ہجوم نے قیصران کو اتنی مہلت نہ دی تھی کہ وہ اس نایاب اور نادر روزگار محل کی صناعیوں اور کاریگری کو اطمینان سے دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتا۔

شاہی محل پر جگہ جگہ پہرہ لگا تھا۔ بازنطینی سرداروں کو کئی جگہ رکنا پڑا۔ مگر دم کے دم میں پورے محل میں یہ بات پھیل گئی کہ ایک جوانِ رعنا سلطنت عثمانیہ کا سفیر بن کر قسطنطنیہ میں آیا ہے اور ملکہ عالیہ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ محل کی لونڈیاں، باندیاں، کنیزیں اور تمام ملازم ترک سفیر کو دیکھنے کے لیے روشوں، راہداریوں کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔ کنیزوں کا یہ عالم تھا کہ وہ خوب صورت سفیر کو دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔

قیصران نے قبول اسلام کے بعد چھوٹی سی مگر خوب صورت داڑھی رکھ لی تھی۔ ہلکی ہلکی نوک دار مونچھوں نے اس کے چہرے کے رعب کو بڑھا دیا تھا۔ جنہوں نے منگولوں کو دیکھا تھا ان کے خیال میں ترک بھی منگولوں کی طرح بے ڈول اور بھیانک چہروں کے مالک ہوں گے۔ لیکن قیصران کو دیکھنے کے بعد انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ ان میں اور ترکوں میں صورت وشکل کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ اگر قیصران کی داڑھی کو نظر انداز کیا جاتا تو وہ بالکل نصرانی نظر آتا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ واقعی حقیقت میں نصرانی اور اسی شہر کا خاص باشندہ تھا۔

پتا نہیں قیصران کو کس کس نے دیکھا۔ لونڈیوں اور کنیزوں کا تو دیکھنے والوں میں میلہ سا لگ گیا تھا۔

پھر جب قیصران کو بازنطینی سردار اپنے ساتھ ایک آراستہ وپیراستہ کمرے میں لے گئے تب بھی قیصران کو دیکھنے آنے والوں کا تانتا سا بندھا رہا۔ قیصران نئے دلہا کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اگرچہ دلہا نہ تھا مگر مردانہ حسن ووجاہت کا پیکر ضرور تھا۔

اس دوران قیصران کو مطلع کیا گیا کہ ملکہ اپنا اس سے کل ملاقات کریں گی۔ ادھر قیصران اپنا گھر اور محلہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھا مگر اب مجبوری تھی۔ وہ ملکہ سے ملے بغیر اور شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت حاصل کیے بغیر محل سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے اسے صبر کرنا پڑا۔ یا یوں کہیے کہ سینہ پر صبر کا پتھر رکھنا پڑا۔

اسی وقت محلات شاہی کا داروغہ حاضر ہوا اور اس نے ادب سے عرض کیا۔

”اے عالی مرتبت شاہی مہمان! مہمان خانہ میں تشریف لے چلیے۔“

قیصران کنیزوں کی تاک جھانک سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے داروغہ کی دعوت کو پزیرائی بخشی اور اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ اگرچہ داروغہ محلات کے ساتھ جا رہا تھا مگر کنیزیں تھیں کہ اس کے اوپر ٹوٹی پڑتی

تھیں۔ چنانچہ قیصران، کنیزوں کی بے تابی کا لطف اٹھاتا ہوا شاہی مہمان خانہ میں پہنچا۔ مہمان خانہ دیکھ کر قیصران کا دماغ گھوم گیا۔ ایسا سجا اور آراستہ و پیراستہ کمرہ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فرش، دیواریں اور چھتیں ایسی کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ دنیا جہان کے نوادرات سے مہمان خانہ کو مزین کیا گیا تھا۔

قیصران کو تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر داروغہ بضد ہوا اور اس نے انتہائی خوشدلانہ انداز میں التجا کی۔

''اے معزز مہمان۔ شاہی حکم کے مطابق آپ کی دل بستگی کے لیے رقص و موسیقی کا تھوڑا سا انتظام کیا گیا ہے۔ آپ اجازت دیجیے تاکہ رقاصائیں اور مغنیاں حاضر ہو کر مہمان کی دل بستگی کا سامان کریں اور آپ کی تھکن دور ہو سکے۔''

قیصران کو رقص و موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے اس نے ہنگامہ ''ہاؤ و ہو'' کے بجائے داروغہ سے تنہائی کی درخواست کی۔ داروغہ نے مہمان کے حکم کے مطابق رقص و موسیقی کا پروگرام ختم کر دیا اور ذرا دیر میں کمرے میں سناٹا چھا گیا اور مہمان گاؤ تکیوں کے سہارے آرام کرنے لیٹ گیا۔

دراصل ملکہ نے حکم دیا تھا کہ مہمان کی تھکن دور کرنے کے لیے رقص و موسیقی کا دور ہو۔ پھر جام چھلکیں اور شراب و شباب کی محفل برپا ہو۔ یہ سب کچھ ملکہ کے حکم پر کیا جا رہا تھا تاکہ مہمان خوش ہو اور ملکہ کی عظمت کا اعتراف کر لے۔ مگر قیصران نے محفل ہاؤ ہو اور شراب و کباب سے انکار کر کے ملکہ کو پہلے ہی قدم پر شکست دے دی تھی۔ ملکہ بڑی جہاں دیدہ اور عیار عورت تھی۔ وہ قیصران کے انکار سے دل برداشتہ نہیں ہوئی اور دوسرے حملہ کے طور پر اُس نے یورپ کی اعلیٰ ترین مہنگی شراب گنگا جمنی صراحیوں میں بھروا کر یونان کی حسین و جمیل کنیزوں کے ہاتھ مہمان کے لیے بھجوائی۔

قیصران، ملکہ کے ان پے در پے حملوں سے قدرے گھبرا گیا۔ اس نے شراب و کباب اور محفل رقص و موسیقی سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ اب جو کنیزیں ساغر و مینا کے ساتھ مستانہ وار مہمان خانے میں داخل ہوئیں تو قیصران گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ حسن بے باک کے اس چمکتے دمکتے نظارے سے اس کا دماغ گھوم رہا تھا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے اس حسن بے باک کی اٹھکھیلیوں سے بھی نظریں چرا لیں اور داروغہ سے بڑی عاجزی کے ساتھ تنہائی اور قطعی تنہائی کی درخواست کی۔ یہاں تک کہ داروغہ کو مجبور ہونا پڑا۔ اس نے مہمان خانہ کو فوراً خالی کرنے کا حکم دیا اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ معزز مہمان کی طبیعت مکدر ہے۔ اس لیے انہیں تنگ نہ کیا جائے۔

داروغہ محلات نے احتیاط کے طور پر دو حبشی غلاموں کا مہمان خانہ پر پہرہ لگا دیا اور سخت تاکید کی کہ کوئی کنیز مہمان خانہ میں نہ جانے پائے۔ کیونکہ قیصران نے داروغہ محلات سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر اسے شراب و کباب میں زبردستی الجھایا گیا تو وہ اس کی شکایت ملکہ سے کر دے گا۔ کیونکہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان اس قسم کی باتوں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب میں شراب حرام ہے اس لیے وہ یہ گناہ کرنے پر آمادہ نہیں۔

قیصران کو تنہائی میسر آ گئی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک تو اس کا وطن، دوسرے اس کے محبوب کا دیار۔ کھلے ہوئے دریچے سے آنے والا ہر جھونکا اس کے دل میں جوزیفائن کی یاد کو اور بھڑکا دیتا۔ کیونکہ وہ اس کے دل کی ملکہ اور منگیتر بھی تھی۔ بروصہ میں محبت کی چنگاری دبی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آ کر وہ چنگاری شعلہ بن کر اسے جلا رہی تھی۔

جوزیفائن کے خیالوں میں گم قیصران نہ جانے کب خواب کی نرم و نازک گود میں پہنچ گیا۔ مگر جوزیفائن نے خواب کی دنیا میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک پرفضا باغ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ سامنے قوس قزح کے رنگوں کی ایک بارہ دری ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جوزیفائن اس بارہ دری سے نکلی اور نازک نازک قدم اٹھاتی اس کی طرف آ رہی ہے۔ جوزیفائن کو دیکھ کر قیصران بے تاب ہو گیا اور جلدی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ سنگ مرمر کی نہر کے کنارے دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو گئے اور قیصران نے ''میری جوزیفائن'' کہہ کر اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

''ہوش میں آؤ قیصران! ہوش میں آؤ۔''

قیصران کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب میں اس کے سینے سے لپٹی ہوئی جوزیفائن اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''ہوش میں آؤ قیصران...... مجھے پہچانو...... میں ہوں تمہاری جوزیفائن۔ تمہاری جوزی۔''

قیصران کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیے۔ آنکھیں ملیں۔ دانتوں میں انگلی دبا کر زور سے کاٹی مگر جوزیفائن اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔ قیصران کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ اس نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جوزیفائن...... کیا واقعی تم جوزی ہو؟''

جوزیفائن مسکرا کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ آخر قیصران کو یقین کرنا پڑا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب قیصران نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔

پکار ارضِ فلسطین

کیا بتاؤں اے سوئے مسلمان تجھے
کیسے کیسے یہاں میں نے صدمے سہے
میری کلیوں میں غنچوں کو روندا گیا
کتنی پاکیزہ کلیوں کو مسلا گیا
بوڑھی ماؤں کے بے جرم بیٹے مرے
باحیا بیٹیوں کے دوپٹے کھینچے
بھائی کے سامنے بہن روتی رہی
پر حمیت مسلماں کی سوتی رہی
میں تڑپتی، بلکتی، سسکتی رہی
کیسے لہو جی کی راہ تکتی رہی
دستِ ظالم میں میں روز بکتی رہی
میری گردن آئے روز کٹتی رہی
کبھی دشمن مری جاں کے فاتق ہوئے
کبھی لالچ میں اپنے منافق ہوئے
پوچھتی ہوں مسلماں بتا کس لیے
بے خطا ہوں تو پھر یہ سزا کس لیے
سینہ پھٹتا ہے اس پل مرا جوش میں
جب کوئی لاشہ آئے میری آغوش میں
مجھ پہ یلغارِ اغیار ہونے لگی
رو رو بینائی بھی میری کھونے لگی
کیا ہوا تیرے جذبۂ ایمان کو
کیوں محمدؐ کے بھولے ہو فرمان کو
لے مرے کفر کے کیوں نظارے تمہیں
اٹھو بیت المقدس پکارے تمہیں
چھوڑ دو اہلِ مغرب کی تقلید کو
دل سے جانے نہ دو روحِ توحید کو
دشمنوں سے کہاں کی بھلا دوستی
ہو جری پھر بھی افسوس کم ہمتی؟
ہاں سسکتے لبوں کی دعائیں بنو
بنتِ حوا کے سر کی ردائیں بنو
عمل کا وقت ہے گفتگو چھوڑ دو
ضربِ حق سے بُتِ کفر کو توڑ دو
خوں سے آ کاش مدت سے رنگین ہوں
ہاں میں لاچار ارضِ فلسطین ہوں

(سیدہ آکاش بخاری...... نیو سینٹرل جیل ملتان)

"جوزی! تم یہاں کیسے آگئیں؟ یہ تو شاہی مہمان خانہ ہے۔ پہرے داروں کو خبر ہوگئی تو غضب ہو جائے گا۔"

جوزیفائن نے قیصران کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "گھبراؤ نہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اندر آسکے۔"

"لیکن تم......" قیصران کہتے کہتے رک گیا۔

"میں جوزیفائن ہوں۔ اور تمہاری آنکھوں کے سامنے بیٹھی ہوں۔ تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔" جوزیفائن نے اس کے شک کو دور کرنے کی کوشش کی۔

قیصران کو یقین تو آگیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ شاہی مہمان خانے کے اس کمرے میں جہاں ترکوں کا سفیر آرام کررہا ہے۔ وہاں جوزیفائن کیسے پہنچی؟ کیا سارے پہرے دار اندھے ہوگئے ہیں یا پھر جوزیفائن انسانی پیکر کے بجائے......

"اچھا تو میں جارہی ہوں۔ تم سوچتے رہو۔" جوزیفائن بستر سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔

قیصران کو جیسے ہوش آگیا۔ اس نے پھر سر کو ذرا سا جھٹکا دیا اور بولا۔ "اب مجھے بالکل یقین آگیا ہے جوزی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں تمہارا تصور لیے ہوئے سوگیا۔ خواب میں تم سے ملا اور اب وہ خواب حقیقت بن کر میرے سامنے ہے۔ لیکن مجھے تمہیں اس جگہ دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی ہے اتنی ہی حیرت بھی ہے۔"

جوزیفائن مسکرائی اور بجلیاں گراتی ہوئی بولی۔ "تمہاری یہ حیرت بھی دور ہوجائے گی مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیسرین سے "قیصران" کس طرح بن گئے؟"

قیصران نے ادھر ادھر دیکھ کر جوزیفائن کو اپنے سے اور قریب کرلیا اور جواب دینے کی بجائے خود اس سے سوال کیا۔

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میرے آنے کی خبر کیسے ہوئی اور تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

جوزیفائن نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر اپنا سر قیصران کے سینے سے لگادیا۔ جوزیفائن کو افسردہ دیکھ کر قیصران بھی افسردہ ہوگیا اور اس نے کہا۔

"جوزی! اب نہ گھبراؤ۔ اب ہم مل گئے ہیں تو کبھی جدا نہ ہوں گے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔"

"یہ اتنا آسان نہیں قیصران۔" جوزی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "تم سلطان ترکی کے سفیر ہو اور میں قسطنطین کے ولی عہد شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر جوزیفائن ہوں۔"

"شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر؟" قیصران نے دہرایا اور سوالیہ نظروں سے جوزیفائن کو دیکھنے لگا۔

جوزیفائن نے قیصران کے سینے سے سر اٹھایا اور آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "قیصران! پہلے تمہیں اپنی مختصر کہانی سنادوں تاکہ تمہاری حیرانی دور ہوجائے اور تم اطمینان سے باتیں کرسکو۔"

قیصران گھبرا کے بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ کہانی سناتے سناتے تمہارے جانے کا وقت ہوجائے اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔"

جوزیفائن بولی۔ "اس کی فکر نہ کرو۔ جب تک تم کہو گے۔ میں تمہارے پاس رہوں گی۔ ہاں تو میں نے کہا تھا کہ میں شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر ہوں اور شاہی محل میں میرا مرتبہ ملکہ اینا کے برابر ہے۔"

قیصران کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ حیران حیران نظروں سے جوزیفائن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے الجھتے ہوئے کہا۔ "مگر تم شاہی محل میں پہنچی کس طرح؟"

اور جوزیفائن نے اپنی کہانی شروع کی۔ اس نے بتایا۔

نائیسا کی جنگ میں خالو اور ابا کے مارے جانے کی خبر ہمیں ایک سپاہی کے ذریعہ ملی جو اس جنگ میں زخمی ہوکر یہاں آگیا تھا۔ ہماری اور دوسرے لوگوں کی گرفتاری کی خبر بھی ہمیں اسی شخص نے سنائی تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ عثمانی لشکر جس علاقے کو فتح کرتا ہے۔ وہاں بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو معاف کر دیتا ہے مگر جوانوں کو نہیں بخشتا۔ ان کا سر قلم کردیا جاتا ہے۔ اس لیے ممی نے ابا کے ساتھ تمہیں بھی رو دھو کر صبر کرلیا تھا۔ مگر میرا دل اندر سے کہتا تھا کہ تم زندہ ہو اور ایک بار ہم ضرور ملیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی قیصران نے "جوزی" کے نام کا ایک گھٹا گھٹا نعرہ لگایا اور جوزیفائن کو پھر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ پھر دیر تک وہ دونوں سسکیاں بھرتے اور آنسو بہاتے رہے۔ جب آنسو بہانے سے دل کا غبار کچھ چھٹا تو جوزی نے کہا۔

"ممی پہلے ہی کمزور تھیں۔ اس دہرے غم نے انہیں بستر سے لگادیا۔ پھر انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اس دنیا میں میں اکیلی تھی۔ سر پر ہاتھ رکھنے والا یا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔"

جوزیفائن کے پھر آنسو بہنا شروع ہوگئے۔ قیصران کا بھی جوزی جیسا ہی حال تھا اور وہ بھی اس کے ساتھ چپکے چپکے آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے جوزیفائن کو تسلیاں اور دلاسے دے دے کر خاموش کرایا۔

جوزیفائن کا دل جب ذرا ٹھہرا تو اس نے بتایا۔

"تمہیں یاد ہوگا کہ ہمارے گھر کے برابر کھلونوں کی ایک دکان تھی۔ وہ لڑکوں کے لیے چھوٹی توپیں اور لکڑی کے گھوڑے بناتا تھا۔ بوڑھے دکان دار کو میرا حال معلوم تھا اس نے مجھ پر ترس کھا کر اپنی دکان پر بٹھا لیا۔ اور اب میں اس کی بیٹی تھی۔ مجھے کھانے، پینے اور کپڑے لتے کی کوئی فکر نہ تھی۔ میں دن بھر اس کے کھلونے بیچتی تھی اور رات کو اسی گھر میں ایک کوٹھری میں پڑی رہتی تھی اور پھر...... ایک دن خداوند یسوع مسیح نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں کھلونوں کی دکان سے ایک دم شاہی محل پہنچ گئی......"

اسی وقت دروازے پر تین بار دستک ہوئی۔ جوزیفائن جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئی اور دروازے کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کیا بات ہے آمرینہ...... اندر آجاؤ۔"

دروازہ کھلا اور آمرینہ اندر آئی۔ دروازہ بند کیا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی جوزیفائن کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ جوزیفائن نے چڑ کر پوچھا۔

"کیا قیامت آگئی؟ ہماری تقدیر میں ایک لمحہ کا بھی سکون نہیں؟"

جوزیفائن کا انداز اس وقت کسی ملکہ یا شہزادی جیسا تھا۔ وہ جوزیفائن جو چند لمحے پہلے قیصران کے سینے سے لگی آنسو بہا رہی تھی وہ اس وقت ایک باوقار شہزادی کی طرح بول رہی تھی۔

آمرینہ جو قرینے سے کنیز معلوم ہوتی تھی وہ ذرا اور خم ہوگئی پھر ادب سے بولی۔

"گرانڈ سسٹر! ملکہ اینا کی خواب گاہ کے تمام فانوس ایک ساتھ روشن ہوگئے ہیں۔ داروغہ محلات نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے آپ کو اطلاع دینے کا حکم دیا ہے۔"

جوزیفائن کچھ سوچنے لگی پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"داروغہ سے کہو فکر نہ کرے۔ ملکہ نے آج پھر کوئی نیا شکار پھانسا ہوگا۔"

"شکار......؟" قیصران کی زبان سے خود بخود نکل گیا۔

جوزیفائن نے مسکرا کر قیصران کو دیکھا اور پھر

آمرینہ کی طرف۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے سامنے سوال نہ کیا جائے۔

آمرینہ واپس ہونے لگی تو جوزیفائن نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''اور داروغہ سے یہ بھی کہنا کہ اگر ملکہ واقعی اس طرف آرہی ہے تو اس کا راستہ نہ روکا جائے۔ ہم خود جواب دے لیں گے؟''

آمرینہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر دروازہ بند کر کے واپس ہوگئی۔

قیصران فکر مند ہوگیا تھا۔ اس نے آمرینہ کے جاتے ہی کہا۔ ''جوزیفائن! یہ کچھ اچھا نہ ہوا۔ اگر ملکہ یہاں آگئی تو ہماری محبت کا راز فاش ہو جائے گا۔''

جوزیفائن نے اس کے گلے میں اپنی جگمگاتی ہوئی بانہیں ڈال دیں اور بولی۔ ''قیصران! میں جانتی ہوں کہ ملکہ یہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ میں اس کے ہر راز سے واقف ہوں۔ وہ ہی کیا۔ میں تو سلطنت کے رازوں سے بھی واقف ہوں۔ اگر میں زبان کھول دوں تو قیامت آجائے اور خون کی ندیاں بہہ جائیں۔''

قیصران کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا۔ ''جوزیفائن! ملکہ اپنا آخر ملکہ ہے۔ فوج اس کا حکم مانتی ہے۔ تبھی تو وہ کنتا کوزین جیسے دشمن سے جنگ کر رہی ہے۔''

جوزیفائن نے قیصران کو بستر پر بٹھا دیا اور خود اس کے برابر مسہری پر ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''قیصران! تم نہیں جانتے ملکہ اور کنتا کوزین دونوں اندر سے ایک ہیں۔ ان کی رنگین راتوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ کوزین اگر آج بھی آجائے تو ملکہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے۔ مگر وہ ضدی ہے۔''

''پھر دونوں میں اختلاف کیوں ہوا؟'' قیصران نے سوال کیا۔

اور جوزیفائن نے بتانا شروع کیا۔

''تخت و تاج کی ہوس بری ہوتی ہے قیصران۔ ملکہ نے اپنا سب کچھ کوزین کے حوالے کر دیا لیکن تخت و تاج اس کے اختیار میں نہ تھا۔ شہزادے کے ہوتے ہوئے کوزین شہنشاہ نہیں بن سکتا تھا۔ ممکن تھا ملکہ اپنی ہوس پر بیٹے کو بھی قربان کر دیتی لیکن......''

اور جوزیفائن نے خاموش ہو کر بڑے پیار سے قیصران کو دیکھا۔

قیصران کے سامنے محل اور سلطنت کے راز خود بخود کھلتے جا رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے جوزیفائن کی باتیں سن رہا تھا۔ جوزیفائن نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر پھر تین بار دستک ہوئی۔ اس دفعہ جوزیفائن بھی پریشان ہو گئی۔ اس نے فکر مند نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ آمرینہ۔''

آمرینہ اندر آگئی۔

''کیا ملکہ ادھر آرہی ہے؟'' جوزیفائن نے پوچھا۔

''نہیں سسٹر! شہزادہ پلیوگس جاگ اٹھے ہیں اور آپ کا پوچھ رہے ہیں۔'' آمرینہ نے بتایا۔

شہزادے کا نام سن کر جوزیفائن کھڑی ہوگئی۔ اس نے آمرینہ کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر قیصران سے کہا۔

''پیارے قیصران۔'' وہ کہتے ہوئے جوزیفائن شدت جذبات سے قیصران سے لپٹ گئی۔ قیصران قریب ہی کھڑا تھا۔ جوزیفائن جواب نہ پا کر بولی۔

''مجھے اس جہنم سے نکالو قیصران...... مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔''

(باقی آئندہ)

ضدی فرشتہ

ابو ضیاء اقبال

کسی شاعر نے کہا ہے ''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ'' بعض لوگوں کی نظروں میں تو یہ صرف ایک مصرعہ ہی تھا لیکن وہ ایک ایسا پولیس افسر تھا جو نظر آنے والے کواکب کی تہ میں جھانکنے کا عادی تھا۔ ڈکیتی اور قتل کے ایک کیس کی روداد جس کے ملزم نہ صرف پکڑے گئے تھے۔ بلکہ جیوری انہیں سزا بھی سنا چکی تھی لیکن اس کے باوجود تفتیشی افسر اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔

جرم وسزا کے موضوع پر ایک دلچسپ کہانی

کوچرن اور رینالڈ موقع واردات پر پہنچے تو ان کے سامنے چار چیزیں تھیں۔ ایک درمیانہ عمر کے معزز دوا فروش کی لاش۔ روتی بلکتی ہوئی دلکش اور خوش شکل بیوہ۔ کھلا ہوا کیش بکس اور اپنی اپنی بولی بولتا ہوا مجمع۔ پولیس افسروں کے لیے یہ نئی باتیں نہیں تھیں۔ ڈکیتی کی وارداتوں میں عموماً یہی ہوتا ہے۔

اسٹور میں موجود ہر فرد واردات کا حال بیان کرنے کے لیے بے تاب تھا اور اپنے طور پر پولیس کی مدد کر کے اپنے آپ کو قانون پسند شہری ہونے کا فرض ادا کرنے پر مصر تھا لیکن دوران گفتگو دونوں پولیس افسروں کو صرف چار افراد کی گواہی مصدقہ اور معتبر نظر آرہی تھی۔ دوسرے لوگ اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ قابل توجہ گواہوں میں ایک بیوہ مسز کارل ساویئر تھی' دوسری ایک نوجوان' کم رو لڑکی ایلین مورسین تھی اور ایک درمیانہ عمر کا جوڑا تھا۔

جس وقت قاتل اسٹور میں داخل ہوا تو مسز کارل کاؤنٹر سے کچھ فاصلے پر بیٹھی میگزین پڑھ رہی تھی۔ اس نے آنے والے ہر شخص پر ایک نظر ڈالی اور نگاہیں میگزین پر مرکوز کر لی تھیں۔ وہ اس کا مکمل حلیہ نہیں بتا سکتی تھی اور کوچرن کے سوالوں کے جواب میں مسلسل رو رہی تھی۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ ہچکیوں کے درمیان منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ وہ بمشکل بتا سکی تھی کہ قاتل ننگے سر تھا اور اس کے بال سنہرے تھے۔ قد لمبا اور جسم تناسب تھا۔ وہ کاؤنٹر پر کارل کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اس نے قاتل کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا کیونکہ درمیان میں کارل کی پشت تھی تاہم وہ اسے بالوں اور چوکھٹے کے باعث پہچان سکتی تھی۔

گولیوں کی آواز سن کر وہ ہڑبڑائی اور قاتل کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر شوہر کی طرف لپکی جو کاؤنٹر پر اوندھا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہی۔

کوچرن اور رینالڈ اسٹور میں داخل ہوئے تب بھی وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اسٹور اس کے ہذیانی بین سے گونج رہا تھا وہ بمشکل اسے خاموش کرا سکا۔

ایلین کے بیان کے مطابق وہ اسٹور میں دوا لینے کے لیے داخل ہوئی تو ایک شخص دروازے کی طرف پشت کیے کاؤنٹر پر کارل کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ وہ سمجھی دونوں دوست ہیں اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ کارل کے ہاتھ کے پاس کیش بکس رکھا ہوا تھا۔ اس شخص کی پشت دروازے کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ نہیں

کہہ سکتی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا یا نہیں۔
معاً اس نے ایک ہاتھ کیش بکس پر مارا اور دوسرے ہاتھ سے کارل پر دو گولیاں چلائیں اگلے لمحے وہ ایلن کے قریب سے گزرتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑا اور باہر نکل گیا۔ وہ سکتے میں رہ گئی تھی۔ اسے اپنے کان بند محسوس ہوئے اور آنکھوں کے سامنے غبار سا چھا گیا۔ مسز کارل کی چیخ اسے اپنے حواس میں لے آئی اور کاؤنٹر کی طرف لپکی۔ کارل اوندھا ہو گیا تھا اور مسز کارل اس پر جھکی چیخیں مار رہی تھی۔
ایلن نے ہرچند کہ قاتل کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ تاہم وہ اس کا حلیہ بیان کر سکتی تھی۔ اس کی عمر تیئس سال سے کم لگتی تھی۔ جسم چھریرا اور پھرتیلا تھا۔ چہرہ قدرے دبلا تھا۔ بال سنہرے تھے اور قد ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ پتلون اور غالباً گہرے بادامی رنگ کی اسپورٹ جیکٹ پہن رکھی تھی، وہ وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایلن پر بھی یہ بتاتے ہوئے ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اس کے خیال میں قاتل نے اس کی آہٹ سن لی تھی۔
گواہ جوڑے نے قاتل کو دور سے دیکھا تھا اور اس کا صحیح حلیہ نہ بتا سکتے تھے، سوائے اس کے کہ وہ ننگے سر تھا۔ شوہر کا خیال تھا کہ اس نے گہرا براؤن سوٹ پہن رکھا تھا اور بیوی کے خیال میں اس کے جسم پر گہری براؤن جیکٹ تھی۔ وہ اسٹور سے دوڑتا ہوا نکلا اور تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہوئی کار میں جا بیٹھا تھا۔ البتہ انہیں کار کو سرسری طور پر دیکھنے کی مہلت مل گئی تھی۔ وہ سیاہی مائل نیلی یا سیاہ سیڈان تھی۔ اس کا دایاں مڈگارڈ پچکا ہوا تھا، ان کے اور ایلن کے بیان میں صرف دو باتیں مشترکہ تھیں کہ قاتل ننگے سر اور پھرتیلا تھا اور اس کے بال سنہرے تھے۔
کار کی شناخت اور قتل کے گواہوں کے قدرے ملتے جلتے بیانات سے کوچرن اور رینالڈ کے ہاتھ خاصا مواد آ گیا تھا۔ ایک سیاہ یا سیاہی مائل نیلی سیڈان کا مالک جس کا دایاں مڈگارڈ پچکا ہوا تھا۔ سنہرے بالوں والا پھرتیلا جواں سال آدمی اور لباس ان بنیادوں پر وہ تفتیش کا کام شروع کر سکتے تھے۔
انہیں یقین کی حد تک شبہ تھا کہ قاتل پیشہ ور ڈکیت ہوگا ہرچند کہ مسز کارل بتا نہ سکتی تھی کہ کیش بکس میں کتنے نوٹ تھے اور قاتل جلدی میں ان میں سے کتنے لے جا سکا تھا۔ بقول ایلن شاید اس نے پیچھے آہٹ سن لی تھی کیونکہ ایلن نے اونچی ہیل کے سینڈل پہن رکھے تھے۔
پولیس اسٹیشن جا کر انہوں نے ریکارڈ سے سزا یافتہ مجرموں اور مشتبہ افراد کی تصویریں سامنے رکھ کر تفتیش شروع کر دی۔ ان میں سے چار ایلن اور شوہر بیوی کے بتائے حلیے سے مطابقت رکھتے تھے انہوں نے ان چاروں کو شامل تفتیش کر لیا۔ واردات کے دو روز بعد انہوں نے مسز کارل کو چاروں آدمیوں کی تصویریں دکھائیں اور اس نے ہذیانی کیفیت سے ان میں سے ایک کو شناخت کر لیا۔
گواہ جوڑے نے بے جھجک مسز کارل سے اتفاق رائے کر لیا لیکن ایلن قدرے متذبذب تھی۔ اس نے بڑی ہچکچاہٹ سے ملزم کی شناخت کی۔ کوچرن اور رینالڈ نے اس بات کو محسوس کیا کیوں کہ ان کی نظر میں سب سے مصدقہ گواہی اس کی تھی۔ اس نے زیادہ دیر تک اور قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ محل نظر تھی لیکن دوسرے شواہد ملزم کے خلاف جاتے تھے اس لیے انہوں نے اسے گرفتار کر لیا۔
جونی پلیکا چھریرے جسم کا سنہرے بالوں والا ایک نوجوان ٹرک ڈرائیور تھا، وہ اٹھائیس انتیس کے پیٹے میں تھا اور پولیس میں اس کا ریکارڈ کھل گیا تھا۔

ایک بار اس نے معمولی بات پر ایک ٹیکسی ڈرائیور سے مار پیٹ کر کے اس کی دن بھر کی کمائی چھین لی تھی۔ دوسری مرتبہ ایک بار کے مالک پر چاقو نکال لیا تھا لیکن لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ پہلے جرم پر اسے ایک ہفتے کی سزائے قید ہوئی کیونکہ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے چھینی رقم واپس کر دی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ ڈرائیور نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ بار کے مالک پر چاقو نکالنے پر اسے بیس ڈالر جرمانہ ادا کرنا اور نیک چلنی کا وعدہ کرنا پڑا تھا۔
جونی اپنے بہنوئی کے ساتھ رہتا تھا۔ جس کے پاس سیاہ رنگ کی پرانی سیڈان کار تھی۔ واردات کی شام کو اس نے کار بہنوئی سے مانگ لی تھی اور آدھی رات کے بعد گھر لوٹا تھا۔ کارل کا قتل چھ اور سات بجے کے درمیان ہوا تھا۔ کوچرن اور رینالڈ نے کار دیکھی تو اس کا دایاں مڈگارڈ پچکا ہوا نہیں تھا۔ تاہم اسے ٹھیک کرانے میں ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا ہوگا۔ ان دونوں کا بھی یہی خیال تھا۔
جونی نے آدھی رات تک گھر سے باہر رہنے کی یہ وجہ بتائی کہ وہ کار میں اپنی گرل فرینڈ کو لیے گھومتا رہا۔ اس کی گرل فرینڈ نے تصدیق کی لیکن اس کا بیان قابل قبول نہیں ٹھہرایا گیا اور جونی کے خلاف عدالت میں چالان پیش کر دیا گیا۔ گواہ وہی چار تھے۔ مسز کارل نے بے تامل اس کی نشاندہی کر دی۔ شوہر بیوی نے بھی اس کی تائید کی البتہ ایلن نے اسی ہچکچاہٹ اور تامل سے مجرم کو شناخت کیا جس کا اظہار وہ پہلے کر چکی تھی اور یہ بات کوچرن کے دماغ سے چپک گئی تھی تاہم وہ خاموش رہا۔
جیوری نے مجرم کے خلاف فیصلہ دے دیا اور جج نے اس فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے جونی کو سزائے موت سنا دی۔ کوچرن اور رینالڈ عدالت سے نکلے تو دونوں گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے پولیس کار میں بیٹھ گئے۔ کوچرن ڈرائیو کر رہا تھا۔
”کیا سوچ رہے ہو؟“ رینالڈ کی آواز نے سوچ کی پنہائیوں میں غوطہ زن کوچرن کو چونکا دیا۔ وہ چند ثانیے تک ہونٹ چباتا رہا۔
”ایک بات میرے ذہن کو کھٹک رہی ہے۔ کارل کی بیوی نے جونی کو بہ غور اور قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پڑھ رہی تھی اور ان دونوں کے درمیان میں اس کا شوہر تھا۔ اس کے باوجود اس نے جونی کی نشاندہی کر دی۔ ایلن کو جونی کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ اس کے قریب سے بھی گزرا تھا لیکن وہ پہلے بھی اور کورٹ میں بھی اس کی نشاندہی کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ کیوں؟“
”یقین کرو یہی خیال مجھے بھی ستا رہا ہے۔“ رینالڈ نے کہا۔ ”بالوں کے بارے میں چاروں کی ایک رائے ہے۔ مجرم کے لباس اور اس کی پھرتی کے بارے میں اس جوڑے اور ایلن میں اختلاف رائے نہیں تھا پھر اس نے بے دھڑک جونی کی نشاندہی کیوں نہیں کی؟ وہ نروس کس لیے تھی؟“
”میک!“ کوچرن نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔ ”جیسی کہ صورت حال تھی اس میں مسز کارل، اس مرد اور عورت کی گواہی کو زیادہ پختہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ صرف اس لڑکی کے بیان پر زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سڑک پر نگاہیں جمائے رہا۔
”نہیں کوچی! ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ رینالڈ اس کی بات کا مفہوم پا گیا۔ ”کار بھی برآمد ہو گئی اور جونی کوئی تسلی بخش جواب بھی نہیں دے سکا کہ کار نصف رات تک اس کے پاس کیوں رہی۔ اس کی گرل فرینڈ کا تو یہی کہنا تھا کہ وہ اس کے

ساتھ تھا۔ جونی کسی دوسرے فرد کو پیش نہ کر سکا جس نے اسے ان اوقات میں دیکھا ہو۔ میں تو ایلن کے بارے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ جونی کو بچانے کی کوشش کیوں کر رہی تھی؟"

"تمہارا ذہن کسی اور طرف چلا گیا ہے۔" کوچرن نے کہا۔ "لیکن میں ایلن کی بے یقینی کو کسی اور بات کے تناظر میں دیکھ رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ واردات کے وقت حواس باختہ ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن مجرم کو مکمل طور گرفت میں نہ لے سکا تھا۔ بعد میں اس کا ذہن صاف ہوا تو وہ تذبذب میں پڑ گئی کہ اس نے مجرم کی شناخت صحیح کر لی تھی یا نہیں۔"

رینالڈ نے جواب نہیں دیا اور باقی راستہ انہوں نے اپنی اپنی بھول بھلیوں میں کاٹا۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر ان کے کام مختلف ہو گئے۔

جونی کو سزا ہوئے چھٹا روز تھا۔ رینالڈ اور کوچرن اپنے اپنے ڈیسک پر بیٹھے کام کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رینالڈ نے ریسیور اٹھایا اور سنتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا۔

"کوچی!" اس نے کہا۔ "ایلن موریسن کا فون تھا۔ وہ سخت اضطراب میں تھی۔ کہنے لگی کہ جونی وہ قاتل نہیں تھا وہ پورے وثوق سے کہہ رہی ہے۔ اٹھو! چلو میرے ساتھ۔"

کوچرن نے فائل زور سے بند کی اور کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے پولیس کیپ سر پر رکھی اور آفس سے نکلے۔ وہ کار میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

ایلن کے اپارٹمنٹ میں ڈسٹرکٹ اٹارنی کے اسٹاف کا ایک درمیانی عمر کا آدمی ولسن بھی تھا۔ اسے دیکھ کر کوچرن اور رینالڈ کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں کہ ایلن نے اسے کیوں بلا لیا تھا۔

"مس موریسن کہہ رہی ہے کہ کل رات اس نے تھرڈ ایونیو کے ایک کیفے کے باہر اس شخص کو دیکھا۔ جو اس کے خیال میں کارل ساوئیر کا اصل قاتل ہے۔" ولسن نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "اسے پورا یقین ہے کہ وہی تھا کیوں کہ اس کے کھڑے رہنے کا انداز وہی تھا جو کارل کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک آدمی سے اس انداز میں ہاتھ ہلا کر بات کر رہا تھا جس طرح کہ قاتل کر رہا تھا۔ مس موریسن ایک پولیس مین کو بلا لائی لیکن وہ جا چکا تھا۔"

"اس کے بال......" کوچرن نے بے چینی سے کہنا چاہا۔

"جونی جیسے ہی سنہرے تھے۔" ایلن نے مرتعش آواز میں اس کی قطع کلامی کی۔

کوچرن اور رینالڈ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' جیسے چاہتے ہوں کہ دوسرا کوئی بات کرے لیکن پہل ولسن نے کی۔

"بالکل بچکانہ سی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "مس موریسن نے ایک آدمی کو دیکھا جس کے کھڑے ہونے اور بات کرتے ہوئے ہاتھ ہلانے کا انداز جونی جیسا تھا۔ اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔ بے شمار لوگ ایک ہی انداز میں بولتے اور حرکت کرتے ہیں۔"

"ایک بات اس کیس میں ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔" کوچرن نے آہستہ سے کہا۔ "ہمیں آلۂ قتل......ریوالور نہیں مل سکا تھا۔"

"اسے کورٹ میں پیش نہ کرنا پولیس کی کوتاہی تھی اور طلب نہ کرنا کورٹ کی۔" ولسن نے شانے اچکا کر کہا۔ "بہر حال مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں یہی بات مس موریسن کو سمجھا رہا تھا۔"

"مجرم کو سزائے موت سنا دی گئی ہے لیکن ابھی اسے گیس چیمبر میں بھیجا نہیں گیا ہے۔" ایلن نے بھویں سکوڑ کر کہا۔

رینالڈ پھٹ پڑا۔ "اگر کسی بے قصور کو سزا ہو گئی ہے تو اس کے ذمے دار میں اور کوچرن ہیں۔ ہم نے آلۂ قتل حاصل نہ کر کے اپنا فرض ادا نہیں کیا لیکن حد ہے کہ کورٹ نے بھی طلب نہیں کیا۔"

"غلطی میری بھی تھی۔" ایلن آہستہ سے بولی۔ "میں نے ماؤف ذہن سے غلط آدمی کی شناخت کی۔ جب میں پوری طرح اپنے حواس میں آئی تو احساس ہوا کہ جس شخص کو میں نے اسٹور میں دیکھا تھا وہ اس آدمی سے قد میں تھوڑا سا لمبا تھا۔ جسے گرفتار کیا گیا ہے اس کا چہرہ بھی اتنا دبلا نہیں تھا جیسا کہ میں نے سمجھا تھا۔ کیفے سے باہر میں نے جس شخص کو دیکھا ہے وہی اسٹور میں تھا اور کارل کا قاتل وہی تھا۔"

"مسز کارل......" ولسن نے کہنا چاہا۔

کوچرن درمیان میں بول پڑا۔ "وہ تو قطعی اپنے حواس میں نہیں تھی۔ میں نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں جو ہسٹیریائی کیفیت میں غلط آدمی کی نشان دہی کر بیٹھتی ہیں جہاں تک اس جوڑے کا تعلق ہے تو ایسے لوگ عموماً مقتول کے لواحقین سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں موقع واردات پر موجود لوگ زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔"

"اس صورت میں ڈسٹرکٹ اٹارنی تم دونوں کو معاف نہیں کرے گا۔" ولسن نے کہا۔ "اس بحران سے نکلنے کا ایک ہی حل ہے کہ مس موریسن کو ایک بار پھر جونی کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع دیا جائے تا کہ یہ اس کا موازنہ اس شخص سے کرے جسے اس نے کیفے سے باہر دیکھا ہے۔"

کوچرن اور رینالڈ نے اس بات سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ اگلے روز ایلن کو صبح آٹھ بجے جیل لے جایا جائے۔ وہ چھپ کر جونی کو غور سے دیکھے گی کہ اس کے کھڑے ہونے کا انداز کیسا ہے اور وہ بات کرتے ہوئے ہاتھ کس طرح ہلاتا ہے۔

دوسرے دن کوچرن اور ایلن ڈسٹرکٹ اٹارنی کا اجازت نامہ لے کر جیل پہنچ گئے اور وہاں کیپٹن مونی کو کوچرن نے اجازت نامہ دکھا کر ساری بات بتائی۔ اس نے کہا کہ وہ جونی کو ملاقات کے کمرے میں لے آئے گا جہاں کوچرن موجود ہوگا۔ ایلن ایک کھڑکی سے اندر کا منظر دیکھ سکے گی۔ کوچرن اس کے ساتھ ملاقات کے کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری کرسی مونی نے ہٹا دی تا کہ جونی کھڑا رہے۔

"یہ جیل کے رولز کے خلاف ہے کہ مجرم کو کھڑا رکھا جائے۔" اس نے کہا۔ "قیدی اس کے خلاف پروٹسٹ کر سکتا ہے لیکن یہ بعد کا معاملہ ہے' ہم کوئی بہانہ بنا لیں گے۔"

ایلن جس کھڑکی کے باہر کھڑی تھی اس میں سلاخیں تھیں اور مون نے اس کے سر پر ہیلمٹ رکھ دیا تھا تا کہ جونی سمجھے باہر کوئی گارڈ کھڑا ہے پھر وہ جا کر جونی کو لے آیا۔

کوچرن نے دیکھا کہ اس کا چہرہ بے رونق اور ستا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ اسے بڑا ترس آیا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیئے۔

جونی نے اسے نہیں پہچانا یا اگر پہچان لیا تھا تو انجان بن گیا تھا۔ اپنے کھڑے رہنے پر اس کے ماتھے پر بل تک نہیں آیا۔

"کیا چاہتے ہو' کیوں ملنے آئے ہو؟" معاً اس نے گرم ہو کر کہا۔

کوچرن چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر تک باتیں کرے تا کہ ایلن کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل سکے۔

"اگر تم اپیل کرو تو ممکن ہے تمہاری سزائے موت

عمر قید میں بدل جائے۔" کوچرن نے بات برائے بات کی۔

"یہی مشورہ دینے آئے ہو؟" جونی نے غرا کر کہا۔ "میرا وکیل پہلے ہی اپیل تیار کر رہا ہے اور دو ایک دن میں اسے کورٹ میں دائر کرنے والا ہے۔ شاید تم یہی سننے کے لیے آئے تھے۔"

کوچرن اس سے اظہار ہمدردی بھی نہیں کر سکتا تھا اسے کچھ نہ سوجھا تو بولا۔

"یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"شاید تم جیل کی دنیا سے واقف نہیں ہو؟" جونی نے زہر خند سے کہا۔ "مجھے یہاں بہت آرام مل رہا ہے جس کے لیے میں پولیس اور ان گواہوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے گوشۂ عافیت دلانے کے لیے بڑی کاوش کی ہے۔"

کوچرن کو اس کا اتنا ہی وقت لینا تھا' وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"اس اسٹور والی اور تینوں گواہوں کا میری طرف سے شکریہ ادا کرنا۔ اگر میری اپیل منظور ہو تو میں باقی ماندہ زندگی میں ہر اتوار کو ان کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔"

اس کے طنز کا تیر کوچرن کے دل میں پیوست ہو گیا۔ وہ بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"یہ وہ نہیں ہے' ہرگز نہیں ہے۔" ایلن اضطرابی سرگوشی میں بولی۔ "او میرے خدا! میں نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔"

کوچرن خاموش رہا۔ اس نے کیپٹن مونی کا شکریہ ادا کیا اور دونوں کار میں جا بیٹھے۔

"مسٹر کوچرن!" کار تھوڑی دور گئی تو ایلن نے آہستہ سے کہا۔ "ہمیں اس شخص کو بچانے کی کوشش کرنا ہو گی۔"

"مجھے کوئی طریقہ نہیں آتا۔ تمہیں آتا ہو تو بتاؤ۔" کوچرن نے طنز سے کہا۔

"ہمیں...... اصل قاتل کو ڈھونڈ نکالنا ہو گا۔" ایلن بولی۔

"میرا مشورہ مانو تو پولیس میں بھرتی ہو جاؤ۔" کوچرن نے پھر طنز کیا۔

"میں سیریس ہو کر کہہ رہی ہوں پلیز میرا مذاق مت اڑاؤ۔" ایلن کی آواز میں ارتعاش نمایاں تھا۔ "میرا ضمیر مجھے جھنجوڑ رہا ہے۔"

"ایک طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔" کوچرن نے بالآخر سنجیدہ بن کر کہا۔

"وہ کیا؟" ایلن نے بے تابی سے کہا۔

"تم روزانہ رات کو میرے ساتھ گشت پر رہو۔ کسی وقت بھی وہ شخص کہیں نظر آ جائے گا تم صرف اسے پہچان لینا۔ باقی میرا کام۔" کوچرن نے کہا۔

"منظور ہے۔" ایلن جلدی سے بولی۔

"آج سات بجے میں تمہیں لینے آؤں گا۔" کوچرن نے کہا۔

"میں تیار ملوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

اس نے اسے اپارٹمنٹ کے سامنے اتار دیا اور پولیس اسٹیشن چلا گیا۔

"لڑکی سو فیصد یقین سے کہہ رہی ہے کہ جونی وہ آدمی نہیں ہے۔" اس نے آفس میں داخل ہو کر رینالڈ کو بتایا۔

رینالڈ کے ماتھے پر سوچ کی گہری لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ میرا خیال ہے ہم مسز کارل سے دوبارہ ملیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔" کوچرن ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ایلن کے ساتھ طے کیا گیا پروگرام بتایا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کار میں بیٹھی راستے میں ہر کار والے اور ہر راہ گیر کو غور سے دیکھتی رہے گی؟ پھر یہ ضروری ہے کہ مشتبہ شخص کہیں کھڑا باتیں کرتا نظر آئے؟" رینالڈ نے قدرے تلخی سے کہا۔

"یہ تو ہے لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"کوچرن! تم راؤنڈ پر ہو گے' اسی کا وقت ضائع ہو گا۔" رینالڈ نے کہا۔

"وہ اپنی مرضی سے آمادہ ہوئی ہے' میں نے اسے مجبور نہیں کیا ہے۔" کوچرن نے سر کو جھٹک کر کہا۔

"کوچی! لڑکی جوان اور دلکش ہے۔" رینالڈ نے مسکرا کر کہا۔

"میرا خیال ہے تم راؤنڈ پر اسے ساتھ رکھ لو۔" کوچرن نے جھلا کر کہا۔

☆......☆

تین ہفتے ختم ہو چکے تھے۔ چوتھا لگ گیا تھا۔ کوچرن روزانہ شام کے سات بجے ایلن کے اپارٹمنٹ کے نیچے پہنچ جاتا۔ وہ چند منٹوں میں آ کر کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتی اور کار سڑکوں کے سینے پر پھسلنے لگتی۔ شروع شروع میں وہ باتیں بھی کرتے تھے' نجی سوالوں کے جواب بھی دیئے جا چکے تھے۔ ایک بجے کے قریب کوچرن اسے اپارٹمنٹ کے سامنے اتار دیتا' پہلے وہ خدا حافظ اور شب بخیر کہتی رہی تھی پھر خاموشی سے ساتھ جانے لگی تھی۔

کوچرن سوچتا تھا کہ وہ اس بیگار سے ایک ڈیڑھ ہفتے میں تنگ آ جائے گی اور کسی دن سات بجے اپارٹمنٹ سے نہیں اترے گی یا کہیں چلی جائے گی لیکن تیسرا ہفتہ ختم ہونے پر بھی ایلن نے اکتاہٹ ظاہر نہیں کی تھی۔ اس کی لگن میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اس کے پہنچتے ہی اپارٹمنٹ سے نیچے اتر آتی تھی' جیسے کہ اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اسی عزم کے ساتھ کار میں بیٹھ جاتی اور سارے وقت چوکنا رہتی تھی۔

وہ رات کو کیفے شیمروک کے سامنے سے دو ایک گھنٹے کے وقفے سے دو تین بار گزرتے تھے۔ جس کے باہر ایلن نے بقول اس کے اصل قاتل کو دیکھا تھا لیکن اس نے کسی آدمی کی نشان دہی نہیں کی۔

"ایک ماہ ہو جائے گا؟" چوتھے ہفتے کی تیسری رات کو کوچرن نے کہا۔

ایلن نے جواب نہیں دیا اور باہر دیکھتی رہی۔ گیارہ بج رہے تھے اور ان کی کار دو گھنٹے پہلے شیمروک کے سامنے سے گزر چکی تھی اور اب دوسری بار گزر رہی تو ایلن نے سیٹ پر اچھل کر کہا۔

"کوچ...... رن...... رک جاؤ۔"

کوچرن نے بریک نہیں لگائے' صرف رفتار دھیمی کر لی۔

"وہ ہے...... کیفے میں جا رہا ہے۔ وہی ہے۔" ایلن نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا۔

کوچرن نے اس کی انگلی کی سمت میں دیکھا۔ ایک شخص کیفے کا شیشہ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک نیون سائن کی روشنی میں نہایا ہوا تھا لیکن ان کی طرف اس کی پشت تھی۔ کوچرن جلدی سے کار کا دروازہ کھول کر اترا اور بولا۔

"میں اسے قریب سے دیکھ کر آتا ہوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کیفے کی طرف بڑھا۔ اس نے اس شخص کا لباس دیکھ لیا تھا اور اندر جا کر اسے پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ وہ شخص ایک خالی میز پر بیٹھ چکا تھا۔ کوچرن اس سے کوئی دو گز کے فاصلے پر ترچھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس نے ویٹر کو کافی کا آرڈر دیا۔ اس شخص نے اپنے لیے کوئی مشروب منگوایا۔

کوچرن نے دیکھا کہ اس کے بال سنہرے ضرور تھے لیکن چہرہ مہرہ جونی سے قطعاً ملتا جلتا نہیں تھا۔ اس

کے جبڑے مضبوط تھے اور چہرے پر سختی تھی۔ جونی کے چہرے پر ملائمت تھی۔ کوچرن نے اندازہ لگایا کہ اس کا قد بھی جونی کے قد سے تقریباً چھ انچ زیادہ ہے۔ وہ کھڑا نہیں تھا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے کسی سے باتیں بھی نہیں کر رہا تھا لہٰذا اس کی شناخت کی دو چیزیں بھی دسترس سے باہر تھیں۔

کوچرن نے کافی ختم کی اور سکے میز پر رکھ کر کھڑا ہوگیا' اس شخص کے قریب سے گزرتے ہوئے پھر اس نے اس پر گہری نظر ڈالی اور کیفے سے باہر نکلا۔

''صرف اس کے بالوں کا رنگ جونی سے ملتا جلتا تھا' اس کے علاوہ اور کوئی بات دونوں میں مشترکہ نظر نہیں آئی۔'' اس نے کار کے پاس جا کر ایلن سے کہا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ وہی ہے وہ کار سے اترا تو میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ مجھے اس میں وہی جھلک نظر آئی جو اسٹور سے بھاگتے ہوئے شخص کے چہرے پر تھی۔'' ایلن اپنی بات پر بضد تھی۔ ''ہم انتظار کرتے ہیں' وہ باہر آئے گا تو تم کسی بہانے سے اس کے ساتھ بات کرو۔ اس سے مجھے اندازہ ہوجائے گا۔''

''اگر وہ مجھے جانتا ہوگا اور واقعی مجرم ہوگا تو چوکنا ہوجائے گا اور ممکن ہے شہر سے فرار ہوجائے۔'' کوچرن نے معقول بات کہی۔

''رسک تو بہرحال لینا ہوگا۔'' ایلن بولی۔ ''تم اسے بھاگنے کا موقع مت دو پوچھ گچھ کے لیے فوراً حراست میں لے سکتے ہو۔''

''کس الزام میں؟ اس لیے کہ وہ اس کیفے میں کیوں آیا یا اس کے بال سنہرے کیوں ہیں؟'' کوچرن نے زہر خند سے کہا۔ ''یہ افریقہ کی کوئی قبائلی ریاست نہیں ہے' امریکہ ہے میڈم!''

''کچھ بھی ہو پلیز تم وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں۔'' ایلن نے بچوں کی سی خواہش پر ضد کرنے کی طرح کہا۔

کوچرن کو اس کی معصومیت پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اسے اس مستحکم مزاج اور اپنے ارادے میں پہاڑ کی طرح اٹل لڑکی کے ساتھ روزانہ تقریباً چھ گھنٹے وقت گزارتے ہوئے تین ہفتے سے زیادہ ہوگئے تھے۔ اس عرصے میں اسے اس کے مزاج اور اطوار کو پرکھنے کا اچھا خاصا موقع ملا تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں سے قطعاً مختلف نظر آئی تھی۔ شروع شروع میں وقت کاٹنے کے لیے انہوں نے کچھ ذاتی نوعیت کی باتیں بھی کی تھیں اور کوچرن کو اس کے فیملی بیک گراؤنڈ اور موجودہ حالات کا تھوڑا بہت علم ہوگیا تھا۔

وہ اپارٹمنٹ میں اکیلی رہتی اور ایک لائبریری میں انڈکس کلرک تھی۔ اس کا باپ مرگیا تھا اور ماں اپنے بھائی کے پاس دو چھوٹے بچوں کے ساتھ لاس اینجلس میں رہتی تھی۔ وہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوکر تلاش معاش میں نیویارک آ گئی تھی۔

کوچرن اس کے جذبے کو تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا اور اس کی مستقل مزاجی دل پر نقش ہوگئی تھی۔ ایلن کو صبح نو بجے لائبریری پہنچ جانا ہوتا تھا' جہاں وہ پانچ بجے تک مسلسل کام کرتی رہتی تھی۔ تھکن اتارنے یا کہیں جا کر دل بہلانے کی بجائے بلاناغہ چھ گھنٹے کار کی نشست پر بیٹھے رہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ خصوصاً کسی نوجوان لڑکی کے لیے یہ بہت بڑی سزا تھی۔ وہ اپنے ضمیر کی تسکین کے لیے استقامت سے یہ تکلیف جھیل رہی تھی۔

ان ہی باتوں کی بنا پر کوچرن کو وہ اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی تھی' وہ بتیس سال کا ہوچکا تھا اور شادی نہیں کی وہ نہ صرف شہر بلکہ دنیا میں تنہا تھا۔ رومانس نام کی کوئی چیز اس کے دل و دماغ کے قریب

نہیں بھٹکی تھی لیکن ان تین ہفتوں میں وہ اس لڑکی کے لیے دل سے اٹھتی ہوئی صدا کو سن رہا تھا۔

وہ شخص کیفے سے نکل آیا اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی کار کی طرف بڑھا۔ کار سیڈان تھی اور اس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ کوچرن آگے بڑھا۔

''ہیلو گوڈرن!'' اس نے پیچھے سے کہا۔ اس شخص نے سر گھمایا اور کوچرن جلدی سے بولا۔ ''سوری! مجھے تم پر اپنے ایک دوست کا گمان ہوا۔ میں نے سوچا وہ کیلی فورنیا سے کب آیا' تمہاری شکل ہو بہو اس سے ملتی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس شخص نے اخلاقاً کہا۔ ''ایسا اکثر ہوجاتا ہے۔''

''میں اسے بتاؤں گا کہ ایک شخص اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔ پہلی نظر میں انسان دھوکہ کھا جاتا ہے۔'' کوچرن نے ہنس کر کہا۔ ''بلکہ اگر ممکن ہوا تو تمہیں اسے دکھا بھی دوں گا۔ بائی داوے تم کہاں مل سکتے ہو۔''

اس شخص کی آنکھوں میں شبہے کا رنگ دوڑ گیا۔ اس نے کہا۔

''میں نیویارک میں نہیں رہتا۔ کبھی کبھی یہاں آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بھی ہاتھ ہلایا اور کار کی طرف بڑھا۔

''معذرت چاہتا ہوں میں نے تمہیں روک لیا۔'' کوچرن نے ایک طرف سے اسے سرتاپا غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور مخالف سمت میں بڑھ گیا۔

کیفے کی دیوار کے پاس جا کر اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو اس شخص کی سیڈان رینگ رہی تھی۔ کوچرن کیفے کی سائیڈ اسٹریٹ پر چلا گیا اور گھوم کر آیا۔ وہ کار میں جا بیٹھا اور اس نے انجن اسٹارٹ کیا' گہری نیلی سیڈان سڑک پر مڑ چکی تھی کوچرن نے کار اس کے پیچھے ڈال دی۔

ایلن خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ان کی کار سڑک پر آئی تو وہ بولی۔

''تم اس کا پیچھا کر رہے ہو نا؟ بالکل ٹھیک کر رہے ہو' یہ وہی آدمی ہے۔''

کوچرن نے کار کے عقبی آئینے میں اس کی طرف دیکھا۔ سڑک کی دوطرفہ روشنی میں اس کا چہرہ دمکتا ہوا لگ رہا تھا' جیسے وہ ہیجان میں تھی۔

''میں تمہارے اطمینان کی خاطر اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔'' کوچرن نے کہا۔ ''مجھے اس میں اور جونی میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔''

''مجھے نظر آئی ہے۔'' ایلن چہک کر بولی۔ ''اور میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اسٹور میں یہی تھا۔ جونی نہیں تھا۔ تم اس کا گھر دیکھنے جا رہے ہو؟''

''ہاں! تمہارے اطمینان کی خاطر۔'' کوچرن نے جواب دیا۔ ''یہ ہماری اندھی دوڑ کی آخری رات ہے۔ کل سے میں تمہیں سات بجے لینے نہیں آؤں گا۔ تم اپنا فرض ادا کر چکی ہو' اب آرام کیا کرو۔''

ایلن نے جواب نہیں دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ کوچرن گاہے بگاہے آئینے میں اس کے چہرے پر نظر ڈالتا اور اس پر اتار چڑھاؤ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے آگے سیڈان اس طرح جا رہی تھی جیسے اسے چلانے والے کو کہیں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی یا وہ سارے کاموں سے فارغ ہوکر گھر لوٹ رہا تھا۔

''مس موریسن!'' اچانک کوچرن نے کہا۔ ''تم جلدی سے اترو اور دوڑ کر کہیں سے رینالڈ کو فون کرو' اسے یہاں فوراً آنے کا کہو' وہ پٹرولنگ کار میں کہیں پھر رہا ہوگا۔ تم ہیڈ کوارٹر سے میرا نام لے کر معلوم کر لینا......''

ایلن نے دیکھا کہ سیڈان ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ

کے سامنے رک گئی تھی اور وہ شخص اتر کر اس کی راہداری کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ پوچھے بغیر کار کا دروازہ کھول کر تقریباً کود پڑی اور ٹیلی فون کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

کوچرن نے اپنی کار سیڈان سے کوئی دو گز آگے لے جا کر روکی اور اتر پڑا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپارٹمنٹ بلڈنگ کے دروازے پر پہنچا تو وہ شخص راہداری میں نظر نہیں آیا۔ کوچرن فٹ پاتھ پر آ کھڑا ہوا اور سگریٹ پینے لگا' کوئی پانچ منٹ بعد ایلین ایک طرف سے آتی نظر آئی اور کوچرن نے آگے بڑھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''تم چل کر کار میں بیٹھو۔'' کوچرن نے سگریٹ کا دھواں خوش دلی سے اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے بتاؤ گے نہیں یہاں......'' ایلین اضطراب سے کہنے لگی۔

''مس موریسن......!'' کوچرن نے پھر دھوئیں کا مرغولہ اس کے منہ پر چھوڑا۔ جس پر اس نے ناک بھویں چڑھا کر دھوئیں کو ناک کے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں تین ہفتوں سے انتظار کر رہی ہوں تو چند منٹ اور کرلوں گی۔ میرا مسٹر رینالڈ سے رابطہ ہوگیا تھا' میں نے انہیں جگہ بتا کر فوراً پہنچنے کو کہا ہے۔ یہاں سے کارل کا اسٹور تو قریب ہی ہے۔''

''اب تم جاؤ اور کار میں آرام سے بیٹھی رہو۔'' کوچرن نے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' ایلین بضد تھی۔ ''جو بھی منظر ہوگا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی' میں بزدل نہیں ہوں۔''

''احتیاط کرنا بزدلی نہیں ہوتی ہے۔ میں کہہ رہا ہوں تم کار میں جا کر بیٹھو۔'' کوچرن نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

ایلین قدم پٹختی ہوئی چلی گئی۔ کوچرن مسکرانے لگا۔ یہ لڑکی اس کے دل میں اترتی جارہی تھی۔ اسے پولیس کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں اور وہ آگے بڑھا۔ رینالڈ اگلا دروازہ کھول کر اترا۔ باوردی ڈرائیور کے علاوہ پچھلی سیٹ پر ایک پولیس مین بھی تھا۔

''اس بلڈنگ میں تو کارل کا اپارٹمنٹ ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس لیے میں نے تمہیں بلالیا ہے۔'' کوچرن نے کہا۔ ''ہمارا مطلوبہ یا مشتبہ آدمی اس بلڈنگ میں گیا ہے۔''

''کہیں وہ کارل کی بیوی کو نقصان نہ پہنچانا چاہتا ہو؟'' رینالڈ نے کہا۔

''یہی ہمیں دیکھنا ہے۔'' کوچرن نے جواب دیا۔ ''تم اپنے دونوں آدمیوں کو بلڈنگ کی پچھلی طرف ایمرجنسی زینے پر بھیج دو۔ ان سے کہو کہ ڈرینج پائپ پر بھی نظر رکھیں۔ ایلین میری کار میں بیٹھی ہوئی ہے۔''

رینالڈ چلا گیا اور دو منٹ میں واپس آ گیا۔ انہوں نے بورڈ سے کارل کے اپارٹمنٹ نمبر کی تصدیق کی اور لفٹ کی طرف بڑھے۔ اپارٹمنٹ چھٹی منزل پر تھا۔ انہوں نے ریوالور نکال لیے اور دروازے پر پہنچے۔ کوچرن نے گھنٹی بجائی تو خاصی دیر بعد دروازہ کوئی دو انچ کھلا۔ کوچرن نے چاروں انگلیاں خلا میں ڈال دیں اور زور لگا کر مزید چند انچ چوڑا کر کے ٹانگ دونوں کواڑوں میں اڑا دی پھر دونوں نے شانوں سے دھکا لگایا اور دروازہ پورا کھل گیا۔ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے اور ریوالور تان لیے۔

مسز کارل گاؤن پہنے ہوئے سراسیمہ سی کھڑی تھیں' وہ شخص بھی صرف بنیان میں کرسی پر بیٹھا تھا۔

اس کی گود میں ریوالور رکھا ہوا تھا۔ کوچرن نے آگے بڑھ کر ریوالور اٹھالیا۔ معاً مسز کارل کچن کی طرف دوڑی لیکن رینالڈ نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور رونے لگی۔ وہ شخص ساکت بیٹھا تھا' اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

''تم دونوں ہمارے ساتھ چلو۔'' کوچرن نے تحکمانہ کہا۔

چاروں بلڈنگ سے نکلے اور رینالڈ نے مخصوص سیٹی بجائی' دونوں پولیس والے آ گئے۔ مسز کارل اور اس شخص کو رینالڈ کی کار میں پچھلی سیٹ پر بٹھا کر وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پولیس مین ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اور کار روانہ ہوئی۔ کوچرن نے جا کر اپنی کار کا اگلا دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔

''میں تمہیں اپارٹمنٹ پر چھوڑنے جارہا ہوں۔'' اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا سڑکوں کا سفر ختم ہوگیا۔ کل میں سات بجے بلڈنگ کے نیچے تمہارا انتظار کرنے کی بجائے اوپر تمہارے اپارٹمنٹ میں آؤں گا اور تفصیل سے باتیں ہوں گی' امید ہے تم عمدہ کافی پلاؤ گی۔''

اگلے روز وہ شام کے ٹھیک سات بجے ایلین کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ دو کمروں پر مشتمل اپارٹمنٹ کو ایلین نے سلیقے اور نفاست سے سجا رکھا تھا۔ ان کے درمیان چھوٹی میز پر کافی دان' کپ اور بسکٹوں سے بھری پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔

''عام سی کہانی ہے۔'' کوچرن کہہ رہا تھا۔ ''مسز کارل اور اس شخص کی جس کا نام میک گوز ہے۔ دوستی تھی' کارل ادھیڑ عمر تھا اور مسز کارل کی اس میں دلچسپی ختم ہوگئی۔ دونوں اسے راستے سے ہٹا کر یہاں سے کہیں چلے جانا چاہتے تھے۔ گوز کے سامنے ایک خوب صورت جوان عورت اور ایک بڑے ڈرگ اسٹور کا لالچ تھا' اسے فروخت کردینے سے اچھی خاصی رقم ہاتھ آئی تھی......'' اس نے کافی کا گھونٹ بھرا' چٹخارہ لیا اور بات جاری رکھی۔ ''پروگرام کے مطابق گوز نے کارل کو ختم کردیا اور اس قتل کو ڈکیتی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ ان کی بدقسمتی سے تمہیں بھی اسی وقت اسٹور میں داخل ہونا تھا۔ جس سے ان کا منصوبہ آخر میں آ کر دم توڑ گیا۔ مسز کارل نے رونے پیٹنے اور ہذیان زدہ ہونے کی کامیاب اداکاری کی۔ اس نے جونی کو بہ حیثیت قاتل شناخت بھی کرلیا اور وہ بے چارہ ناکردہ جرم میں پکڑا گیا اگر اس کا ماضی داغ دار نہ ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے شکنجے میں کس نہ جاتا لیکن......'' اس نے پھر کافی کا گھونٹ لیا تعریفاً ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''لیکن ایک فرشتہ اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ وہ فرشتہ بہت ضدی طبیعت تھا' اس نے کسی کی چلنے نہ دی اور بالآخر جونی کو ''جواں مرگ'' سے بچالیا۔'' اس نے کافی کا خالی کپ میز پر رکھ دیا اور بولا۔ ''میں اب چلتا ہوں کافی اتنی عمدہ نہیں تھی' جتنی میں نے تعریف کی۔ اگر تمہیں کبھی شادی کا خیال آئے تو اس امیدوار کو سامنے رکھنا۔'' اس نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میز پر رکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

❖

برزخ

نسیم سحر

برزخ وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد ہماری ارواح قیام کرتی ہیں اور اس روز کا انتظار کرتی ہیں جب انہیں حساب کتاب کے لیے طلب کیا جائے گا۔
جنگِ عظیم کا ایک واقعہ' ان لمحوں کا احوال جب انسان کو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرچکا ہے۔

تراجم پسند کرنے والوں کے لیے ایک مختصر کہانی

مارگن کو جب ہوش آیا تو وہ اپنے تباہ شدہ ہوائی جہاز کے شکستہ ڈھانچے میں تھا۔ تیز دھوپ سے اس کے چہرے اور گردن کے لاتعداد زخموں میں شدید جلن ہورہی تھی۔ اسے چند گز کے فاصلے پر سمندر کی موجوں کا شور سنائی دے رہا تھا لیکن وہ گردن موڑ کر ادھر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس وقت تو اس کے لیے اپنی آنکھوں کو مکھیوں کی زد سے بچانا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری تو اپنے ہی منجمد خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔ اس نے انگلیوں سے جہاز کی حفاظتی پٹی کو ٹٹولا' اس کا بکل ٹوٹ کر آدھا رہ گیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جہاز زور سے چٹانوں سے آ ٹکرایا تھا تو دھچکے سے وہ اپنی سیٹ میں سے اچھل کر دور جا گرا تھا۔ اس لحاظ سے وہ خوش قسمت تھا کیونکہ وہ متحدہ ہوائی محاذ کے ان لاتعداد ہوابازوں میں شامل ہونے سے بچ گیا تھا جن کے لیے یہ وسیع سمندر ایک قبرستان بن گیا تھا۔ متحدہ ہوائی محاذ میں اس کے بے شمار دوست تھے جو وقتاً فوقتاً ہوائی حادثات اور خراب موسم کا شکار ہوگئے تھے۔ جن میں بیرسفورڈ' ڈلس' ڈیوڈسن' گرے اور شاکلٹن جیسے دوست شامل تھے۔ ویسے بھی اس محاذ میں شامل تمام پائلٹ ایک خاص گروہ سے تھے اور ایک دوسرے کے لیے برادرانہ جذبات رکھتے تھے۔

''آہ! کس قدر تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔'' مارگن نے سوچا...... ''کاش میں تھوڑی دیر کے لیے سوسکتا۔'' اگر اسے نیند آجاتی تو اسے اپنی بیوی کے بارے میں پریشان کن خیالات سے بھی چھٹکارا مل جاتا۔ اب سے چار گھنٹے قبل جب کہ آسمان پر اکٹھے ہوتے ہوئے گہرے بادل ژالہ باری کی تیاری کررہے تھے وائرلیس کے ذریعے مارگن کے نام اس کی ماں کا بھیجا ہوا ایک پیغام موصول ہوا تھا۔ ''جین کو اسپتال میں داخل کرادیا گیا' بچے کی پیدائش شاید آپریشن کے بغیر نہ ہوسکے۔''

اور اس نے اپنے ساتھیوں کی اس نصیحت کے باوجود کہ موسم انتہائی خطرناک اور پرواز کے لیے ناموزوں ہے' جین کے پاس پہنچنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ اس نے اپنے معاون پائلٹ اشاسی سے جب درخواست کی کہ اس کا جانا بڑا ضروری ہے تو اشاسی جو اس کا گہرا دوست تھا فوراً اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوگیا تھا۔ ان کے جہاز کے نیچے دور دور تک سمندر اور چند نامعلوم جزیرے دکھائی دے رہے تھے۔ مارگن پریشان خیالی کا شکار تھا۔ کبھی تو وہ جین کے بارے میں سوچنے لگتا تھا اور کبھی وہ سوچتا کہ انہی سمندروں کی گہرائی میں میرے کئی

دوست نہ جانے کن حالات میں موت کا سامنا کرچکے ہیں لیکن ان سمندروں پر پرواز کرنے والے ہوابازوں کو تو شروع ہی میں حالات کی نزاکت سمجھادی جاتی ہے' اس لیے وہ ہر لمحہ تباہی اور موت کے لیے تیار رہتے تھے اور ان کا نعرہ ہی یہ رہتا تھا۔

''ہم سب کسی ایک کے لیے مرسکتے ہیں' ہم میں سے کوئی ایک سب کے لیے جان دے سکتا ہے۔'' پھر مارگن کو وہ مجموعہ جزائر دکھائی دیا جہاں ایک خوفناک جنگ لڑی گئی تھی' اس جنگ میں متحدہ ہوائی محاذ کے بے شمار پائلٹ مرگئے تھے۔ یہ آٹھ مئی ۱۹۴۲ء کا واقعہ تھا اور اچانک مارگن کو یاد آیا کہ آج بھی اتفاق سے آٹھ مئی ہی کا دن ہے۔ بیس سال پہلے کے تمام واقعات اسے یاد آنے لگے۔ جب پہلی مرتبہ وہ خبر آئی تو سب کے کیا احساسات تھے۔ پورے تیئیس پائلٹ سب کے سب متحدہ ہوائی محاذ سے تعلق رکھتے تھے۔ دشمن کے مقبوضہ جزائر پر حملہ کرتے ہوئے لاپتا ہوگئے تھے۔ ان وسیع سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں میں نہ تو جہازوں کا کوئی سراغ مل سکا تھا اور نہ ان پائلٹوں کا۔

اچانک مارگن کو اپنا ہوائی جہاز ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔ گہرے بادلوں میں گھر کر جہاز کے کاک پٹ میں اندھیرا سا چھا گیا لیکن رعد و برق کا طوفان بار بار خیرہ کن روشنی پھیلا رہا تھا۔ ریڈیو جلد ہی بیکار ہوگیا اور سمت نما بھی تباہ ہوچکا تھا۔ معاون ہواباز اشاسی سخت گھبرا چکا تھا اور پھر نہ جانے کس طرح پلک جھپکتے جہاز تباہ ہوگیا۔ انہوں نے ہنگامی طور پر اسے ایک جزیرے پر اتارنے کی کوشش کی اور پھر مارگن کو کچھ ہوش نہ رہا۔

اب مارگن نے بڑی مشکل سے اٹھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن اشاسی کہیں نظر نہیں آرہا تھا' اس نے آوازیں بھی دیں مگر بے سود وہ شاید یہاں تنہا تھا اور ریڈیو بیکار ہوچکا تھا۔ گویا اس طرح متحدہ ہوائی محاذ کو اپنے بچ جانے کا پیغام دینا بھی ناممکن ہوچکا تھا۔ وہ دنیا بھر سے کٹ کر رہ گیا تھا لیکن اسے اس بات کی زیادہ فکر تھی کہ دس بارہ گھنٹے کی تلاش کے بعد اگر محاذ کے دوسرے ہواباز اسے نہ ڈھونڈ سکے تو وہ لاپتا قرار دے دیا جائے گا اور جین کو یہ پیام بھیج دیا جائے گا جس کا مطلب جین بخوبی سمجھتی تھی۔ ان سمندروں میں کسی کے لاپتا ہونے کا مطلب مرجانا ہوجاتا تھا لیکن مارگن نے سوچا ہوسکتا ہے کوئی ہواباز مجھے دیکھ لے حالانکہ یہ محض خوش فہمی تھی۔ فردِ واحد کو ان بیکراں علاقوں میں تلاش کرنا گھاس میں سوئی تلاش کرنے کے برابر تھا۔

پھر مارگن کو اچانک اپنی تکلیف میں کمی کا احساس ہوا۔ وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند ہوچکا تھا۔ شاید اتنی دیر آرام سے لیٹے رہنے کی بدولت اس کی تکلیف ختم ہوچکی تھی۔ وہ اٹھا اور جہاز کے ڈھانچے سے کود کر باہر آگیا۔ اب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں سے ساحل سمندر کی طرف جارہا تھا۔ ''اشاسی اشاسی'' اس نے ساحل پر پہنچ کر زور زور سے آوازیں دیں۔ اشاسی جہاز کے ڈھانچے میں نہیں تھا تو اسے یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا لیکن کیا وہ زندہ تھا؟ اگر اشاسی زندہ ہوتا تو وہ یقیناً مارگن کی مدد کو پہنچتا۔ اگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ وہ ضرور سمندری لہروں کی نذر ہوچکا تھا۔

ساحل پر پہنچ کر مارگن کو ایک عجیب سا احساس

ہوا' یہ کوئی غیر آباد جزیرہ نظر آتا تھا جہاں دور دور تک کوئی کشتی یا لانچ تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ سمندر تو اس طرح کے جزیروں سے اٹا پڑا تھا جنہیں آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا اور جہاں شاید کسی نے قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ بہر حال وہ اب جزیرے کی طرف چلنے لگا' کچھ ہی آگے جا کر اسے کوئی چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ وہ چونک کر آگے بڑھا اور غور سے اس جگہ کو دیکھنے لگا۔ یہ دھات کا ایک ٹکڑا تھا' شاید کسی تباہ شدہ جہاز کے ملبے کا حصہ' مارگن مایوس ہو کر اور آگے بڑھا' آگے چل کر مارگن چونک کر رک گیا۔ سامنے ہی کسی تباہ شدہ جہاز کی دم ابھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی جہاز زمین کے اندر دھنس گیا ہو' پھر اس نے دم کے پاس متحدہ ہوائی محاذ کا خاص نشان بھی دیکھ لیا۔ گویا یہ ان تیس جہازوں میں سے ایک تھا جو بیس سال پہلے آج کے دن جنگ میں تباہ ہو گئے تھے۔ نہ جانے اس کا ہوا باز بچ سکا ہو گا یا نہیں' مارگن سوچتے ہوئے آگے کی طرف چل دیا اور اگلے نصف گھنٹے میں اسے مزید تین جہازوں کے تباہ شدہ ڈھانچے بھی نظر آ گئے۔ وہ سب جہاز متحدہ ہوائی محاذ ہی کے تھے اور مارگن سوچ رہا تھا کہ یہ جزیرہ تو باقاعدہ جہازوں کا قبرستان ہی بن کر رہ گیا ہے۔

اسے اس سناٹے میں کوئی انوکھا سا احساس ہو رہا تھا' وہ اس ویران جزیرے میں بالکل اکیلا تھا اور بظاہر کوئی انسان اس جزیرے پر موجود نہیں تھا لیکن مارگن نے حیران ہو کر سوچا' آخر یہاں کوئی پرندہ' مثلاً بگلے یا مرغابیاں تو ضرور موجود ہونی چاہئیں۔ یہاں نہایت غیر قدرتی سی خاموشی تھی۔ یہ سناٹا تو بہت اذیت ناک تھا۔ دور دور تک گھاس اور چند گھنے درختوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ آخر خاموشی اتنی گہری کیوں ہے؟ وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ کم از کم وہاں اسے اس گرمی سے تو نجات مل جائے گی۔ درختوں کے جھنڈ میں پہنچتے ہی اسے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک اور تباہ شدہ ہوائی جہاز دکھائی دیا اور اس کی دم پر لکھے ہوئے نمبر کو پڑھتے ہی مارگن تیزی سے ادھر چل دیا۔ یہ تو اس کے بہترین دوست بیرسفورڈ کا جہاز تھا اور اس کا تو کاک پٹ بھی اچھی حالت میں تھا۔ گویا اس بات کا امکان تھا کہ بیرسفورڈ زندہ بچ گیا ہو' وہ اب اس جزیرے میں بیرسفورڈ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو۔

پھر اسے اچانک اس گمبھیر سناٹے کو توڑنے والی ایک آواز سنائی دی تو وہ اچھل پڑا۔ یہ آواز' یہ بینڈ کی آواز' متحدہ ہوائی محاذ کا خصوصی نغمہ بجایا جا رہا تھا اس سے وہ اچھی طرح واقف تھا لیکن اس ویران جزیرے میں یہ نغمہ کون بجا رہا ہے؟ یہ سوال فوراً جواب چاہتا تھا۔ اب اس نغمے کی آواز بتدریج اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ مارگن تیزی سے اس سمت بھاگا' جدھر سے یہ آواز آ رہی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے جانی نظر آ گیا' اس کا ایک اچھا دوست اور ایک مشاق ہوا باز جس کا جہاز کچھ عرصہ قبل لاپتا ہو گیا تھا۔

''ارے جانی..... تم زندہ ہو.....؟'' وہ جانی کی طرف دوڑا اور پھر وہ اپنی بینائی پر یقین نہ کرتے ہوئے وہیں رک گیا۔ کیونکہ اب جانی کے علاوہ اسے بیشمار لوگ نظر آ رہے تھے۔ ہوا بازوں کی تین لمبی قطاریں جانی سے کچھ فاصلے پر اٹین شن کھڑی تھیں جیسے کوئی ان کا معائنہ کرنے کے لیے آنے ہی والا ہو۔ اس وقت سورج دور سمندر کے آخری

کونے میں' پانی میں اترنے ہی والا تھا اور درختوں کے سائے بہت لمبے ہو گئے تھے۔

پھر اس نے سر کو جھٹکا کیونکہ وہ اس منظر کو سراب سمجھ رہا تھا۔ شاید یہ ڈوبتے سورج کا طلسم تھا لیکن نہیں' ان لوگوں کے خدوخال پہچانے جا سکتے تھے' یہ نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ اب جانی اس کی طرف آنے کے بجائے ان تین قطاروں کی طرف جا رہا تھا پھر اس نے آخری قطار کے ایک سرے پر اپنی جگہ سنبھال لی۔ پھر تمام ہوا باز سلیوٹ کے انداز میں داہنا ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

پھر ایک طویل القامت شخص اگلی قطار سے نکل کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس لمحے مارگن کو احساس ہوا کہ اگرچہ درختوں اور دوسری چیزوں کے سائے نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں مگر اس شخص کا سایہ نہیں تھا بلکہ تمام ہوا بازوں کا سایہ نہیں تھا!

''خوش آمدید..... مارگن..... خوش آمدید.....''

''ارے! بیرسفورڈ..... تم؟''

''ہاں.....'' اب بیرسفورڈ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''تم نے یہاں تک پہنچنے میں ہماری توقعات سے زیادہ وقت لیا ہے' اسٹاسی تین گھنٹے پہلے یہاں پہنچ چکا ہے' اسٹاسی کے علاوہ اور بہت سے پرانے دوست بھی تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہو رہے ہیں۔''

''کون کون سے دوست؟''

''شاکلٹن' ڈیوڈسن' گرے بہت سے ہیں..... وہ سب تمہارا خیر مقدم کر رہے ہیں۔''

مارگن نے دیکھا کہ وہ سب اس کی طرف دیکھ کر خوشی سے ہاتھ لہرا رہے ہیں لیکن ان میں سے کچھ چہرے اس کے لیے اجنبی تھے۔ جب مارگن نے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا تو بیرسفورڈ بولا۔

''وہ ہم سے پہلے متحدہ ہوائی محاذ کے رکن تھے۔ وہ جنگ عظیم اول میں بھی لڑ چکے ہیں۔ ہم سب ایک ہی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ آؤ ان سب سے تمہارا تعارف کراؤں۔''

''لیکن بیرسفورڈ...... کیا میں کسی طرح اپنی بیوی کو پیغام بھجوا سکتا ہوں؟''

مارگن نے پوچھا۔

''نہیں پیارے دوست...... افسوس کہ یہ ممکن نہیں ہے' تم اب ان رشتوں سے بے نیاز ہو چکے ہو' اس جزیرے میں کبھی کوئی امدادی مہم نہیں آئے گی۔ یہاں ریڈیو سے پیغام سنایا بھجوایا نہیں جا سکتا۔ ہم نے تمام دنیا سے جدا اور علیحدہ ہو کر یہاں متحدہ ہوائی محاذ کے لیے جگہ بنائی ہے۔ تم اب ہمیشہ ہمارے ساتھ یہیں رہو گے۔ ابھی ہمارے چند دوست اور بھی ہیں لیکن انہیں ہم سے آ ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

مارگن نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ سورج کی روشنی کے باوجود اس کا کوئی سایہ نہیں تھا۔

''ہاں ...... میں متحدہ ہوائی محاذ میں شامل ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ کبھی جین کے پاس یا واپس اپنی دنیا میں نہیں پہنچ سکے گا۔ اب اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہنا تھا۔

واپسی

اقبال بھٹی

مثالی زندگی گزارنے والوں کی زندگی میں بھی کبھی ایسے لمحات آجاتے ہیں جب ان کے خرمن پر شک کی بجلی گر کر ان کے نشیمن کو خطرات سے دوچار کر دیتی ہے۔ ایک میاں بیوی کا احوال' شک کا افعی ان کے درمیان دیوار بن گیا تھا۔

شادی شدہ لوگوں کے لیے بطور خاص ایک رہنما تحریر

یہ اتوار کی صبح تھی۔

ہر اتوار کی طرح آج بھی ایلن اور لزا نے بھرپور ناشتا کیا تھا اور اب حسب معمول ڈرائنگ روم کے قالین پر لیٹے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے اگر موسم خوش گوار ہوتا تو وہ گھر پر رہنے کی بجائے کہیں باہر جانے کو ترجیح دیتے۔ لزا نے اخبار موڑ کر غصے میں ایک جانب پھینکا اور لیٹے ہوئے شوہر کی طرف دیکھنے لگی لیکن اس کی خوب صورت آنکھوں اور تروتازہ چہرے پر پیار کی بجائے غصے کے تاثرات تھے۔ ایلن ان تاثرات سے بے نیاز اخبار پڑھتا رہا تو لزا اٹھ بیٹھی اور ایلن کے سینے پر ہلکے ہلکے مکے مارتے ہوئے بولی۔ ''میں کیا کروں ایلن' میں کیا کروں؟''

ایلن نے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں جو کہوں وہ کروگی؟''

لزا نے اس کی شریر نگاہوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ کیا کہے گا' لہٰذا نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی'' نہیں''

''تو پھر مجھ سے مشورہ کیوں مانگا تھا؟''

''تو پھر کس سے مانگوں؟''

''ہاں' یہ بات تو ہے۔ شوہر سے زیادہ اچھا مشیر کوئی نہیں ہوسکتا۔''

''تو پھر بتاؤ نا' میں اپنے شعبے کی انچارج اس بڈھی گھوڑی میبل سے کیسے نمٹوں؟''

''مجھے بھی بڈھی گھوڑیوں سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''نہیں' ایلن تم سمجھتے کیوں نہیں۔'' لزا نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرا استحصال کررہی ہے میں نے پورے ہفتے کی محنت سے رپورٹ تیار کی اور اس نے وہ رپورٹ اپنے نام سے آگے بڑھا دی۔ یہ میرے ساتھ زیادتی ہے یا نہیں؟''

''ہے تو۔''

''اگر میبل میری محنت کا ثمر خود وصول کرتی رہی تو مجھے ترقی کس طرح مل سکتی ہے۔ میرا کیریئر کیسے بن سکتا ہے؟'' لزا ایک لمحے کو رکی اور ٹھنڈی سانس لے کر پھر بولنے لگی۔ ''اس طرح تو ہمارے سارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔ بتاؤ نا مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''تم اپنی کمپنی کے مالک کو اس صورتِ حال سے کیوں آگاہ نہیں کرتیں؟''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھ سے پہلے جتنے لوگوں نے میبل کی شکایت کی' انہیں یہی جواب ملا اگر یہاں تمہارا استحصال ہورہا ہے تو تم کسی دوسرے ادارے میں چلے جاؤ۔ اس جواب سے اب تک صرف ایک ہی آدمی کو فائدہ پہنچا ہے' جب اسے یہ جواب ملا تو وہ اپنی نشست پر واپس آنے کی بجائے باہر چلا گیا اور اس نے اپنی کمپنی قائم کرلی۔ آج اس کی کمپنی ہمارے ادارے کی سب سے بڑی مدمقابل ہے۔''

''وہ کون تھا؟'' ایلن نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جارج بیکر۔''

''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''ہاں' میں نے تقریباً ایک سال اس کے ساتھ کام کیا ہے۔''

''تو پھر تم اس سے ملو اور ساری صورت حال اسے بتادو بلکہ وہ تو خود ہی اس صورتِ حال سے گزر چکا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ تمہیں اپنے ہاں رکھ لے۔''

''نہیں' مجھے اس کے پاس جاتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے وہ مجھے اچھا آدمی نہیں لگتا۔ کوئی اور ترکیب بتاؤ۔''

''اس کے بعد تو صرف یہی ایک ترکیب باقی رہ جاتی ہے کہ ملازمت چھوڑ دو اور میری تنخواہ میں گزر اوقات کرتی رہو لیکن پھر یہ شکایت مت کرنا کہ سارے خواب ادھورے رہ گئے۔ نہ معیار زندگی بلند ہوا اور نہ تم اچھی سی کار لے سکیں۔''

لزا کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ''اچھی بات ہے' ایلن میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گی۔''

❀......❀......❀

جارج نے لزا کو زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیش کش کردی جو لزا نے منظور کرلی اور وہ پہلا ادارہ چھوڑ کر اس کی کمپنی میں آگئی۔ ایلن خوش بلکہ متفخر تھا کہ اس کا مشورہ کامیاب ثابت ہوا تھا لیکن چند ہی روز بعد اسے احساس ہوا کہ ان کی زندگی میں تبدیلی آنے لگی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی بڑی اسمارٹ قسم کی عورت ہے۔ اگر وہ تیز طرار نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے اپنا دل نہ ہارتا لیکن وہ اتنی تیز طرار اور ذہین و فطین بھی نہیں تھی کہ چند ہی روز میں جارج کی نائب بن سکتی پھر جارج نے اسے اپنی اسسٹنٹ کیوں اور کیسے بنالیا تھا۔ یہ سوچ اس کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔

پھر جب لزا اکثر اپنے لیے نئے لباس لانے لگی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اب وہ ہر ہفتے بیوٹی پارلر سے بال بھی سیٹ کروانے لگی تھی۔ بعض اوقات تو وہ جدید ترین فیشن کے لباس میں کوئی دوسری شخصیت لگتی تھی۔

ایک شام وہ گھر آئی تو اپنے ساتھ سیاہ ساٹن کا بڑا خوب صورت لباس بھی لائی اور کہنے لگی۔ ''اس قسم کا لباس جارج کو بہت پسند ہے' وہ کہتا ہے کہ عورتوں کو ہمیشہ سوٹ نہیں پہننا چاہیے۔''

پھر لزا نے وہ لباس پہنا اور کسی ماڈل گرل کی طرح ایڑی پر گھومتے ہوئے ایلن سے پوچھا۔ ''یہ کیسا لگتا ہے؟''

''یہ جارج کی پسند ہے تو اسی سے پوچھو۔'' ایلن نے جل بھن کر جواب دیا۔

''تم تو خواہ مخواہ بگڑ رہے ہو۔ جارج چاہتا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ خوب صورت دکھائی دوں۔ کیا تم ایسا نہیں چاہتے۔''

''لیکن' یہ آفس کے لیے تو ہرگز موزوں نہیں۔'' ایلن زہر خند سے بولا۔ ''اگر تم یہ لباس پہن کر میرے دفتر میں کام کرنے آؤ تو میں ہمہ وقت تمہیں دیکھتا رہوں۔ نہ خود کام کرسکوں اور نہ تمہیں کام کرنے دوں۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو ایلن۔ جارج ایسا آدمی نہیں ہے۔''

''اچھا تو پھر وہ ایسے لباس کیوں پسند کرتا ہے؟''

''تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟'' لزا کے تیور بھی بدل گئے۔

''کچھ نہیں۔ اگر تمہیں ایسے لباس میں دفتر جانا اچھا لگتا ہے تو شوق سے جاؤ مگر میری رائے مت پوچھا کرو۔''

لزا کوئی جواب دیے بغیر بیڈروم میں چلی گئی۔ عام طور پر جب ان میں کوئی اختلافی بحث ہو جاتی تھی تو لزا ایسا نہیں کرتی تھی۔

❁......❁......❁

لزا کے رویے نے ایلن کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے لزا کو جارج سے ملنے کا مشورہ دیا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ اسے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے۔ وہ جارج سے ملنا اور اس کی بیوی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جارج کی بیوی بدشکل ہوگی اس لیے وہ دوسروں کی خوب صورت بیویوں پر ڈورے ڈالتا ہوگا۔ اتفاق سے اسے جارج سے ملنے اور اس کی بیوی کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔

جارج نے موسم بہار کی دعوت میں اپنے مؤکلین کے ساتھ ساتھ پورے اسٹاف کو بھی مدعو کیا تھا۔ ایلن بھی لزا کے ساتھ چلا گیا۔ اس کی توقع کے یکسر خلاف جارج کی بیوی سنڈی خاصی خوب صورت عورت تھی لیکن بہت سادہ مزاج۔ اس نے دعوت کے باوجود ہلکے گلابی رنگ کا سادہ لباس پہن رکھا تھا۔ دعوت کے دوران جارج زیادہ تر لزا کی طرف متوجہ رہا تو ایلن نے بھی سنڈی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔

اب تک ایلن اور لزا دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے۔ وہ دونوں ایک ریستوران میں آ جاتے۔ اکٹھے کھانا کھاتے اور پھر ایلن لزا کو اس کے دفتر چھوڑتا ہوا اپنے کام پر چلا جاتا مگر اب لزا دوپہر کے کھانے پر اکثر ناغہ کرنے لگی۔ وہ ایلن کو فون کر دیا کرتی کہ آج مصروفیت کے باعث کھانا کھانے نہیں آ سکے گی۔ ایلن کو یوں لگتا جیسے لزا روز بروز اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا ذہن طرح طرح کے خدشوں اور وسوسوں کی آماجگاہ بنتا جا رہا تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک روز لزا سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کمپنی میں بھی تمہارا استحصال ہو رہا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''جارج تمہیں کھانے کی چھٹی بھی نہیں دیتا۔''

''تم اسے استحصال سمجھتے ہو۔'' لزا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اب تک جارج جیسے مہربان و معاون مرد سے نہیں ملی۔ اس نے مجھے بڑی ذمے داریاں سونپ دی ہیں تاکہ میں اپنا کیریئر بنا سکوں۔''

''تمہارا کیریئر بنے نہ بنے لیکن اس کا وقت بہت اچھا کٹ رہا ہے۔''

''کیسی فضول باتیں کر رہے ہو تم۔ چلو اٹھو آج میں نے ایک نئی نائٹی خریدی ہے پہن کر دکھاؤں تمہیں؟''

''شکریہ، تم سو جاؤ۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔''

''تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے ایلن؟''

''وہی جو ہونا چاہیے۔ دیکھو لزا تمہارا بیشتر وقت اب ایک اور آدمی کے ساتھ گزرتا ہے جو تمہیں بتاتا ہے کہ تمہیں کس قسم کا لباس پہننا ہے، کہاں اور کس کے ساتھ لنچ کرنا ہے اور کس وقت

گھر جانا ہے۔ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے لزا؟''

''یہ تم نہیں تمہارے اندر کا حاسد مرد کہہ رہا ہے ایلن۔'' لزا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''میں حاسد نہیں۔ ایک چاہنے والا شوہر ہوں۔''

''تم پیار کرنے والے شوہر نہیں رہے بلکہ ایسی شکی بیوی کی مانند ہو گئے ہو جو شوہر کی ہر حرکت پر نظر رکھتی ہے کہ وہ کب جاتا ہے اور کب واپس آتا ہے۔ جو اس ٹوہ میں رہتی ہے کہ اس کا شوہر باہر کیا کرتا ہے جو اس کی جیبوں کی تلاشی لیتی ہے کہ ان میں کسی لڑکی کا خط تو نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی میری جیبوں کی تلاشی لیتے ہو گے۔''

''تم ایسی باتیں کر کے مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم اپنے شوہر سے زیادہ اس آدمی کو وقت دیتی ہو جس کے ساتھ کام کرتی ہو پھر ایسے حالات میں، میں کیا سمجھوں؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا اور جب تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں تو یہ گاڑی کیسے چل سکتی ہے؟'' یہ کہہ کر لزا پیر پٹختی ہوئی خواب گاہ میں چلی گئی۔

ایلن اٹھ کر کچن میں آ گیا اور تلخ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اسے ان حالات سے سمجھوتا کر کے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب لزا خود ہی یہ اعلان کر دے کہ اب ایک دوسرے کے ساتھ ان کا گزارا نہیں ہو سکتا اور وہ اسے چھوڑ کر جارج کے پاس جا رہی ہے۔

ایلن انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ لزا بھی کچن میں آ گئی اور بولی۔ ''ایلن، کل دوپہر کا کھانا ہم ایک ساتھ کھائیں گے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہمیں آپس میں نہیں جھگڑنا چاہیے۔''

''ہاں، ہاں، تمہارے لیے یہ کہنا کوئی مشکل نہیں۔''

''کیا کہنا مشکل نہیں؟'' لزا کو غصہ آ گیا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اس سے زیادہ اہم کون سی بات ہو سکتی ہے؟''

ایلن نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی انجانا جذبہ اس پر غالب آتا جا رہا ہے۔ ایسا جذبہ جو اس کے دل میں لزا کے خلاف نفرت کاشت کر رہا ہے۔ اس لیے کہ لزا کسی دوسرے مرد کے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ جسے وہ زیادہ وقت دیتی ہے، مانا کہ وہ دفتر میں بزنس کی باتیں کرتے ہوں گے لیکن ان کے درمیان قربت تو بہرحال ہوتی ہے نا۔

لزا اب تک اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ہاں تو کل تم میرے ساتھ لنچ کر رہے ہو نا؟''

''نہیں، کل مجھے بورڈ کی میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔''

''پرسوں۔''

''کہہ نہیں سکتا۔ اس وقت میرے پاس ڈائری نہیں ہے ممکن ہے پرسوں بھی مجھے کوئی مصروفیت ہو۔''

''ٹھیک ہے جب فرصت ہو مجھے بتا دینا۔'' یہ کہہ کر لزا نے ہاتھ منہ دھویا اور خواب گاہ میں چلی گئی۔

❁......❁......❁

آئندہ چند روز ان کے درمیان بہ مشکل گفتگو ہوئی۔ ناشتے کی میز پر ایلن اخبار کے مطالعے میں

غرق رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے لزا کو یہ بتا دیا ہے کہ وہ اس صورت حال کو کیسے محسوس کرتا ہے۔ اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کیا اقدام کرتی ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لزا اس وقت ہی اقدام کر چکی تھی جب اس نے اسے ایک ساتھ لنچ کرنے کے لیے کہا تھا۔

بیتے ہوئے اچھے ایام میں وہ دوپہر کے بعد ایک دوسرے سے فون پر بات کیا کرتے تھے اور یہ طے کر لیتے تھے کہ دفتر کے بعد انہیں کب اور کہاں ملنا ہے۔ جب سے جارج نے لزا کو اپنا اسسٹنٹ بنایا تھا' یہ ٹیلی فونی رابطہ بے ربط ہو گیا تھا۔ ایلن جب بھی فون کرتا پتا چلتا کہ وہ جارج کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے یا میٹنگ میں مصروف ہے۔ اس کے بعد کئی گھنٹے گزر جاتے مگر لزا کا فون نہ آتا' پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اب جب وہ گھر پر ایک دوسرے سے ملتے تو ایلن کا لہجہ بے حد طنزیہ ہو جاتا۔

ادھر لزا کو حیرت ہوتی تھی کہ پہلے تو خود ایلن نے اسے جارج کے پاس بھیجا اور حوصلہ افزائی کی تھی پھر اب وہ اتنا برہم اور پریشان کیوں ہے؟ وہ پہلے جس ادارے میں کام کرتی تھی' وہاں کے متعدد مرد کارکن اس کے دوست تھے۔ ایلن نے پر تو بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا' پھر جارج پر کیوں معترض تھا؟

لزا کو اس بات پر افسوس تھا کہ اس نے ایلن کو حاسد کہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایلن نے یہ باتیں حسد کے تحت نہیں کی تھیں۔ شاید وہ اس بات پر ناخوش تھا کہ وہ مالی طور پر اس کی محتاج کیوں نہیں رہی۔ عام مردوں کی طرح وہ بھی اسے خود کفیل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

ایک روز جارج کے ساتھ ایک میٹنگ کے دوران لزا کو محسوس ہوا کہ وہ کئی دنوں سے کوئی کام کرنے کی بجائے صرف ایلن کے بارے میں سوچتی رہی ہے۔ وہ اتنا الگ تھلگ اور پریشان پریشان کیوں رہتا ہے؟ اس نے کتابیں پڑھنا اور موسیقی سے لطف اندوز ہونا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اسے رہ رہ کر یہ خیال آتا کہ گزشتہ چند سال انہوں نے کتنے پیار سے گزارے تھے لیکن اب ان کے درمیان تلخیاں کیوں پیدا ہو گئی ہیں؟

جارج نے اسے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر کہا۔ ''تم سن رہی ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں ہاں میں سن رہی ہوں۔'' لزا نے جواب دیا حالانکہ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر سے کیا کہہ رہا ہے۔

''میں اپنی آفس منیجر سے تنگ آ گیا ہوں۔'' جارج نے پھر بات شروع کی۔ ''میں اسے برخواست کرنا چاہتا ہوں...... لیکن جانتی ہو وہ کیا کرے گی؟''

لزا اس وقت کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ایلن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے لزا۔''

''کیا؟''

''اس کا مطلب ہے کہ تم میری طرف متوجہ نہیں' میں اپنی آفس منیجر ایلس کو ملازمت سے جواب دینا چاہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ میرے اس اقدام پر مقدمہ دائر کر دے گی۔''

''کیوں؟''

''اسے اپنی حق تلفی سمجھے گی۔ وہ عورت ہے۔ سب کو اسی سے ہمدردی ہو گی۔''

''ہوں۔'' لزا نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک دم اٹھتے ہوئے بولی۔ ''آج میں جلدی گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''آج چار بجے گرین سے میٹنگ ہونے والی تھی۔ اس کا کیا ہو گا؟''

''وہ میٹنگ گرین نے منسوخ کر دی ہے اور مجھے دوسرا کوئی اہم کام نہیں لہٰذا میں گھر جا رہی ہوں۔''

''لیکن میں سات بجے سنڈی سے نہیں ملنا چاہتا۔''

''میرے گھر جانے سے اس بات کا کیا تعلق ہے؟''

''عام طور پر تم دیر سے جاتی ہو نا۔''

''تم جانتے ہو کہ میں پہلی ملازمت کی بہ نسبت یہاں زیادہ وقت دیتی اور دیر سے گھر جاتی رہی ہوں لیکن اب میں جلدی جانا اور رات کے کھانے کے بعد کوئی کام کرنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم پر اس پروگرام سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

لزا کی اس بات پر جارج کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پھر اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں' ہاں بالکل۔'' وہ اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

لزا اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے میز پر پھیلے کاغذات سمیٹے اور ایلن کو فون کرنے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ ایلن کا کوئی نامناسب مطالبہ تسلیم نہیں کرے گی۔ وہ اپنی ذاتی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دے گی اور نہ ہی ایلن کی کوئی بچکانہ حرکت یا طنز برداشت کرے گی لیکن جونہی ایلن نے ہیلو کہا وہ اپنے فیصلوں کی فہرست بھول گئی اور بولی۔ ''میں تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں گھر جا رہی ہوں۔ اگر تم چاہو تو راستے میں مجھے لفٹ دے سکتے ہو۔''

ایلن نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ باقی وقت وہ کس طرح گزارے گا؟ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آ سکا کہ لزا اتنی جلدی گھر کیوں جا رہی ہے اور اسے کیوں بلا رہی ہے۔ ایلن کی طرف سے فوری جواب نہ پا کر لزا نے کہا۔ ''اس قدر سوچ بچار کی ضرورت نہیں ایلن۔ میں تو بس تم سے ملنا' تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

''میں کبھی یہ تسلیم نہیں کروں گی کہ میں غلطی پر تھی۔ لزا نے جاتے جاتے سوچا۔ ''اور اگر اسے میری پروا نہیں تو میں بھی اس کی پروا نہیں کروں گی۔'' ایسی ہی سوچوں کی یلغار میں گھری وہ ایک فون بوتھ کے پاس رک گئی اور ایلن کو فون کی خواہش دل سے نہ نکال سکی۔ اس نے بوتھ میں داخل ہو کر اس کا نمبر گھمایا کچھ دیر فون کی گھنٹی بجتی رہی پھر کسی کی آواز آئی۔ ''ہیلو۔''

''میں ایلن سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' لزا نے کہا۔

''وہ تو گھر جا چکا ہے لیڈی۔''

''اتنا سنتے ہی لزا نے فون بند کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ اتر آئی۔ اس نے فون بوتھ سے برآمد ہوتے ہوئے خود کلامی کی۔ ''مختلف سمتوں کو جانے والے مسافروں کی واپسی شروع ہو گئی ہے۔''

○

زندہ لاش

ڈاکٹر وجاہت علی خان

انسان کی زندگی محبت اور نفرت کے جذبے سے عبارت ہے دنیا میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو یہ دعویٰ کرسکے کہ اس نے کبھی کسی سے محبت یا نفرت نہ کی ہو دونوں ہی جذبے اگر سر چڑھ کر بولیں تو انسان انسانیت کے دائرہ سے باہر ہوجاتا ہے۔

نفرت کے جذبوں سے گندھی ایک انوکھی داستان؛ جسے آپ فراموش نہیں کرسکیں گے

رات کی سیاہی لبادہ اوڑھے ہرسمت پھیلتی جارہی تھی۔ ہزاروں ستارے ان گنت دیکھتی آنکھوں کی طرح سوتی دنیا کو منور کررہے تھے۔ دور تک کھیت تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے تھے۔ یہ ایک مکمل تاریک رات تھی۔ ایک انسان کے لیے آخری رات جو اس رات آخری مرتبہ سانس لے رہا تھا۔ مینسن کی زندگی کی یہ آخری رات تھی۔ آج رات کا کچھ حصہ اس سیاہ آنکھوں والی حسین لڑکی کے ساتھ گزارا تھا اب وہ بڑی خوش دلی سے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ بڑی سہانی رات تھی۔ اس کی رہائش یہاں سے ذرا ہی فاصلے پر تھی اب اس کے قدم ویران راستے کی طرف موڑ دیے تھے۔ اس کے گھر تک کا راستہ قطعی ویران تھا صرف کھیت تھے اور اس کے درمیان پتلی سی ایک پگڈنڈی جو بل کھاتے سانپ کی طرح دور تک چلی گئی تھی۔

موج میں وہ اس بات سے ناواقف تھا کہ ایک شخص کی درندگی اس کے لیے بیدار ہوچکی ہے۔ ایک سادہ انسان جو کسی کے معاملات میں داخل اندازی نہیں کرتا تھا اس وقت مینسن کے لیے مکمل طور پر ایک درندہ صفت بن چکا تھا۔ ایک آدمی کا ذہن محبت میں صحیح طرح کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور خاص کر رقابت میں تو وہ ہر بات ہی بھول جاتا ہے۔ اس کی روح

نفرت اور اس نفرت میں وہ کسی کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتا اور خاص کر جب اس کی خواہش پوری ہونے والی ہو اور یہی سب رٹ لینڈ کے ساتھ ہوا تھا۔ رٹ لینڈ لمبے قد اور پرسکون چہرے والا نوجوان تھا لیکن جذبات کا غلبہ طاری ہوتے ہی وہ انسان سے درندہ بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ اور شیطان دونوں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ وہ پگڈنڈی کے ایک طرف جھاڑی میں پوری طرح دبک چکا تھا۔ جس پر مینسن آنے والا تھا آخری مرتبہ وہ مینسن کا اس طرح انتظار کررہا تھا جس طرح ایک درندہ اپنے شکار کی تاک میں ہوتا ہے۔ بھوکا اور بے چین رٹ لینڈ غصے میں بار بار ہاتھوں کی ہتھیلیاں رگڑ رہا تھا۔ چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں آنکھوں میں ہوا چمک تھی۔ اس کے کان ہر معمولی آواز کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد مینسن ہمیشہ کے لیے اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ یک بارگی دور تاریکی میں سیٹی کی آواز گونجی جو آہستہ آہستہ قریب آتی جارہی تھی۔ رٹ لینڈ کا جسم تن گیا ایک لمحہ گزر گیا کچھ ہی دیر بعد قدموں کی بازگشت فضا میں گونجنے لگی یہ یقیناً مینسن تھا رٹ لینڈ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں جن میں ایک چاقو دبا ہوا تھا سختی سے بھینچ گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد تاریکی میں ایک

پگڈنڈی پر چڑھا رٹ لینڈ کو اس کا سایہ اپنے قدموں میں محسوس ہوا۔ سایہ ایک لمحے کے لیے رکا باہر کی جیب میں شاید وہ کچھ ٹٹول رہا تھا اور کچھ ہی دیر بعد اس نے اپنا پائپ نکال کر تمباکو بھرنا شروع کردیا اور پھر ننھے سے شعلے نے اس کا چہرہ روشن کردیا تھا۔ یعنی وہ واقعی مینسن تھا۔ رٹ لینڈ کا مطلوبہ شکار ستاروں کی طرف دیکھ کر اس نے ایک کش لیا تمباکو کی خوش بو تمام ہوا میں بس گئی۔ رٹ لینڈ کی بھنویں غصے سے تن گئیں۔ ”پیو میرے دوست یہ تمہارا آخری موقع ہے شاید پھر کبھی نصیب نہ ہو۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ مینسن اپنے انجام سے بے خبر آگے بڑھتا چلا آرہا تھا لیکن قریب کی جھاڑیوں میں جیسے ہی تیز قسم کی سرسراہٹ ہوئی تو وہ رکنے پر مجبور ہوگیا۔ اچانک ایک بھیانک آدمی جھاڑیوں سے نمودار ہوا اور اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز نے مینسن کے اوسان خطا کردیے تھے۔ وہ اسے ایک بڑے بن مانس کی مانند لگا۔ لمبے لمبے ہاتھ اور تنا ہوا سینہ تاریکی میں چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن سفید سفید دانت چمک رہے تھے۔ مینسن کو خون اپنے جسم میں منجمد ہوتا محسوس ہوا لیکن وہ اپنا خوف اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا اس کی آواز صاف تھی اور اطمینان ظاہر کررہی تھی اس نے سایہ کی طرف ہمت کرکے چند قدم بڑھائے اور پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ تمہیں میری جان لے کر کیا ملے گا؟“ مینسن کو اس کی شکل تو نظر آرہی تھی لیکن اس نے سخت قسم کی نفرت اپنے گرد محسوس کی۔

”تم نے یہ پوچھ کر اچھا کیا میرے دوست!“ میں تمہاری روح تمہارے جسم سے نکال کر شیطان کے حوالے کردوں گا۔“ اس نے ایک شیطانی قہقہہ

”لیکن تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تمہاری اس غضب ناکی کا سبب کیا ہے؟“ سایہ کے دانت تاریکی میں غائب ہوگئے تھے۔

”تم نے مجھ سے میری محبوبہ کو چھین لیا ہے۔ جسے میں عمر بھر سے چاہتا ہوں اور وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اور اب تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں نے تمہارا کیا کیا ہے؟“ اس کی آواز سے نفرت کا شدید عنصر نمایاں تھا۔ اب مینسن یہ سمجھا کہ یہ شخص یقیناً پاگل ہے اور اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کو اپنی جان کی فکر تھی۔ اس لیے مخبوط الحواس شخص پر یہ بات واضح کرنی چاہی کہ وہ غلطی پر ہے۔ وہ حوصلہ پیدا کرکے بولا۔

”میں تمہیں جانتا تک نہیں ہوں اور تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں نے تمہاری محبوبہ کو تم سے چھینا ہے یہ صرف تمہاری غلط فہمی ہے میں اتنا غیر مہذب نہیں ہوں۔“

”جھوٹ مت بولو۔ جھوٹ تمہاری جان نہیں بچا سکے گا۔ آج رات بھی تم اس کے ہمراہ تھے۔“

”کون؟“ اس کی آواز سے حیرت نمایاں تھی۔

”لورین پیٹرز۔“

”لو! تو یہ بات تھی۔“ اب مینسن کی سمجھ میں ساری بات آچکی تھی رات کو جس لڑکی سے اس کے دوستانہ مراسم قائم ہوئے اسی کا نام لورین پیٹرز تھا اور مخبوط الحواس شخص اس کا پرانا چاہنے والا۔ وہ اسے مینسن کے ساتھ دیکھ کر غضب ناک ہوگیا ہوگا اور پہلے سے اس کی گھات میں یہاں آچھپا تھا۔ مینسن کو اس بات نے شدید صدمہ پہنچایا کہ وہ لڑکی اس کی تمام مشکل کا سبب ہے۔ اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

”تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے میرے اور لورین

تعارف آج رات کو ہی ہوا ہے اور مجھے یہ قوی یقین ہے کہ وہ مجھے بالکل نہیں چاہتی۔"

"وہ تمہیں ضرور پسند کرنے لگی ہے۔ ورنہ وہ تم سے اس طرح ہنس ہنس کر گفتگو نہ کرتی۔ لیکن میں تمہیں اسے اپنانے نہیں دوں گا سمجھے۔" اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ مینسن کا ذہن اب بالکل ماؤف ہو چکا تھا اور دوسری طرف صورت حال مزید بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ حوصلہ کر کے پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"میرے بھائی! تم یقیناً غلطی پر ہو وہ مجھے ذرا بھی نہیں چاہتی۔" قوی الجثہ شخص ایک قدم آگے بڑھا۔

"مذاق میں مت ٹالو۔ آج کے بعد شاید تم دوبارہ اسے کبھی نہ دیکھ سکو۔" مینسن نے جب اس کے ہاتھ میں دبا ہوا چمک دار خنجر دیکھا تو اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ مینسن کی طرف بڑھا یکبارگی چاقو اس کے سر کے اوپر سے بجلی کی سی تیزی سے نکلا۔ مینسن نے گھبرا کر اپنے چلنے کی چھڑی تیزی سے گھمائی۔ چھڑی اس کے ہاتھ پر پوری قوت سے پڑی اور چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ چوٹ کافی شدید تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اپنی کلائی دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے دبالی۔ مینسن نے موقع مناسب سمجھا اور بھاگ نکلا۔ ابھی وہ صرف چند قدم ہی بھاگا تھا کہ ایک فولادی شکنجے نے اس کا بازو جکڑ لیا اور پلک جھپکتے میں زمین پر دے مارا۔ مینسن کے حلق سے خوف ناک اور تکلیف کی آواز ایک زوردار کراہ کی شکل میں نکلی تھی۔ رٹ لینڈ کے مضبوط ہاتھ اب اس کے گلے پر تھے۔ بھرپور طاقت کے ساتھ مینسن نے اسے دھکیلا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ دونوں کے منہ سے غراہٹ نما آوازیں نکل رہی تھیں۔ چھڑی کی چوٹ نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا اور اس وقت اس میں پہلے سے کہیں زیادہ طاقت عود آئی تھی۔ مینسن کمزور پڑتا جا رہا تھا وہ سر سے پیر تک پسینے میں شرابور تھا آنکھیں دھندلائی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف حملہ آور کا غصہ اور طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ مینسن کی کوشش یہ تھی کہ وہ گلے کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں سے بچے اس نے جسم کی ساری قوت جمع کر کے آخری مرتبہ خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی اس نے اپنا گھٹنا اوپر کیا اور رانوں کے اوپری حصے پر زور سے مارا۔ قوی الجثہ شخص کے منہ سے ایک کریہہ دھاڑ نکلی تھی اور مینسن دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ابھی وہ اپنے قدموں پر بہ مشکل ہی کھڑا ہو پایا تھا کہ اس نے اپنے سر پر ایک شدید جھٹکا محسوس کیا اور وہ دوبارہ زمین پر تھا۔

اس نے اپنے پیروں کی طرف مایوسانہ انداز میں دیکھا اس کی چھڑی سانپ کی طرح اس کے قدموں میں پھنسی ہوئی تھی۔ زمین پر اس کا سر کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو رٹ لینڈ اس کے سر پر سوار تھا۔ اس نے جو منظر دیکھا اس کے جسم میں لرزہ طاری ہو گیا اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن جواب دے چکا تھا۔ اس نے ہلنے کی کوشش کی لیکن بے سود وہ ذرا بھی نہ ہل سکا۔ بولنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئے۔ موت اس کے سر پر کھڑی تھی۔ وہ مرنے سے خوف زدہ نہ تھا بلکہ وہ اپنی موت کا بدلہ لینے کا خواہش مند تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے محسوس ہونے لگا کہ جیسے اس کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ ایک مدہوش کن کیفیت اس پر غالب آ گئی اور وہ خود کو اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ تمام درد اور تکلیف دور ہو گئی اسے ایک بڑی خواہش پوری ہونے کی امید تھی۔ رٹ لینڈ اس کے اوپر کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک

بہت بڑا پتھر تھا اس نے پتھر سر سے بلند کیا اور مینسن کے سر پر دے مارا۔ مینسن کی آخری چیخ فضا میں ابھری تھی۔

رٹ لینڈ اپنا کام کر چکا تھا۔ یعنی مینسن مر چکا تھا۔ اس کی راہ کا پتھر مینسن مر چکا تھا۔ وہ لاش پر جھکا اور اس لمحے خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں سرائیت کر گئی۔ وہ جھکا ہوا اس بے جان جسم کو ٹکٹکی لگائے گھور رہا تھا۔ وہ خود کو نڈھال اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ اچانک رات سرد ہونے لگی یا پھر وہ خوف کی شدید لہر تھی۔ جس نے اس کے اعضا کو شل کر دیا تھا وہ ایک انجانا سا خوف محسوس کر رہا تھا اور زندگی سے خوف زدہ تھا ایک جھٹکے سے خود کو اٹھایا اچانک لاش کو چھپانے کی تدبیر اس کے ذہن میں آئی ورنہ وہ تو خوف کے باعث بھاگنے والا تھا۔ اب وہ اپنے جرم کے تمام نشانات مٹا دینا چاہتا تھا۔ کوئی دو گز کے فاصلے پر جھاڑیاں بہت گھنی اگی ہوئی تھیں اور پگڈنڈی سے قطعی ہٹ کر بھی؛ یہ وسط رات کا وقت تھا۔ پہلے اس نے وہ پتھر اٹھا کر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے جو لاش کا منظر دیکھا اس کا معدہ منہ میں آ گیا۔

سر درمیان سے چیخ گیا تھا اور ایک بھورے رنگ کا گاڑھا سا سیال مادہ اس سے بہہ رہا تھا۔ چہرہ تر بتر خون میں تیر رہا تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی اسے گھور رہی تھیں۔ وہ اسے جھک کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن ایک پر اسرار قوت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک خوف ناک مسکراہٹ، موت کی ہنسی، تاریکی میں گھبرا کر کسی چیز سے ٹکرایا اور گرتے گرتے بچا بھاگ نکلنے کا جذبہ اس کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا لیکن اس نے ہمت کر کے اپنے حواس کو قابو میں کیا اب خود کو بچانے کے لیے مینسن کا مردہ جسم چھپانا اس کے لیے نہایت ضروری تھا۔ مینسن کی بے جان ٹانگوں کو

حنا، وینا، ثناء......کراچی

مکان و لامکاں میں لائق حمد و ثنا تو ہے
فقط ہے بندگی تیری، جہانوں کا خدا تو ہے
اندھیرے میں اُجالے میں ہے جو بھی، دیکھتا تو ہے
تصور میں نہیں آتا تصور سے ورا تو ہے

دانش نیازی......مظفر آباد

کتنے نادان تھے طوفاں کو کنارہ سمجھا
کتنے بے جان شہروں کو سہارا سمجھا
کتنے کم ظرف تھے وہ لوگ جو ساحل پہ تھے
ہمیں ڈوبتا دیکھا اور نظارہ سمجھا

ہاتھوں میں تھامے لاش کو گھسیٹتا ہوا جھاڑیوں کے جمگھٹ میں غائب ہو گیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایک گڑھا نظر آیا لاش چھپانے کے لیے یقیناً ایک بہتر جگہ ہو گی یہ خیال اس کے ذہن میں گونجا اور وہ تیزی سے اس طرف بڑھا قریب جا کر دیکھنے پر واقعی ایک بہترین جگہ کو پا کر اسے کچھ سکون سا ملا۔ اب یقیناً اپنے جرم کی پردہ پوشی کرے گا لاش گھسیٹتا ہوا گڑھے کے نزدیک لایا اور ایک جھٹکے سے لاش کو گڑھے میں گرا دیا۔ ابھی وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ اسے چکر سا آیا اور لڑکھڑا گیا۔ اسے تاریکی میں ہر سو مینسن کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک خوف ناک مسکراہٹ۔ اسے ایسا لگا جیسے کہ وہ سایہ فضا میں ڈول رہا ہو اور چمکتی آنکھیں اسے قہر آلود انداز سے تک رہی ہوں۔ پسینہ سر سے پیر تک اس کے جسم کو تر کر چکا تھا۔

گھاٹی سے اوپر کی طرف وہ نہایت تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ اس کے پیر گھانس میں دھنستے جا رہے تھے۔ دور ہوتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر ٹھہر کر گڑھے کی جانب دیکھا اس کے دہشت ناک اور درندہ صفت فعل کے تمام نشانات غائب ہو چکے

تھے۔ اطمینان کا سانس لیتا ہوا وہ جھاڑیوں سے نکلا اور تیزی سے پگڈنڈی پر آ گیا۔ اچانک اسے ایسا لگا کہ جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ ایک سایہ سا اسے اپنے عقب میں محسوس ہوا ایک لمحے کے لیے وہ پیچھے مڑا لیکن کچھ نہ تھا۔ وہ کاندھے جھٹک کر پھر آگے بڑھا لیکن اسے پھر یہ محسوس ہوا جیسے اب بھی کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اپنے قدموں کی آواز بھی اسے ایسی لگ رہی تھی جیسے کہ مینسن لکڑی ٹیک کر چل رہا ہو۔ ہوا کی بھائیں بھائیں لاتعداد چیختے بھوتوں کی طرح اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جتنا وہ تیز چلنے کی کوشش کرتا آوازیں اتنی ہی بڑھ جاتیں۔

"اومیرے خدا۔" وہ ایک دم ٹھٹکا گیا۔ چھڑی کو وہ بالکل ہی بھول گیا تھا۔ وہ کہاں تھی؟ وہ ٹھہر گیا۔ اب بہتری اسی میں تھی کہ وہ دوبارہ واپس جائے اور چھڑی کو تلاش کرے وہ کسی اور کو مل گئی تو؟ اس نے مڑ کر دیکھا۔ روح میں سرایت کر جانے والی سیاہی اس کا سامنا کر رہی تھی۔ واپس جانے کے تصور نے ہی اسے لرزہ کر رکھ دیا تھا۔ وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔ ایک دم اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس وقت تو اسے واپس چلا جانا چاہیے اور کل جب وہ خود کو پرسکون محسوس کرنے لگے گا تو آ کر چھڑی تلاش کرے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے پگڈنڈی پر تیزی سے قدم بڑھانا شروع کر دیے۔ پگڈنڈی کے ختم ہونے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا رات کافی بیت چکی تھی اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ کیا وہ لڑکی جس کے لیے وہ جان کی بازی لگا چکا تھا اسے اپنائے گی؟ کیا وہ دوبارہ اس کے دل میں وہی مقام حاصل کر سکے گا؟ یقیناً اب اس کی راہ میں کوئی نہ تھا اور لورین اس کی تھی ہمیشہ کے لیے صرف اس کی اپنی۔

●☆......☆●

لورین کی آنکھ لگے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

"مل؟" لورین نے اس کا بستر خالی پا کر آواز دی۔

"میں یہاں ہوں ڈارلنگ۔" اس کی آواز کھڑکی کے پاس سے آئی۔

"اوہ میں سمجھی کہ تم اس وقت بھی باہر نکل چکے ہو۔ مل! کیا کل رات تم آرام سے سوئے تھے؟"

"ہاں بالکل۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کچھ دیر کے لیے نیند نہ آئی تھی۔ اس لیے میں باہر تک چلا گیا تھا تم بالکل نہ گھبراؤ میں قطعی پریشان نہیں ہوں۔" وہ بستر سے اتری اور اس کے پاس کھڑکی میں آ گئی۔ اس نے مل کے کاندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"مل! میں تمہاری طرف سے پریشان ہوں۔ بیشتر راتیں تم بے چینی سے گزارتے ہو۔ تم کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں ہو آخر تم ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے۔ شاید وہ ہی تمہیں سونے کے لیے کوئی دوا وغیرہ دے سکے۔"

"میں بالکل درست ہوں۔ تم فکر مند نہ ہو۔" اس نے لورین کا ہاتھ پیار سے دباتے ہوئے کہا۔

لورین کافی دنوں سے یہ بات محسوس کر رہی تھی کہ اس کا شوہر رٹ لینڈ کچھ پریشان سا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی ایسی خلش ضرور موجود تھی۔ جو وہ اس سے پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔ ان کی شادی کو تین ماہ سے زیادہ گزر چکے تھے لیکن رٹ لینڈ نے لورین کو اب تک یہ بات نہ بتائی تھی کہ وہ کیا بات ہے جو اس قدر پریشان کیے ہوئے ہے اکثر راتوں کو وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا۔ کبھی وہ سوتے میں اچانک چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا اور کبھی نہایت خوف زدہ کھڑکی میں کھڑا نظر آتا اور اکثر راتوں کو اس کا بستر خالی ہوتا۔ کبھی وہ سر سے پیر تک پسینے میں شرابور دکھائی دیتا۔ راتوں کو شاذ و نادر ہی یہ نہ ہوتا یہ وہ تمام حرکتیں تھیں جنہیں وہ کافی دنوں سے دیکھ رہی تھی لیکن کسی حتمی نتیجے پر پہنچ نہ پائی تھی۔ اسی سلسلے میں اس نے شہر کے ایک ماہر نفسیات سے اس کا معائنہ بھی کرایا تھا جس نے کئی دنوں تک اس کی حرکات کا بغور جائزہ لینے کے بعد اسے یہ بتایا کہ اس کے ساتھ یقیناً کوئی بھیانک واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ جس نے اس کا ذہن معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ کل ہی رخصت ہوا تھا اور رخصت ہوتے وقت ایک ہفتے کی حرکات کا اس نے بغور جائزہ لینے اور انہیں نوٹ کر لینے کی تاکید کی تھی تاکہ وہ علاج کو مزید آگے بڑھا سکے۔ رٹ لینڈ کو ہمیشہ ایک ہی جیسا خواب نظر آتا مینسن کی حسرت و یاس میں ڈوبی آنکھیں اور زہر آلود مسکراہٹ جس میں انتقام کے شعلوں کی گہری چمک تھی۔ ناشتے سے قبل صبح کی چہل قدمی اس کا معمول بن چکی تھی دن کی روشنی سے اسے عشق تھا جب وہ واپس لوٹتا وہ رات بھر کا خوف اس کے ذہن سے محو ہو چکا ہوتا۔

"میں باہر جا رہا ہوں لوری! جلدی لوٹ آؤں گا۔" سیڑھیوں کے سرے پر اس نے لوری کی آواز سنی جو اسے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا کہہ رہی تھی۔

سورج کی تمازت میں وہ کچھ ذہنی سکون محسوس کرتا۔ تکتی ہوئی آنکھیں غائب ہو جاتیں اور آسمان پر وہ بغیر کسی خوف کے دیکھتا وہ خود کو ہوش مند سمجھتا لیکن اسے جلد ہی محسوس ہوتا جیسے کچھ ہونے والا ہے وہ کیا بات تھی؟ جس نے اسے اس قدر خوف زدہ کیا ہوا تھا؟ مینسن جو کہ یقیناً مر چکا تھا لیکن اکثر وہ اچانک اس کی موجودی محسوس کرتا۔ دن جتنے اطمینان اور سکون سے گزرتا راتیں اسی قدر دہشت اور خوف کے عالم میں گزرتی۔ تین ماہ قبل جب اس نے مینسن کو قتل کیا تھا تو اخبارات نے اس کی اچانک گمشدگی کی خبر تو شائع کی تھی لیکن اس کا جسم یا لاش ہنوز لاپتا تھی۔

"اگر مینسن مرا نہ ہو تو؟" یہ خیال رٹ لینڈ کے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے کوندا گیا۔

"نہیں ناممکن۔" وہ زندہ نہیں بچ سکا ہوگا۔ مینسن کے جسم کی مردہ تصویر یا خاکہ جو اس کے ذہن میں محفوظ تھا اس سے اسے یہ قطعی امید تھی کہ وہ ضرور مر چکا ہے اور ان تمام باتوں کے باوجود اگر وہ زندہ ہوا تو؟ وہ کہاں ہے؟ یہ سوالات اس وقت رٹ لینڈ کے ذہن میں بازگشت کر رہے تھے کہ مجھے مینسن کی لاش ضرور دیکھنی چاہیے اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے قدم کھلے میدان کی طرف موڑ دیے اس کی رفتار کافی تیز تھی اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی ان دیکھی پراسرار قوت اسے دھکیل رہی ہو کچھ دیر بعد وہ اسی پگڈنڈی پر تھا۔

سورج کی روشنی درختوں کے پتوں سے چھن کر آ رہی تھی۔ پگڈنڈی پر قدم رکھتے ہی اسے کپکپی سی چڑھنے لگی یہ وہی پگڈنڈی تھی جس کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے دور تک بل کھاتے ہوئے ناگ کی طرح چلی گئی تھی۔ اس کے دونوں اطراف میں اونچی اونچی گنجان جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ہر قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

تین ماہ کے عرصے میں اس کی لاش کیسی ہو گئی ہو گی؟ ایک مردہ گلے ہوئے جسم کو دیکھنے کے منظر کے تصور سے اسے موت کے ٹھنڈے پسینے آنے لگے وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن کوئی قوت اسے کھڈ کی طرف دھکیل رہی تھی۔ پگڈنڈی پار کر کے وہ ایک لمحے کے لیے رکا کانپتی انگلیوں سے اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک کش لینے کے بعد جھاڑیوں میں گھسا کچھ ہی

فاصلے پر اس کی مطلوبہ جگہ تھی۔ زمین پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ لیکن گڑھے کے آس پاس جھاڑیاں کافی بلند تھیں اب وہ گڑھے کے بالکل نزدیک تھا اس نے جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹایا۔ گڑھے کا کنارہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک دم خوف زدہ ہوگیا۔ مینسن کا سایہ اسے اپنے سر کے اوپر ہوا میں لہراتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اسے اردگرد کے ماحول میں مینسن کی گہری سانسوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ پھر اسے یہ خیال آیا اس گھاٹی میں ایک مردہ انسان پڑا ہوا ہے۔ جسے وہ ہلاک کرچکا ہے۔ پھر وہ اس مردہ جسم سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہے؟ جیسے ہی یہ باتیں اس کے ذہن میں آئیں وہ پسینے میں شرابور ہوگیا۔ اسے ایسا لگا جیسے مینسن کھڑا اسے خونی نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ وہ بھاگ نکلنا چاہتا تھا لیکن ہمت کر کے دوبارہ اس طرف بڑھا۔ لکڑیوں کے چھوٹے سے ڈھیر نے اس مقام کی تصدیق کردی تھی جہاں مینسن مردہ پڑا تھا رٹ لینڈ خود کو بیمار اور تھکا محسوس کر رہا تھا لیکن آج وہ مینسن کا مردہ جسم ضرور دیکھ کر جائے گا کیونکہ وہ اپنی مزید ایک رات خوف وہراس کے عالم میں گزارنا نہیں چاہتا تھا۔

آہستگی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے جھک کر جھاڑیاں ایک طرف ہٹانی شروع کردیں۔ جب جھاڑیاں صاف ہوگئیں تو وہ ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہوگیا۔ پھر اس نے تمام تر قوت صرف کر کے کھائی میں دیکھا۔ کھائی میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے دل کی دھڑکن بند کردینے کے لیے کافی تھا۔ مینسن سیاہ غضب ناک آنکھوں سے گھورتا اس پر ہنس رہا تھا اس کا سر درمیان سے چرا ہوا تھا اور اس میں لاتعداد سیاہ چمک دار چیونٹے گھسے ہوئے تھے آنکھوں کے بجائے سیاہ دھبے تھے جو چیونٹوں کے یکجا ہونے کی وجہ سے بنے تھے۔ حلقوں سے چیونٹے نکل کر اندر باہر آجا رہے تھے۔ مینسن کے کراہیت آمیز دانت اسے مسکراتے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ ایک دم لڑکھڑا کر گھاس پر گر پڑا وہ باتیں جن کا تصور ہی اسے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھیں اور ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن اور دل ودماغ پر چھا گئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرانی سے خلاء میں گھورنے لگا جیسے ایک خبط الحواس دیوانہ ٹکٹکی لگائے خلاؤں میں گھورا کرتا ہے۔

اس کراہیت آمیز خوفناک منظر سے اس کا جی متلا گیا تھا۔ یکایک اس نے اپنے ہاتھوں کے نیچے گھاس میں کچھ حرکت محسوس کی اس نے جب گردوپیش میں نگاہ دوڑائی تو خوف کے مارے اس کے جسم میں پسینہ آ گیا۔ سیاہ چیونٹوں کی ایک قطار اس کے جوتے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے خوف زدگی کے عالم میں دیکھا کہ وہ لکڑیوں کے ڈھیر سے برآمد ہو رہے تھے۔ ان کے قریب مینسن کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ آس پاس میں کافی بدبو پھیلی ہوئی تھی جو یقیناً لاش کے سڑ جانے کی وجہ سے تھی۔ رٹ لینڈ کو ایسا لگا کہ زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہوں اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ چیونٹے نہایت تیزی سے آتے جا رہے تھے۔ اس نے اپنا دھیان اس طرف سے ہٹانا چاہا لیکن نگاہ دوبارہ گڑھے پر آ کر ٹھہر گئی۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے چیونٹے مینسن کے دماغ کے بجائے اس کے دماغ سے نکل رہے ہیں۔ دفعتاً اسے مینسن کا چہرہ فضا میں ابھرتا ہوا لگا۔ وہ جیسے جیسے چیونٹوں کی لکیر کی طرف دیکھتا ویسے ویسے اسے اپنا دماغ ختم ہوتا محسوس ہوتا۔ وہ یکایک تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور ایک زوردار جھٹکے سے چیونٹوں کو اپنے جوتوں سے جھٹکا دیا۔ پھر وہ جھاڑیاں پھاندتا' گرتا' پڑتا' پگڈنڈی کی طرف بھاگا چلا گیا تھا۔ پگڈنڈی پر آنے پر وہ رکا۔ چیونٹے اس کا پیچھا نہ کرسکے تھے۔ اب گھاس پر وہ بڑی تعداد میں اکٹھا ہو رہے تھے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی شکل بنا رہے ہوں اور کچھ ہی توقف کے بعد اس نے جو منظر دیکھا وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا کیا جاگتے میں وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟ کیونکہ چیونٹوں نے اکٹھا ہو کر مینسن کا خاکہ ترتیب دیا تھا۔ ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ پاگلوں کی طرح اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور پگڈنڈی پر تیزی سے بھاگتا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد لورین بھی انہی جھاڑیوں سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ صبح سے رٹ لینڈ کے پیچھے تھی اور اس کا پیچھا کرتی یہاں تک چلی آئی تھی۔ اس نے رٹ لینڈ کی تمام حرکات کا بغور جائزہ لیا تھا لیکن اس گڑھے میں کیا تھا جسے دیکھ کر وہ اتنا خوف زدہ ہوگیا تھا؟ یقیناً یہی گڑھا رٹ لینڈ کی پریشانیوں کا سبب ہوگا۔ اس نے ذہن میں سوچا اب لورین کا رخ گھر کے بجائے ماہر نفسیات کے کلینک کی طرف تھا۔ کلینک پہنچ کر اس نے مسٹر لیونارڈ کو تمام واقعات تفصیل سے بتائے تھے۔ تمام واردات سننے کے بعد لیونارڈ نے اسے یقین دلایا کہ وہ آج شام تک ضرور رٹ لینڈ کی بیماری کا سبب معلوم کرلے گا لورین سے وہ اس گڑھے کا محل وقوع معلوم کرنا نہ بھولا تھا۔ لورین جب گھر پہنچی تو اس نے رٹ لینڈ کو بستر پر ایک ایسے معصوم بچے کی طرح بلکتا ہوا پایا جو اپنی زبان سے کچھ نہ بتا سکتا ہو۔ پہلے وہ بستر کی طرف گئی اور پریشانی کے عالم میں دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ باہر سے بند کیا اور مینٹل اسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔

مسٹر لیونارڈ سے اس کی ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور دو تین گھنٹے بعد اپنے

آنے کا کہہ گئے تھے۔ وہ اپنی آنے کی اطلاع ڈاکٹر کے سیکریٹری کو دے کر گھر واپس آ گئی۔ بستر پر گر کر وہ بچوں کی طرح رونے لگی تھی۔ ڈاکٹر لیونارڈ شام تک وہاں پہنچا۔

''ڈاکٹر! ال کی حالت بہت خراب ہے میں نے باہر سے کمرہ بند کردیا ہے۔'' لورین نے ساری کیفیت گھبرا کر بیان کردی۔

''اب آپ کو فکرمند ہونے کی کوئی خاص ضرورت نہیں میں رٹ لینڈ کی بیماری کا سبب معلوم کرچکا ہوں۔ آپ کو پولیس اسٹیشن تک چلنے کی زحمت دوں گا آپ نے جو کچھ دیکھا تھا صرف پولیس کے سامنے وہی بیان کردیجیے گا۔'' سفر بہت طویل تھا لیکن کار اچانک ایک دھچکے سے رک گئی مسٹر لیونارڈ اسے پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں لایا پولیس آفیسر نے نہایت خوش اخلاقی سے اسے بیٹھنے کو کہا اور ساتھ ہی گرم گرم کافی کی ایک پیالی بھی۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے کپ تھامے اس کے ذہن میں چند سوالات گونج رہے تھے۔

اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ ایک ذہنی بیماری کا کیس پولیس نے کیوں لے لیا ہے؟ پولیس انسپکٹر نے اس سے صرف یہی کہا کہ آپ نے صبح جو کچھ دیکھا اسے ایک کاغذ پر تحریر کرکے ہمیں دے دیں۔

مسٹر لیونارڈ ٹھیک اسی گڑھے پر پہنچے تھے جس کی نشاندہی لورین نے کی تھی انہوں نے گڑھے میں مینسن کا ڈھانچہ پایا۔ وہیں سے لیونارڈ سیدھے پولیس کی طرف گئے کیونکہ یہ یقیناً قتل کا ایک کیس تھا۔ کچھ دنوں کے بعد رٹ لینڈ مینٹل اسپتال منتقل کردیا گیا۔ جہاں یہ فیصلہ ہونا تھا کہ وہ کب تک اپنا مقدمہ لڑنے کے قابل ہوجائے گا۔ جائے وقوع سے پائی جانے والی چھڑی جس پر مینسن کا نام کندہ تھا اس پر پائے جانے والے فنگر پرنٹ رٹ لینڈ سے بالکل مشابہت رکھتے تھے۔ اس لیے اب کسی قسم کے سوال کی گنجائش ہی باقی نہ رہ گئی تھی کہ مینسن کا قتل رٹ لینڈ نے نہیں کیا ہے۔ مینٹل اسپتال میں رٹ لینڈ کو ایک کمرے میں بند کردیا گیا۔ شام ڈھل چکی تھی اور تاریکی رفتہ رفتہ پھیلتی جارہی تھی۔ جیسے جیسے رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی ویسے ویسے رٹ لینڈ کا دل ڈوبتا جارہا تھا۔ کیونکہ رات ہی اس کے لیے تکلیف کا بڑا سبب تھی۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن کھڑکی جو کہ کافی بلندی پر لگی ہوئی تھی اس سے باہر کا منظر نظر آرہا تھا آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے اس کا دیوانہ پن بڑھتا جارہا تھا۔ جگمگاتے ستارے اسے مینسن کی گھورتی آنکھوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ وہ دروازے کے قریب آیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔

''مجھے باہر نکالو خدارا مجھے باہر نکالا۔ اس اندھیری کوٹھری میں میرا دم نکل جائے گا۔'' باہر کھڑے پہرے دار نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی تھی۔ ایک گھنٹے بعد چاند کی کرنیں اندر آنے لگیں تو اسے کچھ سکون ملا۔ اس کا سر آہستگی سے کاندھے پر ڈھلک گیا۔ وہ سوچکا تھا۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ دوبارہ گڑھے پر گیا ہے اور چیونٹے اس کے بدن پر چڑھ رہے ہیں۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے دو ہاتھ اس کا گلا گھونٹنے کو بڑھ رہے ہیں۔ ایک زوردار چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اسے مینسن کا سایہ اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ وحشیانہ انداز میں دروازے کو پیٹنے لگا۔

''خدارا مجھے باہر نکالو...... باہر نکالو...... باہر نکالو۔'' کوریڈور میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد چوکیدار کے قدموں کی آواز ابھری وہ دروازے کے قریب جاکر بولا۔

''تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ جاؤ شاباش، بستر پر جا کر لیٹ جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔ قدموں کی بازگشت دور تک سنائی دی تھی۔ رٹ لینڈ چیختا رہ گیا تھا۔ تمہیں نہیں معلوم وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ کیونکہ یہی اب نجات کا ذریعہ تھا اس کے لیے۔

چاندنی رات کی روشنی اسے کچھ تقویت دے رہی تھی۔ ورنہ اس کوٹھری میں وہ ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں چیونٹے سے رینگنے لگے۔ راہ داری کے سرے پر دو پہرے دار کھڑے آپس میں بات کررہے تھے۔ اچانک ایک نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔

''بل، تم نے کچھ دیکھا ابھی؟'' اس کا ساتھی ہلکی روشنی میں اسے گھور رہا تھا۔ اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

''نہیں۔''

''ارے چھوڑ یار کون ایسا پاگل ہوگا جو رات میں یہاں آنا پسند کرے گا۔ ذرا تصور تو کرو۔''

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے پھر انہوں نے دوبارہ ہلکی آواز میں گفتگو شروع کردی۔ کچھ ہی فاصلے پر کوریڈور کی دیوار کے ساتھ ایک سایہ رٹ لینڈ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رٹ لینڈ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رکا اور کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ رٹ لینڈ نے مینسن کا قتل کیا تھا اسے ہر وقت ایسا لگتا جیسے مینسن کا سایہ اس کے پیچھے ہے۔ تاریکی میں وہ یہ بات مزید شدت سے محسوس کرتا۔ اس وقت چاند کی زرد روشنی کمرے میں ہلکا سا اُجالا پھیلا رہی تھی۔ اچانک اسے ایک سایہ اپنی جانب بڑھتا محسوس ہوا۔ وہ اپنی سانس کی پوری طاقت لگا کر چیخا۔

''نہیں، نہیں، نہیں۔ مجھ سے دور ہٹو۔'' پھر اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ بستر سے کمبل اٹھا کر اس نے عفریت نما سایہ کو خود سے دور رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن اسے یقین ہوگیا کہ اب اسے موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا اگر کوئی دوسرا اسے اس وقت اس حال میں دیکھتا تو یقیناً یہ سمجھتا کہ وہ ہوا سے لڑ رہا ہے۔ اس کو اچانک اپنے جسم پر لاتعداد کیڑے رینگتے ہوئے محسوس ہوئے خوف کی شدت کے باعث اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کی آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ فرش پر پڑا ہوا تھا اور اس کا سارا جسم سیاہ چیونٹوں سے ڈھکا تھا۔

صبح کا سورج تیزی سے آسمان پر آگ کے گولے کی مانند چمک رہا تھا۔ پاگل خانے کے عملے کا ہر فرد اپنے اپنے کام میں مصروف ہوچکا تھا۔ ایک اردلی نے رٹ لینڈ کے کمرے کا دروازہ کھولا اور کھانے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے گری۔ وہ زور زور سے چیخ کر عملے کے دوسرے افراد کو بلا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد کوریڈور میں قدموں کی آوازیں گونجنے لگیں اور کمرہ اسٹاف کے لوگوں سے بھر گیا۔

کمرے میں ایک مردہ ڈھانچہ تھا جو بڑے بڑے مردہ سیاہ چیونٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مینسن کا انتقام مکمل ہوچکا تھا۔

دور کہیں...... بہت دور...... مینسن اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

☯

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی انسانوں کو عجیب تماشے دکھاتی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا مگر اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

• سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی دلچسپ ودلکش سلسلے وار کہانی

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک نیم تاریک کمرے میں پایا۔ آنکھ کھلتے ہی سر کے عقبی حصے میں مجھے شدید درد محسوس ہوا اور بے اختیار میرا ہاتھ متاثرہ حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے صورتِ حال مجھ پر عیاں ہوگئی۔

مجھے یاد آیا کہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہونے سے قبل میں فرحانہ کے حصول کے لیے گلستان جوہر کے دورافتادہ حصے میں واقع' ایک نوتعمیر شدہ بنگلے میں پہنچا تھا۔ میرے خوامخواہ کے دشمن ندیم شیروانی نے فرحانہ کو اس بنگلے میں قید کر رکھا تھا۔ فرحانہ کی رہائی کے لیے شیروانی نے مجھے پانچ لاکھ کی رقم کے ساتھ مذکورہ بنگلے میں پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے اس کی ہدایت پر اپنے انداز میں عمل کیا تھا لیکن فرحانہ تک رسائی سے پہلے ہی ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا تھا۔ میں فرحانہ والے کمرے کا دروازہ کھولنے جا ہی رہا تھا کہ میری کھوپڑی کے عقبی حصے میں گویا ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی تھی۔ کسی نے آہنی شے سے میرے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ میں خود کو سنبھال نہیں پایا تھا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور کمرے کے نیم تاریک ماحول میں چاروں جانب نگاہ دوڑانے لگا۔ جسم کو حرکت دینے سے سر کی تکلیف میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ کھوپڑی کے متاثرہ حصے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں جس نوعیت کے سنگین حالات سے دوچار تھا اس میں تھوڑی دیر کے لیے جسمانی تکلیف کو فراموش کردینا بہت ضروری تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک انگڑائی لے کر بدن کو چست کیا اور تنقیدی انداز میں اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق' وہ بارہ بائی پندرہ فٹ کا ایک عام سا کمرا تھا۔ اسے ڈرائنگ' ڈائننگ یا بیڈروم کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ وہاں ایسا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ جس سے اس کمرے کی حیثیت کا تعین کیا جاسکتا۔ مجھے کسی فالتو سامان کی مانند لاکر اس کمرے کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر پھینک دیا گیا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں لگنے والی طوفانی چوٹ

نے مجھ پر ایسی بے ہوشی طاری کر دی تھی کہ مجھے مطلق خبر نہ ہو سکی کہ میں کب اور کس انداز میں اس کمرے تک پہنچایا گیا تھا۔ یہ کارنامہ شیروانی کے کسی نمک خوار ہی کا تھا۔

کمرے کے سونے پن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی یہاں کسی نے باقاعدہ رہائش اختیار نہیں کی تھی۔ دیواروں اور چھت وغیرہ پر پلاسٹر کا کام مکمل ہو چکا تھا تاہم رنگ و روغن کا کام باقی تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ یہ کمرا بھی اسی بنگلے کا حصہ ہوگا جہاں شیروانی نے میری جان جگر فرحانہ کو قید کر رکھا تھا۔

فرحانہ کی یاد کے ساتھ ہی میرے دل میں ایک کسک سی جاگ اٹھی۔ وہ میری دھڑکنوں میں سمائی ہوئی تھی۔ شیروانی نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے میری چھوٹی بہن کو اغوا کرانا چاہا تھا مگر اغوا کی کارروائی میں بڑی زبردست قسم کی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ ندیم شیروانی کے بھیجے ہوئے غنڈے شازیہ کے بجائے فرحانہ کو اٹھا لے گئے تھے پھر جب یہ انکشاف ہوا کہ فرحانہ کا مجھ سے قلبی رشتہ ہے تو شیروانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ وہ فرحانہ کے ذریعے مجھے زیادہ آسانی کے ساتھ جھکنے پر مجبور کر سکتا تھا اور اس کم بخت نے ایسا ہی کیا تھا۔

میں دل ہی دل میں شیروانی کو برا بھلا کہتے ہوئے کمرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ فرحانہ کی خوف و ہراس میں ڈوبی ہوئی فریادی آواز بار بار میرے دماغ میں ہل چل مچا رہی تھی۔ جب میں اس بنگلے کے ڈرائنگ روم سے نکل کر فرحانہ والے کمرے کی سمت بڑھا تھا تو کمرے کے اندر سے اس کی اضطراری آواز ابھری تھی۔

"سر مجھے نکالیں یہاں سے۔"

اور میں فرحانہ کو شیروانی کے چنگل سے نکالنے سے پہلے خود اس کے دام فریب میں آ گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک مجھ پر وار کر کے مجھے بے بس کر دیا جائے گا۔ جب دو حریف ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق چالیں چلتے ہیں۔ میں نے شیروانی کو نیچا دینے کے لیے نقلی نوٹوں کے پانچ بنڈل تیار کیے تھے اور یہی سوچا تھا کہ میں اسے مات دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر فرحانہ کی خوف و دہشت سے لبریز آواز نے مجھے کسی حد تک غافل اور غیر محتاط کر دیا تھا اور اسی غفلت میں مجھے شکار کر لیا گیا تھا۔ فرحانہ کی آواز نے مجھے ایک لمحے کے لیے اپنے ماحول سے بے گانہ کر دیا تھا اور یہ وارفتگی خاصی مہنگی ثابت ہوئی تھی۔

میں نے دروازے کو کھینچا اور دبا کر دیکھا وہ لاک تھا۔ اسے آسانی سے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ لاک کے تصور سے میرے ذہن میں چابی کا خیال آیا جب میں اس بنگلے کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تھا تو گلاس ٹاپ ٹیبل پر ایک چابی رکھی ہوئی تھی۔ جس کی مدد سے مجھے بنگلے کے ایک کمرے کو کھول کر فرحانہ کو وہاں سے نکالنا تھا۔ نقلی نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا سرخ ہینڈ بیگ میں نے میز پر رکھ کر وہ چابی اٹھالی تھی اور فرحانہ والے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

چابی کے خیال کے ساتھ ہی میں نے جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھیرائے مگر وہاں چابی نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ یہی عمل اضطراری انداز میں، میں نے شرٹ کی جیبوں کے ساتھ بھی دہرایا مگر کوئی حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ان لمحات میں میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ اگر چابی میرے پاس ہوتی تو میں اس کی مدد سے اس کمرے کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن مذکورہ چابی

افراتفری میں کہیں گر گئی تھی۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ اسی کمرے میں ہو۔

انسان جب کسی مشکل میں ہوتا ہے تو وہ معمولی سی شے کو بھی اپنے نجات دہندہ کے طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ شاید اسی لیے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" جیسا محاورہ ترتیب پایا ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں تھا کہ وہ چابی اس کمرے کے دروازے کو کھولنے کے کام آ جاتی لیکن تاریک رات میں روشنی کی ایک موہوم سی کرن بھی کسی آفتاب اور مہتاب سے کم نہیں ہوتی۔

دروازے کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس کمرے کی واحد کھڑکی بڑی عجیب سی تھی۔ وہ بنگلے کے ماحول سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ بنگلوں میں عموماً اس نوعیت کی کھڑکیاں نہیں بنائی جاتیں۔ مذکورہ کھڑکی کی چوڑائی تین فٹ اور اونچائی تقریباً دو فٹ رہی ہوگی۔ یہ کھڑکی کمرے کے فرش سے لگ بھگ ڈھائی فٹ بلندی پر واقع تھی اور اس کھڑکی کا کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا بلکہ کھلے ہوئے درے میں عمودی آہنی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ یہ سلاخیں اوپر سے کم و بیش پانچ پانچ انچ کے فاصلے پر جڑی گئی تھیں اور ان سلاخوں کی موٹائی آدھی انچ کے برابر رہی ہوگی۔ چوبی فریم والی اس کھڑکی نے اچھے خاصے کمرے کو قید خانے کا روپ دے دیا تھا۔ میں نے کھڑکی کی آہنی سلاخوں کو تھام کر ان کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ انہیں کسی وزنی ہتھوڑے یا کسی اوزار کی مدد کے بغیر اکھاڑا نہیں جا سکتا تھا۔ کھڑکی کی دوسری طرف راہ داری کا منظر نظر آیا جس میں نیم تاریکی کا بسیرا تھا۔ کمرے کے اندر بھی یہی کیفیت تھی۔ میں سہ پہر پانچ بجے اس منحوس بنگلے پر پہنچا تھا اور اب غالباً شام ہونے والی تھی یا ہو چکی تھی۔ ملگجے اجالے سے میں یہی اندازہ قائم کر پایا تھا۔ اس اندازے سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ میں لگ بھگ دو گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔

اپنی بے ہوشی کے تصور کے ساتھ ہی سر کے عقبی حصے سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں اور بے اختیار ایک بار پھر میرا ہاتھ متاثرہ مقام کی طرف بڑھ گیا۔ جس جگہ کسی آہنی شے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ وہاں ایک گومڑ نمایاں ہو چکا تھا اور بالوں میں موجود نمی اور مخصوص چپچپاہٹ سے یہ بھی واضح ہوتا تھا کہ چوٹ والی جگہ سے خون کا اخراج بھی ہوا تھا۔ میں نے دانت کچکچائے اور دل ہی دل میں شیروانی کو کوس کر رہ گیا۔

"شیطان کی اولاد ایک بار تم میرے ہتھے چڑھ جاؤ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ اسد اللہ کتنے بڑے طوفان کا نام ہے۔"

ادھر سوچ میں یہ جملہ مکمل ہوا ادھر نیم تاریک راہ داری جھٹ سے روشن ہو گئی۔ کسی نے وہاں کی لائٹ آن کر دی تھی۔ کس نے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں ابھی اس نامعلوم شخص کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کمرا بھی روشن ہو گیا جس میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ گویا اس کمرے کی لائٹ کا سوئچ کمرے سے باہر کہیں موجود تھا۔ میں دیوار پر نصب ٹیوب لائٹ کو گھور کر رہ گیا پھر اضطراری نظر سے ایک بار پھر اس بندی خانے کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ اس کمرے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں نے نیم تاریکی میں دیکھا تھا۔ لائٹ آن ہونے کا مطلب یہی تھا کہ اب رات ہو گئی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس سے ہٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ راہ داری میں قدموں کی چاپ نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک شخص

ہے۔ اگر ایک سے زیادہ افراد اس سمت بڑھ رہے ہوتے تو یقیناً ان کے قدموں کی چاپ مختلف ہوتی۔ میں کھڑکی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور اس طرف آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔

جلد ہی مجھے اس کی صورت نظر آ گئی۔ وہ شکل ہی سے غنڈا صفت دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ درمیانہ قد اور گٹھا ہوا بدن چہرے پر کرختگی اور سفاکی جھلکتی تھی اور آنکھوں سے بھی درندگی ٹپکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کلاشنکوف نما ایک خوف ناک گن بھی موجود تھی۔ اس کا انداز دہشت طاری کر دینے والا تھا۔

وہ کھڑکی کے سامنے آ کر ٹھہر گیا پھر میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔ ”تو تمہیں ہوش آ گیا۔“

”تو کیا تم یہ توقع کر رہے تھے کہ اب میری آنکھ دوسرے جہان جا کر ہی کھلے گی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے تم لوگوں نے مجھے دوسری دنیا پہنچانے میں کسر تو کوئی نہیں چھوڑی تھی۔“

وہ میرے لہجے کی تیزی اور چبھن کو برداشت نہ کر سکا۔ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ ”زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم جانتے نہیں، میں کون ہوں۔“

”واقعی نہیں جانتا۔“ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”بھائی! تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے اور مجھ سے تمہاری ایسی کون سی دشمنی ہے جو اس کمرے میں بند کر رکھا ہے؟“

”تم بک بک بہت کرتے ہو۔“ وہ کھوجتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں خبردار کیا گیا ہے۔ تمہاری کوئی بھی ہوشیاری اور چالاکی کام نہیں آئے گی۔“

میں نے اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔ ”تم خوامخواہ بگڑ رہے ہو حالانکہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی ہوشیاری یا چالاکی نہیں کی۔ صرف تمہارا نام پوچھا ہے اور اس دشمنی کی وجہ جاننے کی کوشش کی ہے۔“

”تم میرا نام جان کر کیا کرو گے۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اس سے تمہارا کوئی بھلا نہیں ہونے والا۔“

”میرے بھلے برے کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”اپنا نام نہیں بتانا چاہتے نہ بتاؤ مگر میں یہ جاننے کا حق تو رکھتا ہوں کہ مجھے اس کمرے میں کیوں قید کیا گیا ہے۔“

”میرا نام گولی ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”گولی!“ میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”یہ کیسا نام ہے، تم کون سی گولی ہو۔ بچوں کے کھانے والی میٹھی گولی یا دوا والی کڑوی گولی۔“

”میں بندوق سے نکلنے والی خطرناک گولی ہوں۔“ وہ اپنے ہاتھوں میں موجود گن کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”ادھر تم نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی ادھر میں گن کا ٹریگر دباؤں گا ایک گولی چلے گی اور تم کمرے کے فرش پر تڑپتے دکھائی دو گے۔“

وہ ایسی باتوں کے ذریعے میرے دل و دماغ پر اپنی دہشت طاری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دانستہ اسے یہ تاثر دیا کہ میں اس کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیکھو گولی بھائی! میں کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کروں گا کہ تمہیں اپنی گن کا ٹریگر دبانے کی زحمت کرنا پڑے، بس اتنا بتا دو کہ مجھے یہاں کیوں قید کیا گیا ہے۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“

اس خر دماغ گن بردار کو بڑے طریقے سے شیشے میں اتارنے کی ضرورت تھی۔ اس امر میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ شیروانی کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کے غصیلے پن اور بد مزاجی سے مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ میں نرمی اور محبت کا مظاہرہ کر کے اس کی زبان سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوا سکتا تھا لہٰذا میں بہلانے پھسلانے کی پالیسی پر کاربند تھا۔

”تم ایک خطرناک دہشت گرد ہو۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو بھائی؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”یہ میں نہیں کہہ رہا میرے باس کا فیصلہ ہے۔“ وہ منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے بولا۔ ”آج کی رات تم نے ایک بہت بڑی تخریب کاری کا منصوبہ بنا رکھا تھا لیکن باس نے تمہیں اس منصوبے میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑ لیا۔ اس وقت تم میرے باس کی قید میں ہو اور میں تمہارا نگران ہوں۔“

اس نے دو تین بار جب اپنے باس کا ذکر کیا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”گولی بھائی تمہارے باس کا نام ندیم شیروانی ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک سمجھے!“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور کیسے نہیں سمجھو گے تم میرے باس اور اس کے غیر ملکی دوست کو اچھی طرح جانتے ہو۔“ بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہو گئی تھی۔ ”تم باس کے غیر ملکی دوست کو باس سمیت قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اللہ کا شکر ہے، وقت سے پہلے ہی تمہیں قابو کر لیا گیا۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔ تمہارا باس جھوٹ بولتا ہے۔“ میں نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں نہ تو تخریب کار ہوں اور نہ ہی دہشت گرد۔ میں اس معاشرے کا ایک امن پسند اور شریف فرد ہوں۔ تمہارے باس نے میرے بارے میں تمہیں سراسر غلط بتایا ہے۔“

”میرے لیے باس کی بات کی اہمیت ہے۔ تم جو کچھ بھی کہو گے، میں اس پر اعتبار نہیں کروں گا۔ میں اپنے باس کو اچھی طرح جانتا ہوں تم مجھے چکر دینے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ باس نے کہہ دیا تم ایک خطرناک دہشت گرد ہو تو بس...... تم دہشت گرد ہو۔“

اس کا اٹل اور دوٹوک انداز بتاتا تھا کہ میری کوئی بھی وضاحت اس کی رائے کو تبدیل نہیں کر سکے گی۔ وہ ان لمحات میں وہی بول رہا تھا جو شیروانی کی طرف سے اس کے دماغ اور منہ میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ کم بخت میری توقعات سے کہیں زیادہ شاطر اور مکار ثابت ہو رہا تھا۔ اس شیطان کی اولاد نے تو کہانی ہی الٹ دی تھی۔ یہ گن بردار مسٹر گولی بڑے واضح انداز میں مجھے باور کروا چکا تھا کہ میری کسی وضاحت پر یقین نہیں کرے گا لیکن میں نے پھر بھی اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ شیروانی کی مجھ سے کیا دشمنی ہے اور یہ کہ میں کس مقصد سے جوہر والے بنگلے پر پہنچا تھا۔

اس نے شک آلود تاثرات کے ساتھ میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں! میں تمہاری بات کا یقین نہیں

کر سکتا۔ تم میری ہم دردی حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی درد بھری کہانی سنا رہے ہو لیکن یاد رکھو تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"جب تم نے مجھ پر یقین نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے تو پھر کسی وضاحت کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تمہارا باس کہاں ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔" وہ روکھے لہجے میں بولا۔ "میں تمہارا نگران ہوں میں تمہیں کہیں لے جانے کا مجاز نہیں ہوں۔ باس کو جب تم سے ملنا ہوگا وہ مجھے حکم دے گا۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کر سکوں گا۔"

"تم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے گولی بھائی!" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

"کک...... کیا مطلب!" وہ گھور کر مجھے تکنے لگا۔ "میری کس بات نے تمہیں متاثر کیا ہے؟"

"وفاداری اور فرماں برداری نے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔ "آج کل یہ دونوں خصوصیات انسانوں میں سے رفتہ رفتہ رخصت ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ تم اپنے باس کے ساتھ بہت مخلص ہو۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میرے منہ سے اپنی تعریف سننا اسے بھلا لگا تھا تاہم اگلے ہی لمحے اس نے اپنے تاثرات پر قابو پا لیا اور ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تمہارا باس شیروانی بھی اس وقت یہاں موجود ہے؟"

"نن...... نہیں!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "باس یہاں سے دور اپنے بنگلے پر ہوگا۔"

"اس بنگلے پر تمہارے علاوہ اور کتنے افراد موجود ہیں؟" میں نے بڑے محتاط انداز میں اسے گھسنے کی کوشش کی۔

اس کم بخت نے اپنا نام گولی بتایا تھا۔ بارود سے بھری ہوئی گولی کو گھستے وقت بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ کہیں چل چلا نہ جائے۔ یہ مسٹر گولی بھی کچھ اسی قسم کی شے تھا!

میرے سوال پر اس نے شک بھری نظر سے مجھے دیکھا اور تنبیہی انداز میں بولا۔ "تم نے چالاکی شروع کر دی نا۔ باس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ تم بڑی ہوشیاری سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو گے لیکن میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئیں۔ تمہیں اپنے مقصد میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

"تم خوامخواہ میری نیت پر شک کر رہے ہو گولی بھائی!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں اس وقت تم لوگوں کی قید میں ہوں۔ یہاں میری کوئی ہوشیاری یا چالاکی بھلا کیسے کام آ سکتی۔ میں نے تو ایسے ہی سوال برائے سوال پوچھ لیا تھا۔ تم نہیں بتانا چاہتے تمہاری مرضی ہے......!" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"چلو اتنا ہی بتا دو۔ کیا یہ گلستانِ جوہر کا وہی بنگلا ہے جہاں تمہارے باس نے میری دوست فرحانہ کو قید کر رکھا تھا اور میں فرحانہ کو چھڑانے وہاں پہنچا تھا؟"

"میں تمہاری دوست فرحانہ یا گلستان جوہر والے بنگلے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ بڑی گہری نظر سے میرے چہرے کا تاثرات کو جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "ہاں اتنا جان لو کہ یہ مقام گلستانِ جوہر سے بہت دور ہے۔"

میں نے چونک کر گولی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عجیب و غریب انکشاف کر رہا تھا۔ اگر اس نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو پھر اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ میری بے ہوشی کے دوران مجھے گلستانِ جوہر والے بنگلے سے یہاں شفٹ کیا گیا تھا۔

"بس آخری سوال!" میں نے اضطراری انداز میں اپنے نگران گولی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہارے باس سے کیسے ملاقات ہو سکتی ہے۔ مجھے شیروانی سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔ کیا تمہارے پاس موبائل فون ہے۔ کیا تم شیروانی سے میری بات کروا سکتے ہو؟"

میرے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور ناگواری سے بولا۔ "میرے پاس موبائل فون تو ہے لیکن وہ باس کا حکم سننے کے لیے ہے۔ میں باس سے تمہاری بات نہیں کرا سکتا اور نہ ہی باس تک تمہاری اس خواہش کو پہنچا سکتا ہوں۔ جب باس کی مرضی ہوگی وہ تم سے ملنے یہاں آ جائے گا یا پھر تمہیں اپنے پاس بلالے گا اور جب تک ایسا نہیں ہو جاتا' تمہیں میری نگرانی میں اس کمرے میں قید رہنا ہے۔"

"مجھے کتنے دن تک اس کمرے میں قید رہنا ہوگا؟" میں نے الجھن آمیز انداز میں پوچھ لیا۔

"کم از کم آج کی رات اور کل کا دن تو تمہارا ادھر ہی گزرے گا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "آج کی رات اور کل کا دن ہی کیوں۔ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟"

"باس کا وہ غیر ملکی دوست کل دن میں کسی وقت واپس چلا جائے گا۔" گولی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب تک باس کا دوست کراچی میں ہے تمہیں اسی قید خانے میں رہنا ہے۔ کل شام کو تمہیں یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد میں سکون کا سانس لوں گا۔ تمہاری نگرانی والی یہ ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔"

"تمہارا باس ایک نمبر کا جھوٹا اور دغا باز ہے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "اصل کہانی کو گول کر کے اس نے مجھے ایک دہشت گرد نامزد کر دیا ہے حالانکہ اس معاملے کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔"

"کچھ بھی ہے لیکن میرے لیے باس کی بات زیادہ اہم ہے۔" وہ پھنکار سے مشابہ لہجے میں بولا۔ "تمہیں یہاں پہنچانے کے بعد ایک بات مجھے بڑی اچھی طرح سمجھا دی گئی تھی کہ تم بہت ہی خطرناک اور چالباز قسم کے دہشت گرد ہو۔ چنانچہ اس قید سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتے ہو۔ اگر تم نے ایسی کوئی مہم جوئی کی تو میں بے دریغ تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ اس سلسلے میں باس نے مجھے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو چپ چاپ اس کمرے میں وقت گزارتے رہو ورنہ میری گن سے تم پر اتنی گولیاں برسیں گی کہ سوراخ کی گنتی ممکن نہیں رہے گی۔"

"یار گولی! ایسی ڈرانے والی خوف ناک باتیں نہ کرو۔" میں نے خوف زدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ بھی ایسا نہیں کروں گا کہ تمہیں گن استعمال کرنے کی زحمت کرنا پڑے۔ ویسے چہرے سے تو تم ایسے نظر نہیں آتے۔"

"کیا مطلب!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"میں چہرے سے کیسا نظر نہیں آتا؟"

"میرا یہ مطلب ہے کہ......!" میں نے نرم

گفتاری سے اسے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی باتوں اور گن کے مخصوص اشاروں سے خود کو ایک ظالم اور سفاک شخص ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ جو مرنے مارنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے مگر اندر سے تم مجھے کچھ اور ہی لگتے ہو۔“

میرے آخری جملے نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا‘ متعجب انداز میں جلدی سے بولا۔ ”کک...... کیا ...... لگتا ہوں میں...... اندر سے......؟“

”ایک ہمدرد اور شفیق انسان!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”جس کے سینے میں ایک محبت کرنے والا دل دھڑکتا ہو۔ جس کا جرائم کی دنیا سے دور دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ جو امن اور سلامتی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہو مگر حالات کے جبر نے اسے تاریک راہوں کا مسافر بنا دیا ہو۔ نامساعد حالات نے جسے ایک ہلاکت خیز گن تھما کر بدمعاشی اور غنڈہ گردی پر مجبور کر دیا ہو۔“ میں نے لمحاتی توقف کیا پھر بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”گولی بھائی کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں اور چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اندر سے ہل کر رہ گیا تھا۔ میری باتیں تیر کے مانند نشانے پر جا کر لگی تھیں اور اس کے بارے میں‘ میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا وہ صد فیصد درست تھا۔ اگر میں اسے تھوڑا اور کریدنے کی کوشش کرتا تو وہ اپنے دل کا احوال مجھ پر عیاں کر سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی اس کوشش کو امید افزا انداز میں آگے بڑھاتا گولی کے چہرے کے تاثرات یک لخت تبدیل ہو گئے اور وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ارے...... خبردار! میں تمہاری ان ہمدردانہ باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ تمہاری کوئی چال مجھ پر کامیاب نہیں ہو سکتی یہ بک بک بند کرو۔ ورنہ میرا دماغ خراب ہو گیا تو......!“

اس نے دھمکی آمیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی تو میں اس کے جملے کے کھوکھلے پن کو محسوس کیے بنا نہ رہا۔ اس نے یہ دھمکی دیتے ہوئے بڑے خطرناک انداز میں گن کو حرکت بھی دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے بھون کر رکھ دے گا مگر اس کی وارننگ توانائی سے خالی تھی جیسے بچوں کو ڈرانے کے لیے مختلف قسم کی سزاؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

میری بات کے جواب میں لمحہ بھر پہلے اس کے چہرے اور آنکھوں میں جو تاثرات نمایاں ہوئے تھے۔ وہ میرے لیے خوشی کا سبب تھے۔ یہ سوچ کر مجھے اطمینان محسوس ہوا میں نے اس کے اندر سوئے ہوئے کسی نہایت ہی نازک معاملے کو جگا دیا تھا تاہم اس نے جلد ہی اپنے اندرونی جذبات پر قابو پاتے ہوئے چہرے کے تاثرات کو تبدیل کر لیا تھا اور یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ درحقیقت ایک سنگ دل اور سخت گیر شخص ہے جس سے مجھے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ لیکن میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس کے اندر ایک شریف النفس اور صلح جو انسان موجود تھا۔ حالات کی ستم ظریفی نے اسے شیروانی کے ٹولے میں شامل کر دیا تھا اور وہ خود پر ایک برے انسان کا خول چڑھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں اس کی دکھتی ہوئی رگ کو ٹٹولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اگر میں احتیاط کے ساتھ کرید کا یہ سلسلہ جاری رکھتا تو مجھے

امید تھی کہ میں بہت جلد اس کے اندر چھپے ہوئے انسان کو منظر عام پر لا سکتا تھا۔

میں اپنی کوشش کو آگے بڑھانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ اچانک پلٹا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس خیال کو بھولے سے بھی ذہن میں لانے کی کوشش نہیں کرنا کہ تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل کر لو گے۔ اس کمرے سے نکلنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک دروازہ اور دوسری یہ کھڑکی جس میں تم اس وقت کھڑے ہو۔ دروازہ لاک ہے اور کھڑکی میں آہنی راڈ نصب ہیں۔ اگر تم کسی طرح مہم جوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑکی یا دروازہ توڑ کر باہر نکل بھی آئے تو میں راہ داری میں تمہیں چاق چوبند ملوں گا۔ اسی گن کے ساتھ جس کا ایک خوف ناک برسٹ تمہیں تمہارے ہی خون میں نہلا دے گا۔“

”میں ایسا کوئی کام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا جس سے میری جان کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے۔“ میں نے اس کی تسلی کی خاطر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس لیے تم کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی تم نے بتایا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ کل شام تک یہاں رہنا ہوگا۔ میں یہ وقت بڑی شرافت سے گزار لوں گا۔“

”شرافت کا مظاہرہ کرنے ہی میں تمہاری سلامتی اور خیریت ہے۔“ وہ جذباتیت سے عاری لہجے میں بولا۔

”اب تم عقل مندی سے سوچ رہے ہو۔“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے اس کے اطمینان کی خاطر منت ریز لہجے میں کہا۔ ”پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ کیا پینے کے لیے پانی مل جائے گا۔“

اس نے خاموش نظروں سے مجھے گھورا پھر سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے وہ راہ داری میں میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ کمرے کے اندر مقید ہونے کے باعث میں آہنی سلاخوں والی کھڑکی کے توسط سے راہ داری کا بس سامنے والا حصہ ہی دیکھ سکتا تھا۔ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ گولی نامی وہ نگران راہ داری سے آگے کہاں گیا ہوگا میں وہیں کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ میرا حلق خشک ہو رہا تھا لیکن پیاس کی شدت ایسی بھی نہیں تھی کہ میں برداشت نہ کر پاتا۔ میں دراصل اپنے نگران کی نظر میں خود کو زیادہ سے زیادہ مجبور اور بے بس ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب مجھے اس سعی میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔

لگ بھگ پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کی بوتل اور دوسرے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا۔ خطرناک گن اسٹریپ کے ذریعے اس کی گردن سے ہوتے ہوئے پہلو میں لٹک رہی تھی۔ پانی منرل واٹر والی خالی پلاسٹک کی بوتل میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے بوتل اور پھر گلاس کو آہنی سلاخوں کے درمیان سے گزار کر مجھ تک پہنچایا۔ میں نے یہ دونوں چیزیں وصول کیں۔ پھر بوتل کو اپنے گال کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”یہ پانی تو گرم ہے میں نہیں پی سکوں گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”گولی بھائی! میں ٹھنڈا پانی پینے کا عادی ہوں۔“ میں نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ ”کیا فریج کی لگی ہوئی کوئی ٹھنڈی بوتل نہیں مل سکتی۔“

ٹھنڈا یا گرم پانی میرے لیے کوئی ایشو نہیں تھا۔

دراصل میں اس کرخت صورت نگران کو زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ مصروف رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے اندر جھانک کر اس کی کمزوریوں تک رسائی حاصل کرسکوں۔ اس نے میری فرمائش پر برا سا منہ بنایا اور سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم یہاں کسی دعوت میں نہیں آئے ہو۔ یہ مت بھولو کہ تم اس وقت باس کی قید میں ہو۔ قیدیوں کو فرمائشیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے بھائی!'' میں نے پسپا ہوتے ہوئے کہا۔

''تم ناراض نہیں ہو۔ میں گرم پانی پی کر ہی گزارہ کرلوں گا۔''

''میں ایک گھنٹے بعد تمہارے لیے کھانا لے کر آؤں گا۔'' وہ اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔ ''کھانا کھا کر چپ چاپ شرافت سے سو جانا۔ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کرو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں اس ٹھنڈے ٹھار فرش پر شرافت سے کیسے سو سکوں گا۔ کم از کم ایک چٹائی کا بندوبست تو کردو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خشمگیں انداز میں مجھے گھورتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

......☆☆☆......

اس کرخت صورت نگران کی زبانی مجھے یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ جہاں اس وقت مجھے قید کیا گیا تھا یہ مقام گلستان جوہر والے بنگلے سے کافی دور تھا۔ اگر وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ فرحانہ بھی اس وقت مجھ سے دور تھی۔ پتا نہیں اس منحوس شیروانی نے میری فرحانہ کو کہاں قید کر رکھا تھا۔ مسلح نگران کو اس نے میرے بارے میں کوئی اور ہی کہانی سنا رکھی تھی۔ گولی کی نگاہ میں، میں ایک خطرناک دہشت گرد تھا۔ جو اس کے باس اور باس کے کسی غیر ملکی دوست کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ شیروانی جیسے ناہنجار سے کسی بھی قسم کی توقع کی جاسکتی تھی۔ پہلے میں نے اکیلے اس کی اور ازاں بعد میں نے اور خوش ولی نے مل کر اس کے آدمیوں کی ایسی ٹھکائی کی تھی کہ وہ انگاروں پر لوٹ کر رہ گیا تھا اور مجھ کو عبرت ناک سبق سکھانے کے لیے اس نے شازیہ کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی لیکن بدقسمتی سے فرحانہ اس کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

میرا دھیان خود بخود خوش ولی کی طرف چلا گیا۔ اس کے اور میرے ساتھ کو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے لیکن اس مختصر سی مدت کے دوران میں ہم ایک دوسرے کے ذہنوں اور دلوں کے بہت قریب آگئے تھے۔ ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے دوست بن چکے تھے اسی لیے جب عاطف رشید نے خوش ولی کو بتایا کہ فرحانہ کی واپسی والے مشن میں مجھے اس کے تعاون کی ضرورت ہے تو وہ اپنی صحت کی پروا کیے بغیر فوراً میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ وہ پچھلے دن سے طوفانی نزلے کی گرفت میں تھا۔ بہرحال، ہم دونوں مضبوط پلاننگ کے ساتھ گلستانِ جوہر والے بنگلے تک پہنچے تھے جہاں شیروانی نے فرحانہ کو قید کر رکھا تھا۔ مجھے بنگلے کے اندرونی حالات سے نمٹنا اور خوش ولی نے بنگلے سے باہر الرٹ رہنا تھا اور وقتِ ضرورت میری مدد کو لپکنا تھا لیکن بنگلے کے اندر میرے ساتھ بڑے واہیات حالات پیش آگئے اور بے ہوش ہونے سے قبل جو آخری آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی وہ فائرنگ کی مخصوص آواز تھی۔ شدید فائرنگ کی تڑتڑاہٹ۔ اچانک میرے رگ

پے میں تشویش دوڑ گئی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کہیں خوش ولی کے ساتھ کوئی ایسا ویسا واقعہ تو پیش نہیں آگیا تھا جو کسی بھی زاویے سے اس کے لیے ہلاکت خیز ہو۔ اگلے ہی لمحے میرے دل نے اس سوچ کی تردید کردی۔ خوش ولی ایک بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ رکشا ڈرائیور کے روپ میں میرے ساتھ وہاں پہنچا تھا اور مجھے مذکورہ بنگلے پر ڈراپ کرنے کے بعد لاتعلقی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ شیروانی یا اس کے آدمیوں کی نگاہ میں آیا ہوگا۔ میں خوش ولی کی طرف سے اس لیے بھی مطمئن ہوگیا کہ وہ مسلح تھا اور کسی ہنگامی صورت حال میں وہ اپنا دفاع کرسکتا تھا۔

میں نے بوتل میں سے ایک گلاس پانی نکال کر پیا اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اب کی بار واش روم کا دروازہ بھی میری نگاہ میں آگیا۔ وہ ایک اٹیچڈ باتھ روم تھا۔ میں نے واش روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

واش روم کے اندر لائٹ کا الگ سے کوئی بندوبست نہیں تھا تاہم کمرے کی دیوار پر نصب ٹیوب لائٹ کی روشنی بڑی فراوانی سے واش روم کے اندر پہنچ کر وہاں کے ماحول کو اجال رہی تھی۔ میں تنقیدی نگاہ سے واش روم کا جائزہ لینے لگا۔

وہ خاصا کشادہ واش روم تھا جس کے ایک کونے میں ڈبلیو سی لگا ہوا تھا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر دیوار میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے نل بھی دکھائی دے رہے تھے اور ان نلوں کے نیچے بڑے سائز کی پلاسٹک کی ایک بالٹی اور پانی نکالنے والا مگ بھی موجود تھا۔ میں نے دونوں نل کھول کر انہیں چیک کیا دونوں میں ٹھنڈا پانی آرہا تھا۔ گویا اس واش روم کو کسی گیزر کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا۔

میں نے واش روم کے دوسرے کونے میں نگاہ دوڑائی تو وہاں مجھے مختلف نوعیت کا کاٹھ کباڑ پڑا نظر آیا جس میں پرانے کپڑے کے چند پارچے، لکڑی کے مختلف سائز کے ٹکڑے، دو تین آہنی پائپ کے پیس اور چند روغن کے خالی ڈبوں کے علاوہ ایک اسکریو ڈرائیور بھی تھا جس کا دستہ چرا ہوا تھا۔ بظاہر یہ کباڑ کا فالتو سامان تھا آہنی پائپ کے ٹکڑوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ ان میں سے کسی کو بوقت ضرورت بطور ہتھیار استعمال کیا جاسکتا تھا۔ میں نے دو فٹ لمبے آہنی پائپ کو کاٹھ کباڑ سے الگ کر کے ڈبلیو سی والے کونے میں کھڑا کردیا۔ یہ کونا واش روم کے دروازے سے محض ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ واش روم کے تفصیلی معائنے کے بعد میں باہر نکل آیا اور کمرے میں ٹہل لگاتے ہوئے اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

جب میں خوش ولی کے رکشا میں بیٹھ کر گلستانِ جوہر کے بنگلے کی طرف آرہا تھا تو میری جینز کی پاکٹ میں میرا اسیل فون بھی موجود تھا اور ہپ پاکٹ میں بٹوا بھی تھا۔ جس کے اندر کچھ رقم تھی۔ مگر اس وقت یہ تمام چیزیں میرے لباس میں کہیں موجود نہیں تھیں۔ شیروانی کے بندوں نے مجھے بالکل خالی کر کے اس کمرے کے فرش پر پھینکا تھا۔ وہ میرے لباس میں کسی بھی شے کو چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

ایک مرتبہ پھر کمرے کے باہر راہ داری میں قدموں کی چاپ ابھری اور میرا دھیان اپنے نگران گولی کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں، اس کا اصل نام کیا تھا۔ تاہم ''گولی'' بھی اس پر خوب سجتا تھا۔ آتشی مزاج کا مالک وہ نگران کسی خون خوار اور تیز رفتار گولی کی مانند ہی ایکٹ کرتا تھا۔

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا اور اگلے ہی لمحے مجھے کھڑکی کے سامنے اس کی شکل نظر آئی۔ وہ خالی ہاتھ نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ساتھ ایک چھوٹی چٹائی بھی لایا تھا۔ اس نے سلاخ دار کھڑکی کے توسط سے تہ کر کے مذکورہ چٹائی کمرے کے اندر پہنچائی اور سپاٹ آواز میں بولا۔

''تم بھی کیا یاد کرو گے اب تمہاری مرضی ہے اس چٹائی پر بیٹھو یا پھیل کر سو جاؤ۔''

اس کی اس عنایتِ خسروانہ پر مجھے اسے گھنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر تشکرانہ تاثرات سجائے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''گویا..... تمہارے بارے میں میرا اندازہ بالکل درست تھا۔''

''کیسا اندازہ؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''یہی کہ.....!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم بظاہر کتنے ہی اکھڑ مزاج اور غنڈہ صفت کیوں نہ ہو مگر تمہارے اندر ایک ہم درد اور مخلص انسان چھپا ہوا ہے۔ تم نے میری تکلیف کا احساس کرتے ہوئے فوراً میرے لیے ایک چٹائی کا بندوبست کر دیا۔ کسی جرائم پیشہ شخص سے ایسے انسانی عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تمہیں کسی بہت بڑی مجبوری نے گن اٹھانے کی ترغیب دی ہے۔ اس میں تمہاری مرضی شامل نہیں۔''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ میری باتوں کا اس کے اعصاب اور حواس پر خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔

تاہم بہت جلد اس نے اندرونی کیفیت پر قابو پا لیا اور سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تمہاری زبان کچھ زیادہ ہی چلتی ہے۔ اگر تم نے اپنی زبان بند نہ رکھی تو مجھے مجبوراً اسے تمہاری گدی سے کھینچ کر باہر نکالنا پڑے گا۔''

''گولی بھائی! مجھ سے خفا نہیں ہو۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں میرا بولنا اچھا نہیں لگتا تو میں چپ سادھ لوں گا' تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ بس اتنا بتا دو کہ......!''

''سوال بھی کرتے ہو اور یہ بھی کہتے ہو کہ چپ سادھ لو گے۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''مجھے تمہاری زبان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔'' آخری جملہ اس نے کسی درندے کی مانند غراتے ہوئے ادا کیا تھا۔

میں نے دونوں کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''پکا وعدہ بس اس سوال کے بعد کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

''اچھا' اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''پوچھو کیا پوچھنا ہے۔''

''واش روم میں لائٹ کا انتظام نہیں ہے۔'' میں نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''اگر مجھے واش روم استعمال کرنے کی ضرورت پیش آ گئی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''کوئی مشکل نہیں ہو گی۔'' وہ بڑی بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

''واش روم میں لائٹ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ تم اسے استعمال کرتے ہوئے دروازہ آدھا کھلا رہنے دینا۔ کمرے کی لائٹ واش روم کے اندر پہنچتی رہے گی۔ اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔''

''میں لائٹ بند کر کے سونے کا عادی ہوں۔ جلتی ہوئی لائٹ میں مجھے نیند نہیں آتی۔'' میں نے اپنے

نگران سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب تم کمرے کی لائٹ باہر سے آف کر دو گے تو کمرے کے اندر اندھیرا پھیل جائے گا۔ اس دوران میں اگر مجھے واش روم جانے کی ضرورت پیش......!''

''تم جاؤ جہنم میں۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی جھلاہٹ بھرے انداز میں بولا پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے نگران کی دی ہوئی چٹائی کو کمرے کے فرش پر بچھایا اور آلتی پالتی مار کر اس کے وسط میں بیٹھ گیا پھر لمبی لمبی سانسیں کھینچ کر اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے لگا۔

انسان نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی سیکھا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی موڑ پر ضرور اس کے کام آتا ہے۔ میں ورزش کا عادی تھا۔ باڈی بلڈنگ اور ایروبکس میرے معمول میں شامل تھیں۔ موقع ملنے پر میں نے مارشل آرٹس کے بھی کوئی داؤ پیچ اور گر سیکھ لیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ذہن کو چست اور توانا رکھنے کے لیے گاہے بگاہے یوگا کے مختلف آسن بھی لگا لیا کرتا تھا۔

اس وقت بھی میں آنکھیں بند کیے اور آلتی پالتی مارے سانس کی ایک مخصوص مشق کر رہا تھا۔ جس کے اثرات جلد ہی میرے بدن' ذہن اور اعصاب پر مرتب ہونے لگے اور چند منٹ کے اندر ہی میں خود کو ہلکا پھلکا اور تروتازہ محسوس کرنے لگا۔ میں نے یوگا کی مشق کو موقوف کیا اور شیروانی کی دشمنی کے بارے میں غور کرنے لگا۔

اگر دیانت داری سے سوچا جاتا تو ہمارے درمیان دشمنی کا کوئی خاص سبب نہیں تھا۔ وہ ایک انا پرست اور مغرور شخص تھا۔ شاید زندگی میں آج تک مٹی کے مادھوؤں سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ ایک میں اس کے سامنے جم کر اور اکڑ کر کھڑا ہوا تھا تو وہ میری اس جرأت کو برداشت نہیں کر پایا تھا اور فرحانہ خوامخواہ میری دشمنی کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

میں بڑی تیز رفتاری سے فرحانہ کے والدین' اپنی امی اور چھوٹی بہن شازیہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ سب امید لگائے بیٹھے تھے کہ میں شام چھ بجے تک فرحانہ کو آزاد کرا کے ان کے پاس پہنچ جاؤں گا اور میں ایک ایسی مصیبت میں پھنس گیا تھا کہ ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور وہ بھی ایک قیدی کی حیثیت سے۔

میری اور فرحانہ کی فیملی کے افراد یقیناً بڑی بے چینی سے میرا اور فرحانہ کا انتظار کر رہے ہوں گے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ بے چینی تشویش کا روپ دھار چکی تھی۔ ان کے ذہن رفتہ رفتہ وحشت اور دہشت کا شکار ہو رہے ہوں گے۔

اپنے پیاروں کی کیفیت اور محسوسات کا تصور کر کے میں بے قرار ہو گیا۔ پھر میرا دھیان امی کی طرف چلا گیا۔

امی کو دوطرفہ پریشانی لاحق تھی۔ فرحانہ کے اغوا کی اطلاع انہوں نے ہی مجھے دی تھی۔ میں فیکٹری سے فوراً گھر آ گیا تھا۔ پھر امی ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ دن میں کسی اجنبی نے فون کر کے میری ذات کے حوالے سے انہیں ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کی تھی۔ میں فوراً سے پیشتر سمجھ گیا تھا کہ وہ دھمکی آمیز فون کس پارٹی کی جانب سے کیا گیا ہو گا۔ پچھلے دنوں میری اور خوش ولی کی مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں خالد رشید صاحب کی فارماسیوٹیکل کمپنی میں ایک بڑے ہیر پھیر کا انکشاف ہوا تھا اور جعلی ادویہ کی ترسیل میں ملوث فیکٹری کے تین اہم عہدے داروں کو

خاموشی کے ساتھ فائر کر دیا گیا تھا۔ جس انداز میں امی کو میرے حوالے سے دھمکی دی گئی تھی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ عظیم احمد، مرزا یاسین بیگ اور انور صاحب میں سے کسی کو پتا چل گیا تھا کہ ان کا سوا ستیاناس کرنے میں میرا ہاتھ تھا۔ جبھی ان میں سے کسی نے یا ان کے کسی آدمی نے میرے گھر فون کر کے امی کو دھمکانے کی کوشش کی تھی۔ ابھی میں اس محاذ سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ ندیم شیروانی نے شازیہ کے مغالطے میں فرحانہ کو اغوا کرا کے میرے لیے نہ صرف یہ کہ ایک نیا محاذ کھول دیا تھا بلکہ بڑی عیاری کے ساتھ مجھے ''جنگی قیدی'' بھی بنالیا گیا تھا۔

میں انہی پریشان کن خیالوں میں غلطاں تھا کہ میرا نگران ایک مرتبہ پھر سلاخ دار کھڑکی پر نمودار ہوا۔ اس مرتبہ وہ میرے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔

کھانا فاسٹ فوڈ کی شکل میں تھا۔ اس نے کھانے والی مخصوص تھیلی آہنی سلاخوں کے درمیان سے اندر پہنچائی اور کھرے لہجے میں بولا۔

''یہ جو کچھ بھی ہے تمہیں اسی سے پیٹ پوجا کرنا ہوگی۔ اب صبح سے پہلے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا' وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے کنی کاٹنے لگا تھا۔ یہ اس کی پس پائی تھی یا کوئی مصلحت' میں اس بارے میں سرِ دست کچھ نہیں کہہ سکتا تا۔

نگران کا فراہم کردہ فاسٹ فوڈ پر مشتمل وہ کھانا ابھی گرم تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت اچھی خاصی بھوک بھی محسوس کر رہا تھا لہٰذا میں نے پہلی فرصت میں کھانے سے انصاف کرنے کا فیصلہ کیا اور فاسٹ فوڈ والی مخصوص تھیلی کھول کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔

میں اس وقت جس نوعیت کے سنگین حالات سے گزر رہا تھا اس میں تو اچھے اچھوں کی بھوک پیاس اڑ جاتی ہے لیکن میں اس فلسفے کا قائل تھا کہ جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا اور ہر کام کا قدرت کے کارخانے میں ایک وقت مقرر ہے۔ لہٰذا وقت بے وقت کے اندیشوں اور خدشات کو اپنے اوپر حاوی کر لینا عقل مندی نہیں ہے جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہنا ہے۔ جب ہونی کو ٹالا نہیں جاسکتا تو پھر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوشیار اور چاق چوبند رہنا چاہیے۔ جورات قبر میں ہے وہ باہر نہیں ہوسکتی۔

میں نے بڑی تسلی سے ڈنر کیا اور کھانے کی باقیات یعنی کچرے وغیرہ کو اسی تھیلی میں ڈال کر آہنی سلاخوں والی کھڑکی کے پاس آ گیا پھر با آواز بلند میں نے اپنے نگران کو پکارا۔

''او گولی بھائی! تم کہاں ہو''

اس کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو میں نے اسے زیادہ بلند آواز میں پکارنا شروع کر دیا۔

''بھائی! تم کیسے پہرے دار ہو یہاں کمرے میں بند ہوں اور تم کہیں نظر نہیں آ رہے ہو۔ کہاں غائب ہوگئے گولی بھائی۔''

میری چیخ پکار کے نتیجے میں وہ سامنے آ گیا اور کینہ توز نظر سے گھورتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔

''کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے جو اس طرح چلا رہے ہو؟''

میں نے اس کی برہمی کو نظر انداز کرتے ہوئے معتدل لہجے میں پوچھا۔

''یار! تم کہاں چلے گئے تھے؟''

اس کی برداشت جواب دے گئی۔ ''تم مجھ پر نگران ہو یا میں تمہاری نگرانی کر رہا ہوں۔'' وہ

درشت لہجے میں بولا۔

''میں بھاڑ میں گیا تھا تمہیں مجھ سے کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے نگران تو تم ہی ہو بھائی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تو محض ایک مجبور اور بے بس قیدی ہوں۔''

''تمہیں اپنی حیثیت کا تو پتا ہے مگر اس کا احساس نہیں ہے۔'' وہ کسی فلسفی کے سے انداز میں بولا۔ ''تم ایک قیدی ہو' اگر اپنی حیثیت اور اوقات میں رہو گے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے ورنہ اگر تمہاری کسی بے ہودہ حرکت پر مجھے غصہ آ گیا تو اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہت برا برآمد ہوگا۔ میں تمہیں آخری بار وارننگ دے رہا ہوں۔ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھو۔ میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم کسی بھی حد تک نہیں جاسکتے۔''

اس کے پلے کچھ نہ پڑا' الجھن زدہ انداز میں مجھے گھورتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے۔''

''تھوڑی دیر پہلے جب میں نے تم سے پوچھا کہ کہاں چلے گئے تھے تو تم نے پتا ہے کیا جواب دیا تھا۔''

کیا جواب دیا تھا؟'' وہ الٹا مجھی سے پوچھ بیٹھا۔

''تم نے جواب دیا تھا میں بھاڑ میں گیا تھا۔'' میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''تم نے مجھ سے سراسر جھوٹ بولا تھا۔ اگر تم واقعی بھاڑ میں گئے ہوتے تو تمہارا چہرہ' ہاتھ پاؤں اور جسم کے دیگر حصے جگہ جگہ سے جل بھن چکے ہوتے جبکہ تم مجھے صحیح و سالم نظر آ رہے ہو۔''

وہ پاؤں پٹختے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ''بکواس بند کرو اور بتاؤ' چلا چلا کر مجھے کیوں بلا رہے تھے؟''

میں نے کھانے کی باقیات والی تھیلی اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ہڈیاں اور دیگر کچرا ہے۔ اسے کسی کچرا دان میں پھینک دو۔ میں اسے کمرے میں نہیں رکھ سکتا ورنہ کاکروچ اور دیگر حشراتِ الارض قطار در قطار میرا مزاج پوچھنے چلے آئیں گے۔ میں فرش پر بچھی چٹائی پر لیٹوں گا۔ زمین پر رینگنے والی خلائی مخلوقات مجھے ایک پل کے لیے نہیں سونے دیں گی۔''

اس نے میرے ہاتھ سے کچرے والی تھیلی لے لی پھر خفگی آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''اور کچھ......؟''

''دس پندرہ منٹ کے بعد کمرے کی لائٹ آف کر دینا۔'' میں نے فرمائشی انداز میں کہا۔

''لائٹ آف نہیں ہوسکتی۔'' وہ دو ٹوک الفاظ میں بولا۔

''بھائی! مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔'' میں نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''ٹیوب لائٹ کی روشنی میری آنکھوں میں چبھ رہی ہے میں ڈھنگ سے سو نہیں سکوں گا۔ مجھ پر کچھ تو رحم کھاؤ۔''

''تم رحم کے قابل ہوتے تو باس تمہیں پکڑ کر یوں اس کمرے میں قید نہ کر دیتا۔'' وہ حقارت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک خطرناک دہشت گرد ہو۔''

''ایک منٹ کے لیے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں کہ میں ایک تخریب کار اور دہشت گرد ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ مجھے پکڑنے کے بعد پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا

گیا۔ تمہارے باس نے مجھے اپنی نجی قید میں کیوں ڈال رکھا ہے۔"

"تم میرے باس کے مجرم ہو۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "تمہاری قسمت کا فیصلہ باس ہی کرے گا۔ وہ تمہیں ادھر ہی قید رکھے یا پولیس کے حوالے کردے یہ اس کی مرضی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔

"تمہارے باس سے جب ملاقات ہوگی تو میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ اپنی مرضی کا مالک کب سے بن بیٹھا ہے۔" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم مہربانی کرکے کمرے کی لائٹ آف کردو۔"

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا' یہ لائٹ آف نہیں ہوسکتی۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں' خاص وجہ ہے۔"

"کیا وجہ ہے مجھے بتاؤ۔"

"نہیں بتا سکتا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے تلخی بھرے میں کہا۔ "نہ بتاؤ اور میری طرف سے بچی کچی بھاڑ میں جاؤ۔"

اس نے کھا جانے نظر سے مجھے گھورا اور کھڑکی کے سامنے سے ٹل گیا۔

میں نے چٹائی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ لائٹ آف نہ کرنے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آرہی تھی کہ گولی نامی اس نگران کو مجھ پر شک ہوگیا تھا کہ اگر کمرے میں اندھیرا ہوا تو وہ بھرپور انداز میں میری نگرانی نہیں کرسکے گا اور تاریکی کا سہارا لیتے ہوئے اگر میں نے اس کمرے سے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ مجھے آسانی سے قابو میں نہیں کرسکے گا اور بالفرض محال' اگر میں اس کی دسترس سے نکل گیا تو شیروانی اس کی کھال کھنچوانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔

نگران کچھ زیادہ غلط بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ غیر محسوس انداز میں وہ میری نیت بھانپ چکا تھا۔ میں واقعی رات کی تاریکی میں اس نوعیت کی کوئی کارروائی کرنے کے موڈ میں تھا۔ واش روم کے اندر رکھے آہنی پائپ کے مختلف پیس اور پھٹے ہوئے دستے والا پیچ کس مجھے کسی سنسنی خیز مہم جوئی پر مسلسل اکسا رہا تھا اور یہ کام رات کی تاریکی میں ہی بطریق احسن انجام دیا جاسکتا تھا۔

میں اگر چاہتا تو اسٹارٹر نکال کر یا کسی اور طریقے سے راڈ کو لوکر کے ٹیوب لائٹ کو آف کرسکتا تھا۔ لیکن یہ نگران کو خواہ مخواہ تشویش میں ڈالنے والی بات ہوتی لہٰذا میں اس کڑوی گولی کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے چٹائی پر لیٹ گیا۔ میں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بھی فرش پر ہی سونے کا عادی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گھر میں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور یہاں قید خانے میں چٹائی تھی۔ میں تکیہ لینے کا بھی عادی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بازو کو تکیے کے مانند اپنے سر کے نیچے رکھا اور آنکھوں کو ٹیوب لائٹ کی روشنی سے محفوظ رکھنے کے لیے دوسرے بازو کو چہرے کے اوپر لا ہی رہا تھا کہ کھوپڑی کے عقبی حصے میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ میں گولی سے مغز ماری کے دوران میں اپنے سر کی چوٹ کو بھلا بیٹھا تھا۔ مگر چت لیٹنے کے باعث جب متاثرہ حصے پر دباؤ پڑا تو وہاں سے ٹیسیں خارج ہونے لگی تھیں لامحالہ میں کروٹ کے بل لیٹنے پر مجبور ہوگیا۔

آنکھیں بند کیں تو فرحانہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے تصور میں روشن ہوگئی۔ پھر اس کا پیار میرے تخیل سے اٹکھیلیاں کرنے لگا۔ یہ تصور اور تخیل بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ خیالات کی پرواز سے انسان نت نئے جہانوں کی سیر کو نکل جاتا ہے۔ خیال کی طاقت اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے اور ایک عام نفسیاتی تجزیے کے مطابق' انسان کو "خیالات کا مجموعہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رحمان اور شیطان دونوں ہی انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ انسان اپنے خیالات کی طاقت سے ان میں سے جس کو فیڈ کرتا ہے وہ قوی سے قوی ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس طرح فیڈر پینے والا بچہ ہر گزرتے دن کے ساتھ طاقت ور اور توانا ہوتا چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح انسان اپنے اندر موجود رحمان یا شیطان میں سے جس کی ضیافت کا اہتمام کرتا ہے اسی کی قوت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو پاکیزہ اور توانا خیالات کے مالک افراد کی صحبت اختیار کرنا چاہیے۔ تاکہ اس کے اندر موجود مثبت صلاحیتوں کو تقویت ملے اور وہ رحمان سے زیادہ قریب ہوتا چلا جائے۔ گندے اور شیطانی خیالات کے مالک افراد کا ساتھ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ وہ شیطان کی شاگردی اختیار کرکے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کا کباڑا کرلیتا ہے۔

میرے اور فرحانہ کے بیچ پاکیزہ محبت کا جو رشتا قائم ہوچکا تھا۔ اس کی روحانی لطافتوں کو میں نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ پتا نہیں کب سے میری چاہت کو اپنے دل میں دبائے بیٹھی تھی۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنی اسٹوڈنٹ کی نظر سے دیکھا تھا۔ پھر جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو اس کی محبت کی طاقت مجھ پر عیاں ہوگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی صدیوں سے اس کی چاہت میں گرفتار ہوں۔ اس احساس کے ساتھ ہی ہمارے بیچ سے من و تو کے سارے پردے اٹھ گئے تھے اور ہم ایک دوسرے کے دل میں دھڑکنے لگے تھے لیکن ہماری محبت کا پودا ابھی تناور درخت بن نہیں پایا تھا کہ شیروانی کا منحوس سایہ اس پر پڑ گیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں شیروانی کی قید میں تھے اور دو مختلف مقامات پر ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ فرحانہ کی بے قراری مجھ سے سوا ہوگی۔

پتا نہیں' میں کب تک فرحانہ کی یادوں کے ساتھ لپٹ کر اپنے ناآسودہ جذبات اور تشنہ احساسات کی آب یاری کرتا رہا۔ دل ربائی اور محبوبیت کی اسی کیفیت میں مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ میں نے کب نیند کی نرم اور گرم آغوش میں سر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان دن بھر جن خیالات میں گھرا رہتا ہے نیند کی حالت میں وہ اسی سے متعلق خواب بھی دیکھتا ہے۔ اگر دن خوش گوار اور کامیاب گزرا ہو تو خواب بھی امید افزا دیکھنے کو ملتے ہیں اور اگر پورا دن کسی ٹینشن' کوفت یا پریشانی میں بیتا ہو تو لامحالہ خواب بھی مایوس کن اور اندیشوں سے بھرپور آتے ہیں۔ خصوصاً سونے سے پہلے انسان کے ذہن میں جس قسم کی سوچ ہوتی ہے خواب میں اسی کا عکس ابھرتا ہے۔

میں نیند کی وادی میں اترنے سے پہلے فرحانہ کی یادوں کے ساتھ نبرد آزما تھا اور تازہ ترین حالات نے میری سوچ کو مکڑی کے جالے کی مانند اپنے اندر الجھا رکھا تھا اور یہ صورت حال یقیناً خوش گوار نہیں تھی لہٰذا میں نے حالت نیند میں جو خواب دیکھا وہ ہمارے حالات ہی کی ترجمانی کرتا تھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ میں اور فرحانہ ندیم شیروانی کی قید میں ہیں۔ اس نے ہمیں اپنی چال بازی سے مجبور اور بے بس کر رکھا ہے۔ فرحانہ کو ایک قدآدم مضبوط آہنی پنجرے کے اندر قید کیا گیا۔ وہ پنجرا فرش پر رکھا ہے۔ پنجرے سے کچھ فاصلے پر میں بھی فرش پر موجود ہوں۔ میرے ہاتھ اور پاؤں کو نائیلون کی مضبوط رسیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ میں اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی سکت نہیں رکھتا۔ شیروانی کے آدمیوں نے مار مار کر میرا ابھر کس نکال دیا ہے۔ میرا پورا بدن پھوڑے کی مانند دکھ رہا ہے۔ شیروانی میری بے بسی کا مذاق اڑانے کے لیے میری پسلیوں میں اپنے پاؤں سے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہتا ہے۔

''چلو اٹھو اور اپنی محبوبہ کو اس پنجرے سے آزاد کراؤ۔''

میں باوجود کوشش کے بھی فرش سے اٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہوں۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ میں شیروانی کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں مگر افسوس کہ میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ شیروانی میری اس مجبوری اور کمزوری سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ مجھے ذلیل کرنے کے لیے پے در پے میرے دونوں پہلوؤں میں ٹھڈے برسا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ زہریلے لہجے میں میری خود داری پر بھی اپنی کڑی زبان سے مسلسل حملے کیے جا رہا ہے۔

''بڑے سورما بنتے تھے نا اب کیوں حقیر کیچوے کی طرح پڑے ہوئے ہو۔ کہاں گئی وہ تمہاری اکڑ۔ مجھے آنکھیں کیوں نہیں دکھا رہے ہو۔ دیکھا' میں نے کیسے تمہاری ساری اکڑفوں ناک کے راستے نکال دی ہے۔''

وہ جب بھی میری پسلیوں میں اپنے بوٹ سے ضرب لگاتا ہے' میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھتا ہوں۔ فرحانہ بے بسی سے میری بے کسی کا نظارا دیکھ رہی ہے۔ ان لمحات میں وہ مجھ سے بھی زیادہ مجبور دکھائی دیتی ہے۔ وہ آہنی پنجرے کو توڑ کر میرے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں اس کی رونی صورت دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہوں۔ جب یہ ذلت میری برداشت میں نہیں رہتی تو میں حلق کی پوری قوت سے چلا اٹھتا ہوں۔

''حرامی...... سور کی اولاد۔'' میرا مخاطب ندیم شیروانی ہوتا ہے۔ ''تم مرد نہیں ہو' ہیجڑے ہو۔ اگر تجھ میں ذرا سی بھی مردانگی ہے تو میرے ہاتھ پاؤں کھول دے پھر میں تجھے بتاؤں گا کہ میں کتنا بڑا سورما ہوں۔ تم نے اپنی ماں کا نہیں کسی ناپاک مادہ کا دودھ پی رکھا ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر شیروانی کے پاؤں کی جناتی ٹھوکر نے میرے پہلو میں جیسے انگارے سے بھر دیے۔ تکلیف اتنی شدت کی تھی کہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھ کھلتے ہی میری پسلیوں پر ایک اور ٹھڈا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی گولی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ خون خوار انداز میں مجھ سے مخاطب تھا۔

''مجھے گالی دیتا ہے میں تو تیرا لہو پی جاؤں گا۔''

صورت حال مجھ پر واضح ہوئی تو میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گولی کو کمرے کے اندر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور بے ساختہ میری نگاہ کمرے کے دروازے کی سمت اٹھ گئی۔ دروازہ نیم وا تھا۔ گولی نے فوراً میری نگاہ کے مفہوم کو پا لیا اور اس سے پہلے کہ میں کسی قسم کی کوئی الٹی فیسی دکھانے کی کوشش کرتا وہ مجھے گن کے نشانے پر رکھتے ہوئے بڑی سرعت سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے پہلے

وہ دروازہ بند ہونے اور ازاں بعد لاک ہونے کی آواز آئی اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے نیند میں شیروانی سے جو ٹھڈے کھائے تھے وہ دراصل گولی کی کارستانی تھی۔ میں بے خبر سو رہا تھا اور وہ مجھے جگانے کے لیے کمرے کے اندر گھس آیا تھا۔ اس نے پہلے کھڑکی کے راستے آواز دے کر مجھے جگانے کی کوشش کی ہوگی۔ جب میری آنکھ نہیں کھلی تو مجبوراً اسے کمرے کے اندر آ کر میرے پہلوؤں میں ٹھوکریں رسید کرنا پڑی تھیں۔ وہ مجھے گہری نیند سے کیوں بے دار کرنا چاہتا تھا؟

اس سوال نے میرے رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ اگلے ہی لمحے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یقیناً کوئی اہم بات تھی ورنہ گولی کمرے کے اندر آنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ایسا کون سا ایمرجنسی معاملہ تھا اس کے بارے میں گولی ہی مجھے بتا سکتا تھا۔

میں بڑی سرعت سے قدم اٹھاتے ہوئے سلاخ دار کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اسی لمحے گولی بھی میرے سامنے آ موجود ہوا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تم گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے تمہیں کئی بار آواز دی مگر تم ٹس سے مس نہ ہوئے مجبوراً مجھے کمرے کے اندر آ کر کچھ کارروائی کرنا پڑی۔''

''کارروائی یا بے ہودگی۔'' میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا۔ ''تم نے ٹھڈے مار مار کر میری پسلیوں کا کچومر نکال دیا ہے۔''

''میں باس کے حکم پر تمہاری جان بھی لے سکتا ہوں۔'' وہ خطرناک لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی۔ یہ سب باس کا حکم تھا۔''

''باس کا حکم!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم نے شیروانی کے کہنے پر مجھے جگایا ہے؟''

''ہاں ایسی ہی بات ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''باس اس وقت یہاں بنگلے کے اندر موجود ہیں۔ وہ چند لمحات میں تمہیں شرف ملاقات بخشیں گے اس لیے تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ اور ہاں......!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس ملاقات کے دوران میں' میں بھی باس کے قریب ہی موجود رہوں گا۔ اگر تم نے باس کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو میں تم پر گولی چلانے میں ایک لمحے کا بھی انتظار نہیں کروں گا۔ میں تمہیں جان سے تو نہیں ماروں گا مگر تمہیں شدید زخمی کر کے اپاہج ضرور بنا دوں گا۔ میری وارننگ کو یاد رکھنا۔'' بات ختم کرتے ہی وہ راہ داری میں غائب ہو گیا۔

یہ جاننے کے بعد کہ ندیم شیروانی اس بنگلے میں موجود ہے اور مجھ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ میرے رگ وپے میں سنسنی سی بھر گئی تھی۔ وہ میرے سامنے آتا تو میں اسے اس کی کمینگیاں گن گن کر بتاتا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں مجھ پر بہت زیادہ ادھار چڑھا دیا تھا۔ مجھے یہ ادھار مع سود اتارنا تھا اور پہلی فرصت میں اتارنا تھا۔

شیروانی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ لمحات میرے ذہن میں پھر گئے جب کمرے کے اندر گولی ٹھڈے مار مار کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش کے دوران وہ میرے انتہائی قریب تھا۔ اگر میں چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ کھینچ سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ساعتوں میں مجھے

بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ کس قسم کے حالات پیش آرہے تھے اور جب مجھے صورت حال کا احساس ہوا تو تیر کمان سے نکل چکا تھا یعنی گولی مجھ سے محفوظ فاصلے پر جا چکا تھا اور اس نے مجھے گن کے نشانے پر بھی رکھا ہوا تھا۔ اگر میں جست بھر کر اسے دبوچنے کی کوشش کرتا تو وہ کمرا فائرنگ کی وحشیانہ تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھتا اور میرا وجود اپنے ہی خون میں نہا کر رہ جاتا۔

وقت وقت کی بات ہوتی ہے اور یہ وقت بہت ہی ظالم ہے۔ بڑے سے بڑے طرم خان کو بھی اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان لمحات میں وقت شیروانی کا ساتھ دے رہا تھا اس لیے میں اس کے آگے فی الحال بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

میں کھڑکی سے لگا کھڑا تھا کہ گولی اس طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے ایک آرام دہ کرسی اٹھا رکھی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق یہ کرسی شیروانی کے لیے تھی وہ کمرے کے اندر گھس کر مجھ سے ملاقات کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ راہ داری میں اس کرسی پر بیٹھ کر مجھ سے ہم کلام ہوگا۔

گولی نے وہ کرسی کھڑکی کے عین سامنے راہ داری میں رکھی اور اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز سے یہی لگتا تھا کہ کوئی لمحہ جاتا ہے شیروانی وہاں موجود ہوگا۔

پھر ایسا ہی ہوا راہ داری میں مجھے شیروانی کی جھلک نظر آئی۔ وہ ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون نظر آتا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا میدان مار لیا ہو۔

وہ پر اعتماد قدموں سے چلتے ہوئے کرسی کے قریب پہنچا پھر اس پر براجمان ہونے کے بعد میرے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے بولا۔

"کیسے ہو کاغذی شیر؟"

اس کا یہ استفسار یہ جملہ میرے زخموں میں نمک بھرنے کے مترادف تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میرا نام اسد اللہ ہے۔ میں کاغذی شیر نہیں بلکہ اللہ کا شیر ہوں۔ تم نے دھوکے سے مجھے بے بس کر کے اپنی قید میں ڈال رکھا ہے۔ اگر تم مرد کے بچے ہو تو میرے سامنے آؤ۔ جب ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالیں گے تو پتا چل جائے گا کون اصلی شیر ہے اور کون کاغذی شیر......!"

"دھوکے باز کی زبان سے ایمان داری کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اصلی اور نقلی کا فیصلہ تو وقت کرے گا مگر میرے کسی دھوکے کا ذکر کرنے سے پہلے تمہیں اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے۔ جعلی نوٹوں کے بنڈل گلستانِ جوہر والے بنگلے پر پہنچا کر تم نے کون سی ایمان داری کا ثبوت دیا تھا؟"

"میں ایمان داری صرف اہل ایمان کے ساتھ دکھاتا ہوں۔" میں نے حقارت بھری نظر سے شیروانی کی طرف دیکھا۔ "تم جیسے بے ضمیر لوگوں کے ساتھ جو بھی چال چلی جائے جائز ہے۔"

گولی شیروانی کے پہلو میں گن سونتے کھڑا تھا۔ میں نے شیروانی کو "بے ضمیر" اور "بے ایمان" جیسے القابات سے نوازا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس نے گن کو لہراتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ اپنے باس کی تذلیل برداشت نہیں کر پایا تھا۔

اسی وقت شیروانی نے ہاتھ اٹھا کر گولی کو شانت رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"فرحانہ تمہاری محبوبہ ہے۔ تم اس سے محبت کرتے ہو لیکن یہ نہیں جانتے کہ محبت اور جنگ میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے۔ میں کسی چال کے ذریعے ہی تمہیں اپنے قابو میں لا سکتا تھا اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو چکا ہوں۔"

"تم نے محبت اور جنگ کا ذکر کیا ہے تو یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ تم نے میرے ساتھ جس جنگ کا آغاز کیا ہے یہ تمہیں نیست و نابود کر دے گی۔ میں اس جنگ میں ہر وہ حربہ آزماؤں گا جو تمہیں انگاروں پر لوٹنے پر مجبور کر دے گا۔"

"یہ تو جب کی بات ہے جب تم میری قید سے آزادی پانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ابھی تو تم ایک بے بس چوہے کی مانند میری کسٹڈی میں ہو اور تمہاری محبوبہ بھی میری دسترس میں ہے۔"

"تم نہایت ہی گھٹیا اور کمینے انسان ہو شیروانی۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "اگر تم میرے ہتھے چڑھ گئے نا تو دیکھنا' میں کس طرح کاٹ پیٹ کر تمہیں کوٹ میں تبدیل کرتا ہوں۔"

"یہ حسرت تم اپنے دل میں لے کر مر جاؤ گے۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "اور وہ بھی حرام موت......!"

"میری موت تمہارے ناپاک ہاتھوں سے نہیں ہو سکتی۔" میں نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔ "بلکہ میں بہت جلد تم جیسے غلیظ انسان کا تیا پانچا کر کے اس دنیا کی آلودگی میں قدرے کمی کر دوں گا۔"

"جتنا بھی بڑھ چڑھ کر بول سکتے ہو بول لو۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "تمہاری ایک دن کی زندگی باقی ہے میں کل پھر یہاں آؤں گا اور میرے ساتھ تمہاری گرل فرینڈ فرحانہ بھی ہوگی۔ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کے ساتھ اپنی فتح کا جشن مناؤں گا۔ تم اسے میری باہوں میں دیکھو گے اور دل مسوس کر رہ جاؤ گے۔ تمہارے ذہن میں مجھے قتل کرنے کا سو بار خیال آئے گا لیکن تمہاری بے بسی اور بے کسی پاؤں کی زنجیر بن کر رہ جائے گی۔ تم ایک بے غیرت شخص کی طرح اپنی محبوبہ کو میری آغوش میں دیکھنے پر مجبور ہو گے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" میں جنگلی درندے کی مانند دہاڑا۔ "ہرگز نہیں۔"

"تمہارے کہنے اور سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ احمق انسان۔" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا اور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نے جو کہا ہے اسے سچ بھی کر دکھاؤں گا بس ایک دن انتظار کر لو صرف ایک دن۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کر سکو گے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے ایسا سوچا بھی تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا جو دیکھنے والوں کے لیے عبرت کا نشان ہو۔"

"تم میرے قیدی ہو۔" وہ کھڑکی سے محفوظ فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا۔ "اس قید خانے میں تمہیں میری مرضی کے مطابق سانس لینا ہے' لہٰذا لمبے چوڑے دعوؤں کو بھول جاؤ اور کل رات کا انتظار کرو۔ جب میں تمہاری نگاہ کے سامنے فرحانہ سے رومان کروں گا اور یہ ثابت کر کے دکھا دوں گا کہ وہ تمہاری نہیں' میری محبوبہ ہے۔"

بات کے اختتام پر اس نے تیر برساتی ہوئی فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے غراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"شیروانی! تم نے مجھ سے نہیں' اپنی موت سے ٹکر لی ہے۔ تمہارا انجام کتنا بھیانک ہوگا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"فی الحال تو تم اپنے انجام کی فکر کرو۔" وہ

خطرناک انداز میں مجھے گھورتے ہوئے بولا پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے کچھ رقم برآمد کی۔ دو ہزار روپے مالیت کے چند نوٹ تھے۔ مذکورہ رقم کو وہ کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر پھینکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

''رکھ لو یہ تمہارے کسی کام آ جائے گی۔ یہ وہی دس ہزار ہیں جو تم نے جعلی نوٹوں والی گڈیوں کے اوپر نیچے لگا کر گلستانِ جوہر والے بنگلے تک پہنچائے تھے۔ اپنی محبوبہ کو چھڑانے آئے تھے اور وہ بھی نقلی نوٹوں کے سہارے۔'' اس نے لمحاتی توقف کر کے حقارت بھری نظر مجھ پر ڈالی اور زہریلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''افسوس کہ تم نے فرحانہ کی قدر نہیں کی۔ وہ حسینہ تو ہیرے موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ تم کل رات والے جشن میں دیکھنا میں کس شان سے فرحانہ کی پذیرائی کروں گا۔ تمہاری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔''

میں جانتا تھا' وہ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے اس قسم کی سلگانے والی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے بھڑکنے کے بجائے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں نے جوہر والے بنگلے میں فرحانہ کی خوفزدہ آواز سنی ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔''

''وہ جہاں بھی ہے' محفوظ ہے!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''میں نسوانی حسن اور جوانی کا دلدادہ ہوں۔ وہ کل رات میرے ساتھ ہی یہاں پہنچے گی اور تم دیکھو گے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ بالکل درست ہے اور وہ جو......!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے گلستان جوہر والے بنگلے میں فرحانہ کی آواز سنی تھی نا۔ وہ محض آواز ہی تھی۔ فرحانہ کی ریکارڈ شدہ آواز۔ فرحانہ نے اس بنگلے میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ یہ سارا چکر میں نے تمہیں ٹریپ کرنے کے لیے چلایا تھا۔''

''تم شیطان درجہ اول ہو۔'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ میرے تبصرے کو سنا ان سنا کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری ساری فکر اپنی محبوبہ کی ذات کے گرد ہی گھوم رہی ہے۔ اپنے اس دوست کے بارے میں کچھ نہیں پوچھو گے جو بدلے ہوئے بھیس میں رکشا ڈرائیور بن کر تمہیں گلستان جوہر کے بنگلے تک چھوڑنے آیا تھا۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے شدید ترین فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ تم نے خوش ولی کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''تمہاری طرح وہ بھی میری کسٹڈی میں ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

''اسے تم سے دور ایک خفیہ مقام پر قید کیا گیا ہے۔ فائرنگ کے نتیجے میں وہ زخمی ہو گیا تھا۔ اینی ہاؤ' پرسوں صبح تک تم دونوں جگری یاروں کی لاشیں کسی گٹر سے برآمد ہو جائیں گی۔ پولیس تمہیں ٹارگٹ کلنگ کے کھاتے میں ڈال کر معاملہ صاف کر دے گی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے معاندانہ نظر سے مجھے گھورا پھر پرغرور انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ گولی بھی اس کے پروٹوکول میں راہ داری میں غائب ہو گیا۔

شیروانی نے فرحانہ کی ذات کے حوالے سے جو گندی زبان استعمال کی تھی اس نے مجھے اندر سے بے چین کر دیا تھا۔ اس کے ناپاک الفاظ میرے رگ

دیے میں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی مانند پرواز کر رہے تھے۔ میری روح لہولہان ہو رہی تھی اور قلب و جگر میں جیسے دہکتے ہوئے انگارے سے بھر گئے تھے۔

دماغ کسی تنور کی طرح تپ رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا میرا وجود ایک خوف ناک دھماکے سے پھٹ کر فضا میں بکھر جائے گا۔

چند ہی دنوں میں فرحانہ میری زندگی کا حساس اور نازک ترین حصہ بن چکی تھی۔ اس کی ذات کے حوالے سے کوئی بھی منفی بات میری برداشت سے باہر تھی۔ شیروانی نے گویا اس فضول گوئی سے مجھے سپرد عذاب کر دیا تھا۔

شیروانی نے جن غلیظ عزائم کا ابھی اظہار کیا تھا' میں اسے ان میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دے سکتا تھا' شیروانی کو شکست فاش دینے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کی قید سے نجات حاصل کر لیتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے پورے جنگل میں اس کا ٹہکا ہوتا ہے۔ کوئی بھی چھوٹا بڑا جانور اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا مگر جب یہی جنگل کا بادشاہ چڑیا گھر کے پنجرے کی زینت بنتا ہے تو چند ہی دنوں میں اس کا رعب و دبدبہ اور ساری اکڑ اڑن چھو ہو جاتی ہے۔ ہمارے اور آپ کے بچے پنجرے میں بند شیر پر مختلف آوازیں کستے ہیں مگر وہ اف تک نہیں کرتا۔ بس کبھی کبھار وہ گردن موڑ کر بچوں کی طرف دیکھتا ہے اور حلق سے ایک مریل سی دہاڑ خارج کر کے رہ جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے' وہ اپنی موجودی کا احساس دلا رہا ہو۔

قید اور غلامی دو ایسی چیزیں ہیں جو کسی بھی جاندار بشمول انسان کی شان' وقار اور عزت نفس کا جنازہ نکال کر رکھ دیتی ہیں پھر اس کی حیثیت کسی حقیر کیڑے سے زیادہ نہیں رہتی۔

مجھے پہلی فرصت میں شیروانی کی قید سے نکلنا تھا۔ اس نے مجھے بھڑکانے اور غصہ دلانے کیے فرحانہ کی ذات کے بارے میں جو بکواس کی تھی میں نے اسے ذہن سے جھٹکا اور پلٹ کر اپنے موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔

میں جیسے ہی کھڑکی سے پلٹا' کمرے کے فرش پر پھیلے ہوئے نوٹ میری نگاہ میں آ گئے۔ یہ ہزار والے دس نوٹ شیروانی نے اس طرح کمرے میں پھینکے تھے جیسے کوئی تماش بین کسی چھیل چھبیلی رقاصہ پر نچھاور کرتا ہے۔ کھڑکی کے راستے بڑے بازاری انداز میں شیروانی نے یہ دس ہزار کمرے کے اندر پہنچائے تھے۔

میں نے جھک کر وہ نوٹ سمیٹے اور انہیں اپنی جینز کی پاکٹ میں رکھ لیا۔ یہ فرحانہ کے باپ عبدالخالق کے خون پسینے کی حلال کمائی تھی۔ ایک ایک لاکھ والی نوٹوں کی پانچ گڈیاں تیار کرنے کے لیے نقلی نوٹ خوش ولی نے فراہم کیے تھے جبکہ ہر گڈی کے اوپر اور نیچے ایک ایک اصلی نوٹ لگایا گیا تھا تاکہ دیکھنے میں وہ اصلی نوٹوں کی گڈیاں ہی نظر آئیں اور یہ دس ہزار انکل خالق نے دیے تھے۔

شیروانی نے بڑی چالاکی سے میرے دوست خوش ولی کو بھی قابو کر لیا تھا۔ اس کے مطابق' خوش ولی زخمی تھا اور اس کی قید میں تھا۔ شیروانی نے بڑے سفاک انداز میں ان خیالات کا اظہار بھی کیا تھا کہ پرسوں صبح میری اور خوش ولی کی لاشیں شہر کے کسی گٹر سے برآمد ہوں گی اور ہماری اموات کو ٹارگٹ کلنگ کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ گویا بڑے واضح الفاظ میں اس نے مجھے باور کرایا تھا کہ وہ ہم دونوں دوستوں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرے لیے

اطمینان بخش بات یہ تھی کہ وہ اپنے اس "قاتلانہ منصوبے" پر کل رات کسی وقت یا پھر پرسوں صبح عمل کرنا چاہتا تھا۔ میرے لیے اتنا وقت بہت تھا۔ میں شیروانی کو اس کے مذموم عزائم میں کامیاب ہونے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔

پتا نہیں' وہ رات کا کون سا پہر تھا۔ ٹائم معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ مجھے میسر نہیں تھا۔ میں تیزی سے ٹیوب لائٹ کی جانب بڑھا۔ اس وقت میرا ذہن تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر اس کمرے کے اندر تاریکی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ٹیوب لائٹ دیوار پر اتنی بلندی پر نصب تھی کہ میں فرش پر کھڑے ہو کر اسے چھو نہیں سکتا تھا۔ ایک فوری اور اضطراری خیال کے تحت میں واش روم میں پہنچا اور پانی والی بالٹی کو خالی کر کے اپنے ساتھ لے آیا پھر مذکورہ بالٹی کو فرش پر الٹا رکھ کر میں اس پر چڑھ گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے ٹیوب لائٹ کا اسٹارٹر نکال کر اسے بے نور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔

میں نے پانی والی بالٹی کو واش روم میں رکھا اور اسٹارٹر کو بھی وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اسی لمحے کمرے سے باہر راہ داری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ وہ یقیناً میرا نگران گولی ہی تھا۔ کمرے کے اندر ہونے والی تاریکی نے اسے مضطرب کر دیا ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر میں کھڑکی کے سامنے گولی کی شکل نظر آئی۔ اس دوران میں' میں بھی سلاخ دار کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تم نے ٹیوب لائٹ کیوں بند کر دی۔"

"لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا۔" میں نے غصیلے انداز میں اسے لتاڑا۔ "کیا اس لائٹ کا سوئچ کمرے کے اندر ہے جو میں اسے بند کر سکوں گا؟"

"سوئچ کمرے کے اندر نہیں ہے۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔ "لیکن میں نے لائٹ کا سوئچ آف نہیں کیا تو پھر یہ خود بخود بند کیسے ہو گئی۔ تم نے ضرور ٹیوب لائٹ کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی ہے۔"

"بکواس نہیں کرو۔" میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "ایک تو تمہارا ابا اس میرے دماغ کا ٹمپریچر بڑھا کر گیا ہے۔ اوپر سے تم نے الٹی سیدھی باتیں شروع کر دی ہیں۔"

لائٹ بجھ جانے سے یکایک کمرے میں تاریکی چھا گئی تھی۔ لیکن اب معاملہ قدرے مختلف تھا۔ راہ داری میں روشن لائٹ کھڑکی کے راستے اس قدر اندر پہنچ رہی تھی کہ اب وہاں اندھیرے کا مکمل راج نہیں تھا۔ کمرے کے اندر ملگجے اجالے کی سی کیفیت تھی۔ اس معمولی سی روشنی نے بڑی کامیابی کے ساتھ گھپ اندھیرے میں سیندھ لگائی تھی جس سے اندر کا منظر بڑی حد تک واضح ہو گیا تھا۔

گولی چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی اور شک بھری نظر سے مجھے گھورتا رہا پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

"دیکھو میرے ساتھ کوئی چالاکی مت کرنا۔ تمہیں اندازہ نہیں میں تمہارے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہوں۔"

"اوئے کسی خطرناک چالاکی کی اولاد۔" میں ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو خود اندر آ کر ٹیوب لائٹ کا معائنہ کر لو۔ تمہیں سب پتا چل جائے گا۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی ہے یا نہیں۔"

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے میرے بیان کی سچائی کو جانچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس موقع پر میں نے اس کی دکھتی رگ پر دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا اور

کہا۔

”تم نے اپنے باس سے ہونے والی میری ساری گفتگو سنی ہے۔ تمہیں اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں کوئی خطرناک دہشت گرد نہیں ہوں۔ تمہارا باس خوامخواہ میرا دشمن ہورہا ہے۔ تمہیں اپنے باس کی مکاری اور میری معصومیت کا یقین آیا یا نہیں۔“

”باس نے تمہیں تخریب کار اور دہشت گرد کہا تو تم میری نظر میں ایسے ہی تھے۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”اب اگر ایسا ظاہر ہورہا ہے کہ تمہارے اور باس کے بیچ کسی اور نوعیت کی دشمنی ہے تو میں ایسا ہی سمجھوں گا۔“ لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”میری نگاہ میں تم ہر حال میں ایک خطرناک انسان ہو اور میرے باس کے دشمن بھی ہو لہٰذا میں تمہاری کڑی نگرانی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرسکتا۔“

”اور اس کڑی نگرانی کا تقاضا ہے کہ تم ٹیوب لائٹ کو چیک کرنے کے لیے کمرے کے اندر آنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ ہیں نا......؟“

میرے طنزیہ الفاظ کو اس نے بڑی مشکل سے ہضم کیا اور بے پروائی سے بولا۔ ”تم جو بھی سمجھو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”فرق پڑتا ہے بہت فرق پڑتا ہے۔“ میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”اور یہ تم نے کیا کہا کہ میں جو بھی سمجھوں۔ میں تو وہی سمجھوں گا جو حقیقت ہے اور حقیقت یہی ہے کہ تم ایک بزدل اور ڈرپوک انسان ہو۔“

”کیا بکتے ہو۔“ وہ چیخ سے مشابہ لہجے میں بولا' پھر گن کو خطرناک انداز میں حرکت دیتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”تم نے مجھے کس بنیاد پر ڈرپوک اور بزدل کہا ہے؟“

”بنیاد۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تمہارے انگ انگ سے یہ جھلک رہا ہے کہ اس گن کے بل بوتے پر تم خود کو بہت بہادر سمجھ رہے ہو ورنہ تم میں اتنی ہمت نہیں کہ دروازہ کھول کر اندر آسکو۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے بڑے زہریلے الفاظ میں یوں اضافہ کیا۔

”گولی' گن اٹھانے سے کوئی بہادر نہیں ہوجاتا۔ اسے چلانے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے اور حوصلہ تم میں نہیں ہے۔“

”تم مجھے غصہ دلا کر میرے ہاتھوں حرام موت مرنے کی خواہش رکھتے ہو۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”لیکن میں تمہاری باتوں میں آ کر ایسا انتہائی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ اگر میں نے تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تو باس مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کل رات تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری محبوبہ کے ساتھ ایک جشن منانا چاہتا ہے اس لیے تمہیں اس وقت تک تو زندہ رہنا ہی ہوگا۔“

”تم احترام آدمیت سے عاری' احساسِ انسانیت سے محروم اور شقی القلب شخص ہو۔“ میں نے نفرت سے اسے گھورا۔ ”میرے جذبات کو کچلنے کے لیے تم اپنے باس کے جشن کا ذکر ایسے جوش و خروش سے کر رہے ہو جیسے کل رات اس جشن میں شیروانی تمہاری ماں سے نکاح کرنے والا ہو۔“

”اب اگر تم نے ایک لفظ کی بکواس بھی کی تو میں تمہاری زبان کو گدی سے کھینچ لوں گا۔“ وہ غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔

”میری زبان گدی سے کھینچ کر باہر نکالنے کے لیے تمہیں کمرے کے اندر آنا ہوگا یا پھر مجھے باہر بلانا ہوگا۔“ میں نے جلتی پر پیٹرول ڈالتے ہوئے کہا۔

”اور تم ایسا کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“

اس بار اس نے کوئی تلخ یا ترش جواب نہیں دیا۔ چند لمحات مجھے کھا جانے والی نظر سے گھورنے کے بعد وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میں سلاخ دار کھڑکی کے توسط سے راہ داری میں جہاں تک دیکھ سکتا تھا' وہاں وہ مجھے نظر نہیں آیا۔

میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ گولی نے شکست خوردہ تاثرات سے سجے اپنے چہرے کو مجھ سے چھپانے کے لیے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی مجبوری کو اس کی آنکھوں اور چہرے سے پڑھ سکوں۔ وقتی ہی سہی بہرحال یہ میری کامیابی تھی۔

......☆☆☆......

میں نے چٹائی کو کمرے کے فرش پر زاویہ بدل کر بچھالیا تھا اور پہلو کے بل اس انداز سے لیٹا ہوا تھا کہ سلاخ دار کھڑکی میری نگاہ میں تھی۔ اگر کوئی بھی شخص کھڑکی کی دوسری جانب موجود ہوتا تو وہ میری نظر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ میں بظاہر آنکھیں بند کیے اس طرح لیٹا تھا جیسے سو رہا ہوں لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں ان لمحات میں حد سے زیادہ ہشاش بشاش تھا اور میچی ہوئی آنکھوں کے بیچ بھی میں نے اتنی گنجائش رکھ چھوڑی تھی کہ بہ آسانی کھڑکی کی دوسری سمت ہونے والی کارروائی کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ البتہ کمرے میں نیم تاریکی کی موجودگی کے باعث کھڑکی کے راستے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ میں اس کی حرکات و سکنات کو واچ کر رہا ہوں یا گہری نیند سو رہا ہوں۔ بادی النظر میں' میں سویا ہوا ہی لگ رہا تھا۔

لگ بھگ دس منٹ کے بعد میری امید بر آئی۔ نیم وا آنکھوں سے میں نے سلاخ دار کھڑکی کی دوسری جانب اپنے نگران گولی کا چہرا دیکھا۔ وہ گہری نظر سے مجھے گھور رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ میں چپ سادھے اسی طرح بے حس و حرکت خاموش پڑا رہا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں گولی نے اس عمل کو تین چار مرتبہ دہرایا اور آخری بار تو اس نے مجھے آواز بھی دی۔

”اے کیا سو گئے؟“ میں نے نیند کی اداکاری جاری رکھی۔

”لگتا ہے' گہری نیند میں چلا گیا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ”کسی نے سچ کہا ہے' سویا ہوا بندہ مردے کی طرح ہوتا ہے۔ یہ بھی تو چٹائی پر کسی لاش ہی کی طرح ہے خیر......!“ اس نے لمحاتی توقف کیا پھر براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”بیٹا جی! جتنی بھی نیند پوری کرنا ہے کرلو۔ یہ تمہاری زندگی کی آخری نیند ہے۔ آنے والی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ثابت ہونے والی ہے اور اس رات تو تم ایک پل کے لیے بھی آنکھ نہیں لگا سکو گے۔ باس تمہارے ساتھ جو بھی کرے گا وہ تمہارے دل کا سکون اور آنکھوں کی نیند چھین لے گا۔“

میں چپ چاپ پڑا اس کی بک بک سنتا رہا پھر کھڑکی کے باہر خاموشی چھا گئی۔ اب مجھے وہاں گولی کی صورت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ میری طرف سے مطمئن ہو کر کہیں نکل گیا تھا۔

مگر میں ابھی اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا لہٰذا میں نے اپنی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہ کی عین ممکن تھا کہ وہ مجھے دھوکا دینے کے لیے وقتی طور پر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا ہوتا کہ وہ میری اس گہری نیند کے راز کو پاسکے۔

میں اسے ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ میں آئندہ لمحات میں جو کچھ کرنے کا ارادہ کرچکا تھا وہ نہایت ہی اہم اور خطرناک تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ گولی کو میرے عزائم کی بھنک بھی پڑے۔ میں اسے بے خبری میں رکھ کر ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکتا تھا۔ مزید آدھے گھنٹے تک جب کھڑکی کے قریب مجھے گولی کی شکل نظر نہ آئی تو میں نے ایک سکون بھری سانس خارج کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ایسا سوچا جا سکتا تھا کہ وہ میری جانب سے بے فکر ہوگیا تھا۔

میں بہ آہستگی چٹائی سے نیچے اترا اور احتیاط کے ساتھ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ چند لمحات تک میں دم سادھے وہاں خاموش کھڑا رہا۔ پھر کھڑکی کی سلاخوں کو تھام کر تاحد نگاہ راہ داری میں جھانکا۔ وہ کم بخت مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے مزید تسلی کے لیے ایک دو بار اسے پکارا بھی مگر اس کی جانب سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ میری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کچھ فاصلے پر چلا گیا تھا۔ عین ممکن ہے وہ کمر سیدھی کرنے کے لیے کہیں لیٹ گیا ہو۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور واش روم میں گھس گیا۔ میرے عمل میں آنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

اندھیرے میں ٹٹولنے کا تجربہ نہایت ہی سنسنی خیز ہوتا ہے۔ اگر مطلوبہ شے ہتھے چڑھ جائے تو تجربہ لذت آمیز ہوجاتا ہے ورنہ ٹٹولنے والے ہاتھ اور انگلیاں کسی ناخوش گوار حادثے کا شکار بھی ہوسکتی ہیں۔

میں نے بڑی مہارت سے ٹٹول کر اس اسکریو ڈرائیور تک رسائی حاصل کرلی جو میں نے واش روم والے کباڑ میں پڑا دیکھا تھا۔ اس پیچ کس کا دستہ جڑا ہوا تھا تاہم مجھے اس پیچ کس سے جو کام لینا تھا اس کے لیے دستے کا سلامت ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس اسکریو ڈرائیور کو حاصل کرنے کے بعد میں نے دو فٹ لمبے آہنی پائپ کے ٹکڑے کو اٹھایا اور واش روم سے باہر نکل آیا۔ احتیاطاً میں پائپ کا ایک چھوٹا ٹکڑا بھی ساتھ لے آیا تھا۔ میرے محتاط قدموں کا رخ دروازے کی جانب تھا۔

میں نے اس سامان کو دروازے کے قریب رکھا اور کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ کسی بھی نوعیت کی کارروائی سے قبل ایک مرتبہ پھر تسلی کرلینا ضروری تھا۔

میں نے بڑی احتیاط سے جھانک کر کھڑکی سے باہر راہ داری میں ممکن حد تک نگاہ دوڑائی لیکن ایسا لگتا تھا گولی نے میری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد تھوڑی نیند لینے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ جب وہ یا اس کی کہیں موجودی کے آثار مجھے دکھائی نہ دیے تو میں اپنے کام میں جت گیا۔

اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے سے قبل میں ایک بار پھر واش روم پہنچا اور پانی والی بالٹی کو نل کے نیچے لگا کر دھیمے انداز میں نل کو کھول دیا۔ اس طرح پانی گرنے کی آواز تو مسلسل پیدا ہوتی رہتی مگر بالٹی کو بھرنے میں کچھ وقت لگتا۔ یہ حکمتِ عملی میں نے اس لیے اپنائی تھی کہ اگر اس دوران میں گولی اس طرف آنکلے اور کھڑکی کے توسط سے مجھے کمرے میں غیر موجود پائے تو سمجھ جائے کہ میں واش روم میں مصروف ہوں۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ میں جو کارروائی کرنے جا رہا تھا پانی گرنے کی صورت میں اس کی آواز کمرے سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں دروازے کے پاس آ گیا۔

سب سے پہلے میں نے اس مقام کا جائزہ لیا جہاں پر ہضمی قفل دروازے کی چوکھٹ کے اندر گھسا ہوا تھا۔ فلش ڈور میں اسی قسم کے لاک لگائے جاتے ہیں جن کا ایک حصہ دروازے کے پٹ میں اور دوسرا دروازے کی چوکھٹ کے اندر ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ دروازے کی بیرونی جانب اس ہضمی قفل کے علاوہ کوئی اور کنڈی یا تالا بھی موجود تھا یا نہیں کیونکہ یہ دروازہ ایک بار بھی میرے سامنے کھولا نہیں گیا تھا۔ بہرحال میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

میرا ٹارگٹ فلش لاک کا وہ حصہ تھا جو دروازے کی چوکھٹ کے اندر واقع تھا۔ مجھے چوکھٹ کی لکڑی کو کاٹ کر اس حصے کو سامنے لانا تھا اور اس قابل بنانا تھا کہ بہ وقت ضرورت میں اپنی مرضی سے جب دروازے کو کھولنے کی کوشش کروں تو اس سعی میں مجھے کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہ ہوا اور میں بہ آسانی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلوں۔

میں پیچ کس کو کسی چھینی اور آہنی پائپ کو کسی ہتھوڑی کی طرح استعمال کرتے ہوئے بڑے دھیمے انداز میں چوکھٹ کی لکڑی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں نے اپنے مشن میں ستر فیصد کامیابی حاصل کرلی۔ اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ بالٹی میں گرنے والے پانی کی آواز تبدیل ہوچکی ہے گویا وہ بالٹی پانی سے بھر گئی تھی۔

میں واش روم میں پہنچا بھری ہوئی بالٹی کے پانی کو گرایا اور دوبارہ اسے نل کے نیچے لگا دیا۔ واپس دروازے کی جانب قدم اٹھانے سے پہلے میں نے کھڑکی سے باہر جھانکنا ضروری جانا تاکہ گولی کی سن گن لے سکوں۔ راہ داری ویران اور خاموش تھی اور گولی کے وجود سے خالی بھی۔ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ میرا نگران کہیں پڑا آرام سے سو رہا تھا۔ میں واپس دروازے کی طرف آ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں، میں نے اپنے کام کو اس حد تک نمٹا لیا کہ ضرورت پڑنے پر میں اس دروازے کو ایک جھٹکے سے اندر کی جانب کھول سکوں۔ چوکھٹ والے حصے کو بالکل ہی ننگا کردینا نگران کو شک میں مبتلا کرنے والی بات تھی اسی لیے میں نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں چاہتا تو اس وقت بھی دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ مگر یہ قبل از وقت ہوتا۔ اس طرح باہر کوئی دوسری کنڈی نہ ہونے کی صورت میں ممکن ہے، میں کمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوجاتا مگر اس طرح میرا مقصد ادھورا رہ

عائشہ نجل۔۔۔۔۔چوتالہ

تیرے ہر دُکھ کو اپنا بنالوں
تیرے ہر غم کو دل سے لگالوں
مجھ کو کرنی آتی نہیں چوری ورنہ
میں تیری آنکھوں سے ہر آنسو چرالوں

غزل صدیقی۔۔۔۔۔ڈیرہ اسماعیل خان

نجانے کیوں محبت کا کوئی جب نام لیتا ہے
میرا ماضی میری یادوں کا آنچل تھام لیتا ہے
وہ ایسا شخص تھا جس کے لیے بدنام ہوگئے
ورنہ کیوں کوئی سر پہ کوئی الزام لیتا ہے

منیر احمد اسد۔۔۔۔۔مقام نامعلوم

ہجر کا تارا ڈوب چلا ہے ڈھلنے لگی ہے رات وصی
قطرہ قطرہ برس رہی ہے آنکھوں کی برسات وصی
تیرے بعد یہ دنیا والے مجھ کو پاگل کردیں گے
خوشبوؤں کے دیس میں لے چل مجھ کو اپنے ساتھ وصی

جاتا۔

میں آج سہ پہر میں اپنی رگِ جاں فرحانہ کو شیروانی کی قید سے رہائی دلانے کے لیے گلستان جوہر والے بنگلے پر پہنچا تھا۔ اس کے بعد پے در پے سنسنی خیز واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ فرحانہ ابھی تک شیروانی کے قبضے میں تھی اگر میں چپ چاپ یہاں سے نکل جاتا تو پھر فرحانہ تک رسائی بہت مشکل ہو جاتی۔ شیروانی نے آج مجھ سے جو بھی بکواس کی تھی اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ آنے والی رات فرحانہ کو اس بنگلے پر لانے والا تھا۔ اس نے جن ناپاک خیالات کا اظہار کیا تھا ان میں تو میں اسے کسی قیمت پر کامیاب ہونے نہیں دے سکتا تھا لیکن اس صورتِ حال میں میرے لیے طمانیت کا پہلو یہ تھا کہ آئندہ رات فرحانہ اس بنگلے میں موجود ہوگی۔ مجھے اسی وقت کوئی ہنگامی کارروائی کر کے فرحانہ کو شیروانی کے چنگل سے نکال لے جانا تھا۔ اس کے بعد جو بھی ہوتا اللہ مالک......!

میں نے دروازے کے ساتھ جو حرکت کی تھی اس کی افادیت کا صحیح اندازہ ضرورت پڑنے پر ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے دروازے کی چوکھٹ سے نکلنے والے کچرے کو سمیٹ کر واش روم کے کباڑ میں شامل کر دیا۔ نل بند کیا' اسٹارٹر کو ٹیوب لائٹ کی پٹی میں لگایا اور چٹائی کی طرف آ گیا۔

اسٹارٹر لگتے ہی ٹیوب لائٹ آن ہو گئی تھی جس کی وجہ سے کمرے کی تاریکی رخصت ہو گئی تھی۔ اگر میرا نگران جاگ رہا ہوتا تو لائٹ آن ہونے کے سبب اسے فوراً میری جانب متوجہ ہو جانا چاہیے تھا۔ میں جلدی سے چٹائی پر اسی پوزیشن میں لیٹ گیا جیسے کچھ دیر پہلے تک لیٹا ہوا تھا۔

میں نے دروازے کے ساتھ کارروائی مکمل کرنے کے بعد دو چیزیں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ ایک دو فٹ لمبا آہنی پائپ کا ٹکڑا اور دوسرا اپھٹے ہوئے دستے والا پیچ کس ان دونوں چیزوں کو بہ وقت ضرورت مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔

پائپ کا پیس میری پائنتی چٹائی کے نیچے موجود تھا اور پیچ کس کو میں نے جینز کی پاکٹ کے اندر غائب کر دیا تھا۔ کوئی اوزار یا ہتھیار چاہے کتنی معمولی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو اس کی موجودگی سے انسان کی تقویت ملتی ہے۔ میں بھی خود کو خاصا ری لیکس محسوس کر رہا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک آنکھیں میچے اپنے نگران کی' کھڑکی پر آمد کا انتظار کرتا رہا۔ وہ آیا اور نہ ہی اس کی صورت نظر آئی۔ وہ یقیناً اس وقت گہری نیند میں ہوگا۔

میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے یہ بھی خیال آیا یہ اچھا موقع ہے میں کمرے سے نکل کر بآسانی گولی پر قابو پا سکتا ہوں۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقت نظر نہیں آتی تھی تاہم اس کے نتیجے میں' میں فرحانہ سے دور ہو جاتا اور یہ مجھے کسی بھی قیمت پر منظور نہیں تھا۔ یہ سارا کھٹ راگ میں نے فرحانہ کے حصول کی خاطر ہی تو پھیلایا تھا۔

میں نے بھی ایک بھرپور نیند لینے کا فیصلہ کرنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کل کا دن اور خصوصاً آنے والی رات بہت اہم اور ہنگامہ خیز ثابت ہونے والی تھی اور ان ہنگاموں سے دو' دو ہاتھ کرنے کے لیے میرا چاق و چوبند اور ہر طرح سے فٹ ہونا بہت ضروری تھا اور یہ ایک گہری پرسکون نیند کے بعد ہی ممکن تھا۔

نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے خوش ولی بے طرح یاد آیا۔ شیروانی کے مطابق وہ اس کی کسٹڈی میں تھا اور زخمی بھی تھا۔ کتنا زخمی تھا اس کا میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ مجھے فرحانہ کے علاوہ اپنے جاں نثار دوست خوش ولی کو بھی شیروانی کی قید سے چھڑانا تھا۔ اس کا سراغ شیروانی یا اس کے کسی معتمد خاص ہی سے مل سکتا تھا۔ گویا ہر صورت میں مجھے آنے والی رات کا انتظار کرنا تھا......!

اگلی صبح کافی دیر سے میری آنکھ کھلی بیدار ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے سلاخ دار کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ایک منحوس چہرہ میری نگاہ میں آ گیا اور وہ چہرہ گولی کا تھا۔

''اٹھ گئے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''نیند پوری کرنے کے بعد ہر شخص ہی بیدار ہو جاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے چٹائی چھوڑ دی۔ ''جیسا کہ تم بھی فریش نظر آ رہے ہو یقیناً تم نے بھی ایک بھرپور نیند لی ہے۔''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بس کمر سیدھی کرنے کا موقع ملا ہے۔''

''جھوٹ تو تمہاری رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔'' میں نے کھڑکی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور ایسا کیوں نہ ہو' آخر تم جھوٹوں کے سردار ندیم شیروانی کے نمک خوار ہو۔''

''میں نے ابھی تم سے کون سا جھوٹ بولا ہے۔'' وہ چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تم نے کہا صرف کمر سیدھی کرنے کا موقع ملا ہے۔'' میں نے ترش لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی تمہارا جھوٹ ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تم نے ٹھیک ٹھاک نیند لی ہے۔''

وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر کر رہے ہو۔ کیا تم نے مجھے سوتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''احمقوں والی بات مت کرو۔'' میں نے ڈانٹ سے بھرپور انداز میں کہا۔ ''میں یہاں کمرے میں بند ہوں کمرے سے باہر تمہیں سوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔''

''پھر۔'' اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں نے تمہیں نیند لیتے ہوئے محسوس کیا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''محسوس کیا ہے۔'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں کوئی مطلبی انسان نہیں ہوں جو میرا کوئی مطلب ہو۔'' میں نے اسے چڑانے کی غرض سے کہا۔

پھر اس کی تسلی کے لیے وضاحت بھی کر دی۔

''دراصل، کمرے میں اچانک ٹیوب لائٹ آن ہو جانے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پاس آ کر تمہیں آوازیں دیں مگر تمہاری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو میں یہی سمجھا کہ تم کہیں سو مر گئے ہو۔''

اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا پھر جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔

''اگر لائٹ آن ہوگئی تھی تو اس میں ایسی کون سی خاص بات تھی۔''

''جب یہ لائٹ خود بخود آف ہوئی تھی تو تمہارے پیٹ میں شدید نوعیت کا مروڑ اٹھا تھا اور تم مجھ سے باز پرس کرنے آئے تھے۔'' میں نے کڑوے لہجے میں کہا۔

''اسی لیے میں نے سوچا کہ تمہیں لائٹ آن ہونے کی نوید سنا دوں تاکہ تمہیں پیٹ کے درد سے راحت محسوس ہو۔''

''بک بک کرنا تمہاری سرشت میں شامل ہے اور یہ کام تم کرتے ہی رہو گے۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں تمہاری اس بکواس سے غصے میں نہیں آؤں گا کیونکہ طیش میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہاری زندگی چند گھنٹوں کی بچی ہے۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو۔'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔

''پتا نہیں، یہ تمہارے لیے خوش خبری ہے یا بد خبری۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''باس نے آج ہی تمہارا قصہ پاک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد اس بنگلے میں ہوگا۔''

گولی کے تازہ ترین انکشافات نے میرے وجود میں سنسنی سی پھیلا دی تھی۔ میں نے بے ساختہ پوچھا۔ ''کیا فرحانہ بھی شیروانی کے ساتھ یہاں پہنچے گی؟''

''باس نے تمہاری موت کے وقت میں کمی کی ہے اپنے پروگرام میں کوئی ردوبدل نہیں کیا۔'' وہ بڑے فخر سے بتانے لگا۔ ''باس، فرحانہ اور اپنے غیر ملکی دوست کے ساتھ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس کے بعد باس تمہاری محبوبہ کے ساتھ جشن منائے گا۔ تم آخری مرتبہ اپنی محبت کو باس کے ساتھ ناقابل اعتراض حالت میں دیکھو گے اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ تمہارے لیے۔''

گولی جو انکشافات کر رہا تھا وہ میرے لیے کسی بڑی خوش خبری سے کم نہیں تھے۔ اب مجھے رات تک اپنے اعصاب کو کڑی آزمائش سے گزارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جو بھی ہونا تھا دو تین گھنٹے میں ہو جانا تھا۔ اس خیال کے ساتھ کہ فیصلے کی گھڑی آن

پہنچی ہے میرے اندر توانائی بھر گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا میں بڑے سے بڑے سونامی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔

''اپنی موت کو چند گھنٹوں کی دوری پر کھڑا دیکھ کر کیسے سانپ سونگھ گیا ہے۔'' وہ میری پراسرار خاموشی کو کوئی اور ہی رنگ دیتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے تو ہونٹ جیسے سل سے گئے ہیں۔''

میں نے نگران گولی کو خوش فہمی کی آخری منزل پر ڈراپ کرنے کی غرض سے کہا۔ ''ٹھیک کہتے ہو بھائی زندگی ہر شخص کو پیاری ہوتی ہے۔''

بات ختم کرتے ہوئے میں نے ایک مایوسی بھری ٹھنڈی اور بوجھل سانس خارج کی۔ وہ چمک کر بولا۔

''اپنی بدبختی کا ماتم بعد میں کر لینا۔ میں تمہارے لیے ناشتا لا رہا ہوں۔ جلدی سے فریش ہو جاؤ۔'' میں نے گولی کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

فریش ہونے کے دوران میں، میں آئندہ کا لائحہ عمل اپنے ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ یہ دو گھنٹے میری زندگی کا اہم ترین دورانیہ تھا۔ اگر میں اس وقفے کے دوران میں کچھ نہ کر پایا تو پھر فرحانہ مجھ سے مدتوں کے فاصلے پر جا سکتی تھی اور میں اس سنہری موقع کو گنوانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شیروانی کی آمد پر یقیناً مجھے اس کمرے سے نکال کر کہیں اور پہنچایا جاتا۔ یہ کمرا کسی بھی اچھے برے جشن کے لائق نہیں تھا۔ مجھے اپنی منتقلی کے دوران ہی میں کوئی چمتکار دکھانا تھا۔

ناشتے کے دوران گولی مسلسل کھڑکی کے پاس جما رہا اور ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہوتی رہی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ناشتے کے بعد بالکل تیار رہنا۔ تمہیں کسی بھی وقت اس کمرے سے نکالا جا سکتا ہے۔''

''یہاں سے نکال کر کہاں لے جاؤ گے۔''

''بڑے ہال میں۔'' اس نے بتایا۔ ''باس کے لیے اسی ہال میں جشن کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔''

''یہ بندوبست کون کر رہا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا اس بنگلے میں تمہارے علاوہ اور بھی لوگ موجود ہیں۔''

''ہاں، دو افراد اور بھی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

یہ اطلاع میرے لیے خاصی مفید تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے باس نے اچانک جشن والے پروگرام کا وقت کیوں تبدیل کر دیا؟''

''میں باس سے سوال نہیں کرتا۔'' اس نے بتایا۔

''لیکن دوسرے ذرائع سے مجھے پتا چلا ہے کہ باس آج رات اپنے غیر ملکی دوست کے ساتھ پاکستان سے باہر جا رہا ہے۔ یہ پروگرام اچانک ہی بن گیا۔''

''ایسے اچانک پروگرام کسی ایمرجنسی کی صورت میں بنا کرتے ہیں۔'' گولی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تمہارا باس کسی ہنگامی صورت حالات میں ملک سے باہر جا رہا ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ میرے تبصرے کے جواب میں کچھ کہتا بنگلے کے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاڑی یقیناً بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکی تھی۔ انجن کی رعب دار غراہٹ سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی طاقت ور جیپ ہوگی۔

گولی کے چہرے اور آنکھوں میں سنسنی جاگ اٹھی۔ وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے باس آ گیا۔''

میرا دل طوفان کی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ گولی نے شیروانی کی آمد کی خبر سنائی تھی اور میرے لیے یہ نوید مسرت تھی کیونکہ شیروانی کے ساتھ میری جانِ تمنا بھی یہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے جذبات سے لب

ریز آواز میں گولی سے پوچھا۔

"تم گیٹ کھولنے نہیں جاؤ گے۔"

"یہ کام کسی اور کے ذمے ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "مجھے صرف تمہاری نگرانی پر مامور کیا گیا ہے۔ تم ہر لحہ تیار رہو۔ میں کسی بھی وقت تمہیں اس کمرے سے نکال کر اندرونی ہال میں پہنچا دوں گا۔"

گولی کی بات کے دوران ہی میں' میں بنگلے کا گیٹ کھلنے اور گاڑی کے حرکت میں آنے کی آواز سماعت کر چکا تھا۔ یہ نہایت ہی نازک لمحات تھے۔ اتنے نازک اور حساس کہ ان لمحات میں سوچنے سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی بس آنِ واحد میں عمل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ناشتے کے برتن کھڑکی کے راستے گولی کو تھماتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

"میں صرف دو منٹ کے لیے واش روم جاؤں گا۔ اس کے بعد تم جب چاہو' مجھے کمرے سے نکال کر کہیں بھی پہنچا دینا۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اب اسے دروازے کے سامنے سے گزر کر ناشتے کے برتنوں کو کہیں رکھنا تھا۔

میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں لپک کر دروازے پر پہنچا اور کنگ کانگ کی قوت سے دروازے کے ہینڈل کو جھٹکا مار کر اپنی جانب کھینچا۔ لاک کے ساتھ کی گئی کارروائی نے میرا کام آسان کر دیا تھا اور پھر ان لمحات میں مجھ پر ایک جنون سا طاری تھا۔ دروازے کے باہر کوئی کنڈی تھی یا نہیں واللہ اعلم۔ میں نے اپنی طاقت سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی کہ مقصد میں ناکامی کے صفر فیصد امکانات بھی نہیں تھے۔ دروازہ دھاڑ سے کھلا اور میں اگلے ہی لمحے کمرے سے باہر تھا۔ گولی نے پلٹ کر میری جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ گن سیدھی کر کے مجھ پر فائر کرتا' میں نے زخمی چیتے کی مانند جست بھری اور اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے چرے ہوئے دستے والا پیچ کس اس کی شہہ رگ کے راستے حلق میں گھس چکا تھا۔ میرے ہاتھ کی ایک میکانکی حرکت نے اسے سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ عمل تو دور کی بات ہے۔

میرا نگران گولی ذبح کیے ہوئے جانور کی مانند راہداری کے فرش پر تڑپنے لگا۔ متاثرہ مقام سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا تھا۔ اس کے حلق سے بڑی وحشت ناک خرخراہٹ برآمد ہو رہی تھی۔ وہ مجھے جان کنی کے عالم میں نظر آیا۔ میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ اس کی آخری رسومات تک وہیں بیٹھا رہتا۔

میں نے فوراً اس کی گن پر قبضہ کیا اور اسے تڑپتا پھڑکتا چھوڑ کر راہداری کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ یہاں سے کار پورچ واضح دکھائی دے رہا تھا۔

طاقت ور انجن والی سیاہ جیپ پورچ میں رک چکی تھی۔ میں نے اس کے دروازوں کو یکے بعد دیگرے کھلتے ہوئے دیکھا اور...... اور پھر ایک منظر نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ حقیقت میرے سامنے تھی اور کھلی آنکھوں مجھے چڑا رہی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

پچھتاوا

محترم عمران احمد قریشی صاحب!

السلام علیکم' میں اس سے قبل بھی کئی کہانیاں آپ کو ارسال کر چکا ہوں کچھ تو شائع ہوئیں اور کچھ..... بہرحال ایک اور سچی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس کیس کا کچھ احوال تو پنجاب کے اخباروں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس کہانی میں بہت کچھ ایسا ہے جو منظر عام پر نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوق بنایا لیکن وہ نفسانی خواہشات کے زیر اثر کس طرح اپنے مقام سے گرتا ہے۔ اسی کا احوال اس کہانی میں آپ کو ملے گا۔ امید ہے بہت سے لوگوں کے لیے یہ کہانی سبق آموز اور رہنما ثابت ہوگی۔

آپ کا مخلص

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ

خانیوال

زندگی ایک سفر ہے' جس میں لوگ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں' کسی نے سچ کہا ہے کہ سرکاری ملازمت میں انسان کسی ایک جگہ نہیں رہ سکتا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی چکر تھا۔ میں بھی سرکاری ملازمت کے باعث کبھی اِس شہر میں تو کبھی اُس شہر میں گھومتا رہا ہوں۔ اس گھوم چکری میں میرا تبادلہ راجن پور کی تحصیل جام پور نرسری یونٹ میں بطور انچارج ہو گیا۔ میری ماتحتی میں کام کرنے والے اہلِ کاران جن کی تعداد پانچ تھی۔ جن میں محمد حمزہ جان' علی حسن' محمد عبداللہ' شاہد عباس' محمد اکرم شامل تھے۔ میری رہائش ان لوگوں کے ساتھ سرکاری بنگلے میں ہی تھی۔

سرکاری رہائش گاہ اور نرسری یونٹ کے جنوب کی طرف تقریباً پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر دریائے سندھ کا گزر تھا۔ دریا پر سیر کے لیے ایک لانچ بھی تھی جو سیر کے شوقین حضرات کو معاوضہ لے کر سیر کروانے اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچانے کا کام دیتی کیونکہ اکثر جتوئی جانے کے لیے یہی راستا اختیار کیا جاتا تھا۔ یہ ساری باتیں میں نے سن رکھی تھیں لیکن اس طرف جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ لیکن آج چھٹی کا دن تھا اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میرے ماتحت سب اکٹھے ہو کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔

"جناب چھ سات ماہ سے آپ آئے ہوئے ہیں۔ دریائے سندھ کا پتن یہاں سے پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے سیر کے لیے لانچ بھی ہے۔ چلو آج آپ کو دریا کی سیر کروائی جائے یہ بہت بڑا سیلانی و طوفانی قسم کا دریا ہے۔"

میں نے کہا۔

"بھائی چلو جیسی آپ کی مرضی میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔"

کھانے پینے کا سامان لے کر دریا کی سیر کے لیے چل پڑے۔ سفر بذریعہ پیدل یعنی اپنی مدد آپ کے کیا جا رہا تھا۔ تقریباً دو میل کا سفر کیا ہوگا کہ راستے میں ایک بہت بڑا قبرستان تھا جس کے باہری طرف ایک بہت خوب صورت مسجد کم جنازہ گاہ بنی ہوئی تھی اور پانی پینے والوں کے لیے نلکا اور ساتھ ہی گھڑے بھی رکھے ہوئے تھے یعنی آپ پانی پی سکتے ہیں۔ وضو کر سکتے ہیں اور درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر آرام بھی کر سکتے ہیں۔ قبرستان کے سامنے اور مسجد کے نزدیک پہنچ کر ہم سب کو پیاس محسوس ہوئی اور ہم

بیٹھ گئے ابھی ہمیں وہاں بیٹھے زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہمیں قبرستان کے اندر سے مردانہ زبان میں دردناک باتیں اور رونے کی آواز آئی اگرچ کہا جائے تو سچ یہ ہے کہ رونے کی آواز سن کر پہلے تو ہم ڈر گئے تھے اور ہمارے منہ سے نکلا کہ "اللہ خیر مولا خیر اور پھر میں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ کسی کی موت ہوگئی ہو۔ اندر چل کر پتا کرتے ہیں۔

ہم قبرستان میں داخل ہوگئے جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے رہے رونے کی آواز نزدیک آتی گئی اور پھر ہم اس قبر کے نزدیک پہنچ گئے جس پر تازہ پانی کا چھڑکاؤ کر کے پھول بکھیرے کوئی پچاس سال کی عمر کا شخص جس کی حالت بہت کمزور تھی اور سر کے بال تقریباً سفید تھے زار و قطار رو رہا تھا۔ بین بھی کر رہا تھا۔ مرنے والے کی قبر سے معافیاں بھی مانگ رہا تھا۔

"میں کتنا ظالم ہوں، کتنا نیچ ہوں کہ آپ جیسی محبوب ہستی کے ساتھ میں نے بے وفائی کی ایک عورت کے بہکاوے میں آ کر آپ کو موت سے ہم کنار کیا جب کہ تو میرا بڑا بھائی نہیں ماں، باپ کا بھی درجہ رکھتا تھا۔ بڑے بھائی مجھے معاف کر دیں معافی دلوادیں پیارے ربّ العالمین سے تاکہ میری بخشش ہو جائے۔"

رو رو کر اس کی آنکھیں بہت زیادہ سرخ ہو چکی تھیں، ہم سب نے پہلے تو اس شخص کو سلام کیا پھر قبر پر فاتحہ پڑھی۔ اسے صبر سے کام لینے کی ہدایت کی تو وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرے عزیزو اس قبر میں سونے والا میرا بڑا بھائی اقبال ہے۔ جس نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا کسی بھی چیز کی کمی نہ آنے دی لیکن میں نے بھائی کے ساتھ وفاداری نہ کی بلکہ اسے قتل کر دیا۔"

جس پر ہم سب نے کہا۔

"بھائی ایسی کیا بات ہوگئی تھی کہ تم نے یہ قتل جیسا فعل کیا اور قتل بھی اس ہستی کا جس نے تمہیں بھائی نہیں ماں باپ بن کر پالا پوسا جوان کیا۔" اس پر وہ بولا۔

"میرا نام حق نواز ملک ہے آپ اب جائیں آپ بھی میرے حق میں دعا کریں۔ آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو پہچان گیا ہوں کہ آپ گورنمنٹ نرسری یونٹ کے ملازمین ہو مجھے نرسری آ کر کچھ پودوں پھولوں کی خریداری کرنی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ ہم بھی اس کی ادھوری کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی راہ ہو لیے مگر میرے ذہن میں اس کے جملے مسلسل گونجتے رہے۔ دیگر لوگ تو اسے اگلے دن ہی بھول گئے تھے مگر میں اس کا شدت سے انتظار کرتا رہا۔ مجھے اس کی شخصیت سے ایک انوکھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی میں اس کی کہانی جاننا چاہتا تھا

پندرہ دن بعد ایک روز صبح نرسری یونٹ پر اس کی آمد ہوئی۔ سلام دعا کے بعد اس نے کہا کہ بوجہ سخت بخار ہو جانے سے وہ پہلے حاضر نہ ہوسکا اور تندرست ہوتے ہی آج آ گیا ہے۔

سب سے پہلے میں نے اسے چائے پلائی اور اس نے پودوں اور پھولوں کے آرڈر لکھوا کر ان کی رقم جمع کروائی اور پھر میرے یاد دلانے پر وہ اپنی آپ بیتی سنانے کے لیے تیار ہوگیا۔

"میری داستان کیا ہے یہ تو میرے ظلم کرنے اور ظالم ہونے کا بیان ہے کہ میری بخشش بھی ناممکن ہے۔" جس پر ہم نے اسے پانی پلایا اور ساتھ ہی کہا کہ "اللہ پاک بڑا غفور و رحیم ہے۔ اگر اس سے سچے دل سے معافی مانگی جائے تو وہ بخش دیتا ہے۔" تب جا کر حق نواز ملک اپنی آپ بیتی سنانے پر راضی ہوا۔

"جناب کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ زن، زر اور زمین فساد کی جڑ ہوتے ہیں۔ نیکی اور بدی کی جنگ ازل سے جاری ہے۔ اس کائنات میں سب سے پہلا قتل بھی بھائی نے بھائی کا کیا وہ بھی عورت۔ یعنی کہ حوا کی بیٹی کی وجہ سے کیا۔ اس قتل کا سلسلہ چل نکلا اور آج تک جاری ہے اور میں بھی قاتلوں کی لسٹ میں شامل ہوگیا، کیونکہ میں نے بھی ایک عورت کے بہکاوے میں آ کر اپنے بڑے بھائی ملک اقبال کو قتل کر دیا۔

مجھ بدقسمت کے والد سلطان محمد ملک میری اس دنیا میں آمد سے دو ماہ پہلے ہی وفات پا گئے اور میں پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو گیا اور پھر میری پیدائش کے ساتویں ماہ میری ماں بھی مجھے یتیم سے مسکین بنا کر ہزاروں من مٹی تلے جا سوئیں اور پھر تمام ذمہ داری کا بوجھ بڑے بھائی کے سر آ گیا۔ جو کہ لوگوں کے کہنے کے مطابق خود بھی زیادہ سے زیادہ دس یا گیارہ سال عمر کے ہوں گے اور انہوں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ جب کہ وہ مجھے چاہتے تو موت سے ہم کنار بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے مجھ بدقسمت جو بعد میں ان کا قاتل بنا اسے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔ والد صاحب ایک سرکاری ادارے میں ملازم تھے۔ ان کی پینشن جو کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد والدہ صاحبہ کے نام تھی وہ والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد بڑے بھائی کے نام کسی ہمدردی کی وجہ سے ہوگئی لیکن وہ بہت کم رقم تھی جو وہ لے کر آتے اور اس میں گزارہ نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ دس مرلہ زمین کا ایک مکان تھا۔ جس یادگار کو میں نے ہی فروخت کر کے یہ ایک کینال جگہ خرید کر مکان بنوایا۔ جس کے لیے پودے اور پھول لینے آیا ہوا ہوں۔ اس رقم جو کہ ہمارے گزر اوقات کے لیے کافی نہ تھی بھائی صاحب نے دن کے چوبیس گھنٹوں کو کچھ اس طرح تقسیم کیا کہ پہلا ٹائم اسکول کے لیے دوسرا ٹائم جو بھی کام مل جائے محنت مزدوری کے لیے انہوں نے گدھا ریڑھی بنالی تاکہ لوگوں کی سبزیاں وغیرہ منڈی تک ان کی زمینوں سے اٹھا کر پہنچا سکے اور وہ بھی زیادہ تر مقرر شدہ لوگ تھے جن کا وہ کام کرتے۔ تیسرا وقت جس میں میرے پاس چکر لگانا کیونکہ میں تو بہت ہی کم عمر تھا اور میری پرورش اور دیکھ بھال کی زیادہ تر ذمہ داری اس نے خدا ترس مائی حمیدہ کے سپرد کر دی جو کہ خود بھی بیوہ تھیں اور لوگوں کی امداد پر وقت گزارتی تھیں یا زیادہ ہوا تو ان کا چھوٹا موٹا کام کر دیتی تھیں بھائی صاحب میرے دودھ کے اخراجات کے علاوہ بھی جو کچھ ہوسکتا تھا اماں حمیدہ کو دے دیتے اور پھر آرام کے نام پر تھوڑا بہت سو لیتے۔

اس طرح وقت کی سوئی آگے سے آگے بڑھتی رہی۔ بھائی صاحب نے میٹرک کا امتحان تحصیل جام پور میں بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اس وقت میں پہلی جماعت میں داخل ہونے اور تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ لہٰذا بھائی صاحب نے مجھے اسکول داخل کروادیا اور پھر خداوند پاک کا کرنا کچھ اس طرح ہوا کہ بھائی صاحب کو بھی والد صاحب کے محکمہ میں بطور جونیئر کلرک کے نوکری مل گئی اور اس نوکری کے آرڈرز کروانے میں والد صاحب مرحوم کی زندگی میں بطور سینئر آفیسر محکمہ سلیم احمد چوہدری صاحب کی مہربانیاں کارفرما رہیں کیونکہ وہ مہربان ہستی اب بھی محکمہ میں موجود تھی اور جب انہیں پتا چلا کہ مرحوم سلطان محمد ملک کے بیٹے نے بہت اچھے نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا ہے تو انہوں نے نائب قاصد کریم بخش کے ذریعہ بھائی صاحب کو دفتر میں بلوا کر اس شرط پر نوکری کے آرڈرز کروانے کا وعدہ کیا کہ وہ ٹائپ کرنے کا کورس کریں تاکہ دفتری کام کرنے کے قابل ہوجائیں۔ جس پر بھائی

صاحب نے فوری عمل کیا اور ملازم ہوگئے۔ گدھا ریڑھی فروخت کردی گئی۔ صبح وہ اٹھتے خود بھی نماز پڑھتے اور مجھ سے بھی نماز کی ادائیگی کرواتے پھر ناشتہ تیار کرتے اور پھر مجھے سائیکل پر بٹھا کر اسکول لے جاتے اور خود نوکری پر چلے جاتے اور اسکول سے چھٹی کے وقت مجھے ساتھ گھر لے آتے۔

کافی لوگوں نے بھائی صاحب پر شادی کے لیےزور دیا لیکن بھائی صاحب انکار کردیتے کہ میرا بھائی حق نواز ابھی بہت چھوٹا ہے اور آنے والی خدا جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرے اور آگے جاکر میں اپنے ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

وقت کا پہیہ گھومتے گھومتے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا اور آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے مجھے ڈیرہ غازی خان کالج میں داخل کروا دیا۔ اس طرح دو سال اور گزر گئے اور میں نے ایف اے کا امتحان دے کر بھائی صاحب کے ساتھ کچھ دوستوں اور زیادہ تر نزدیکی بزرگوں کے زور دینے پر یہ شرط رکھی کہ بھائی جان میں اب بچہ نہیں رہا ماشاءاللہ جوان ہوگیا ہوں۔ لہٰذا مہربانی فرما کر اب شادی کرلو اور اگر اب بھی آپ شادی نہیں کرتے تو میں آگے تعلیم بھی حاصل نہ کروں گا۔ بلکہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا اور پھر میری دی گئی یہ دھمکی کام کر گئی اس ضمن میں کچھ کیا بہت کچھ مدد محترمی بزرگ سلیم احمد چوہدری نے کی اور پھر میرے ایف اے رزلٹ آنے سے بھی پہلے ان کی شادی بابا غلام فریدؒ کے پیارے شہر مٹھن کوٹ میں بزرگ وار فیض رسول ملک کی صاحبزادی حمیرا ملک سے ہوگئی۔ بھائی صاحب نے پہلی رات ہی سلامی میں جہاں سونے کی انگوٹھی پہنائی وہیں پر میرا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ یہ میری کل کائنات ہے اس کے بغیر میرا کوئی کیا کچھ بھی نہیں اسے اپنا چھوٹا بھائی بلکہ اپنا بیٹا سمجھ کر ہر طرح سے خیال رکھنا۔ اسی کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ اگر اسے تم نے خوش رکھا تو سمجھ لینا کہ تم نے مجھے ہر طرح کی خوشی دے دی اور تمہارے لیے برخوردار حق نواز میرا حکم یہ ہے کہ میں نے تمہاری شرط پوری کردی ہے خوش ہوجاؤ اور اب رزلٹ آجانے کے بعد آگے تعلیم جاری رکھو دل لگا کر پڑھو تمہاری طرف سے مجھے کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ ملے اور جاؤ آرام کرو۔

اللہ اللہ کرکے انتظار ختم ہوا اور ایف اے کا رزلٹ آگیا جس میں میں نے سیکنڈ پوزیشن میں امتحان پاس کیا اس وقت تک میں جام پور میں ہی رہا اور اس درمیان میں بھائی صاحب اور بھابی صاحبہ کی بھرپور محبت حاصل رہی اور کسی بھی بات میں یا انداز میں ہیر پھیر یا بدگمانی نظر نہ آئی اور پھر میں کالج ڈیرہ غازی خان چلا گیا اور پھر بی اے کے امتحانات کے دو سال کے عرصہ تک ماسوائے چھٹیوں کے جام پور نہ آیا۔

امتحانات سے جس کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ میں پچھتر فیصد نمبر حاصل کرکے پاس ہوجاؤں گا۔ فارغ ہوکر جام پور آگیا اور گھر ہی میں رہنے لگا۔ اس درمیان بھائی صاحب کے ہاں اولاد پیدا نہ ہوئی حالانکہ بھائی صاحب کی شادی ہوئے یہ تیسرا سال جا رہا تھا لیکن تاحال وہ اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے اور اب جب کہ میں امتحانات سے فارغ ہوکر مستقل گھر آگیا تھا اور گھر میں ہی رہ رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ پہلے کی طرح اب بھائی اور بھابی کے چہروں پر خوشی نہیں بلکہ زیادہ تر چہرے مرجھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے اور آخر ایک دن یہی سوال میں نے بھائی صاحب اور بھابی صاحبہ سے کرہی دیا کہ جناب دونوں صاحبان کے چہروں پر آج کل اداسی ہی اداسی نظر آتی ہے کیا بات ہے؟ ارے

بھائی بڑے لوگوں مجھ معصوم سے کیا چھپایا جارہا ہے کچھ مجھ کو بھی بتاؤ اور کچھ میری بھی سنو ہوسکتا ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکوں۔ اس پر وہ دونوں میاں بیوی ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ میرے پیارے معصوم بی اے پاس ننھے سے بھائی کوئی بات یا پریشانی نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی نظر کرم ہے کہ ہم آپ کو پریشان و اداس نظر آرہے ہیں اور ساتھ ہی بھائی صاحب بولے کہ حق نواز اب آپ اس طرح کرو کہ اپنی بھابی کو لو اور دو چار روز کوٹ مٹھن کی سیر کرآؤ۔ ملکانی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے مل لے گی اور تم بھی ماحول بدلنے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ سکون حاصل کرلو گے بابا فریدؒ کے مزار پر بھی جاکر حاضری دینا اور اپنے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی دعا کرنا تاکہ تمہیں ہم کبھی بھی پریشان یا بے سکون نظر نہ آئیں۔

دوسرے دن صبح ہی صبح میں بھابی حمیرا کے ساتھ بس میں سوار ہوکر ستر کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد کوئی دس ساڑھے دس بجے کے قریب کوٹ مٹھن پہنچ گیا۔ سب سے پہلے بابا فریدؒ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں سے فارغ ہوکر بھابی کے حکم پر بازار سے مٹھائی اور فروٹ خریدے گئے اور پھر ہم دونوں تقریباً بارہ بجے کے قریب بھابی حمیرا کے گھر پہنچ گئے۔ سب سے گلے لگ کر ملے۔ بزرگوں نے جن میں حمیرا بھابی کی ماں باپ دادی صاحبان نے ہمیں پیار کیا دعائیں دیں اور ساتھ ہی مجھ سے سب نے گلہ کیا کہ صاحب زادے حمیرا کی شادی کے بعد ماشاءاللہ آج تم پہلی دفعہ ہمارے ہاں آئے ہو مہربانی ہے تمہاری کہ بڑی مشکل سے ہی سہی آج آپ کو وقت تو مل گیا ہے۔ جس پر میں نے سر جھکالیا کوئی جواب نہ دیا بس خاموش رہا۔ یک لڑکی بار بار مسکراتے ہوئے میرے سامنے آرہی تھی اور اس کی مسکان میرے دل پر اثر کر رہی تھی۔ جس پر میں نے سوال کرہی دیا کہ بھابی یہ لڑکی کون ہے اور جواب میں بھابی نے ہنس کر جواب دیا کہ ملک صاحب یہ میری چھوٹی بہن سمیرا ہے اور سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہے اور آج کالج نہیں گئی اس لیے آپ کو اس وقت گھر میں نظر آرہی ہے اور اس کے علاوہ میرے دو بھائی محمد نواز رسول ملک اور محمد ممتاز رسول ملک ہیں جو کہ کسی کام کے سلسلہ میں کشمور گئے ہوئے ہیں۔

دو بجے کے وقت کھانا کھایا گیا اور پھر نا جانے کیا بات ہوئی کہ میرے سر میں سخت درد ہونے لگا۔ جس پر مجھے سر درد کی دو گولیاں چائے سے کھانا پڑیں اور کچھ دیر کے بعد مجھے نیند آگئی۔ مغرب تک میں برآمدے میں ڈلی ہوئی چارپائی پر کمبل اوڑھے سوتا رہا اور پھر بھابی حمیرا نے مجھے اٹھایا۔ میں بولا۔

”بھابی میرے سر کا درد ختم نہیں ہوا۔ بلکہ سر درد کے علاوہ بھاری پن سا محسوس ہو رہا ہے۔“ جس پر بھابی حمیرا نے کہا کہ ”بھئی کچھ وقت گزار لو پھر کھانا کھا لینے کے بعد میں تمہیں سر درد کا ایک انمول قسم کا جوشاندہ بنا کر دوں گی۔ وہ پی لینا اور ساتھ ہی دوائی کھا لینا سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

خیر اس کے بعد باتیں کیا کرنا تھیں بس خالی خولی بیٹھا رہا اور پھر عشاء کے وقت سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔ کچھ وقت کے بعد بھابی حمیرا نے پیالے میں جوشاندہ نما شربت اور سفید کاغذ کی ایک پڑیا میں سفید رنگ کا کوئی سفوف مجھے دیا اور کہا کہ ملک صاحب سفوف کو منہ میں ڈال کر جوشاندہ پی لو تھوڑی دیر کے بعد تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہوجاؤ گے۔ میں امی جان سے کچھ باتیں کرلوں وہ بھی تمہارے ہی حق میں فائدہ مند ہوں گی اور پھر میں تمہارے پاس آکر کچھ اور باتیں بھی کروں گی اور تمہارا مشورہ بھی لوں گی اس کے بعد تم سو جانا۔

پھر کوئی دو گھنٹہ کے بعد بھابی حمیرا کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے لباس بدلا ہوا تھا اور کوئی مسحور کن خوش بُو لگائی ہوئی تھی۔ وہ کرسی میرے نزدیک کر کے بیٹھ گئی۔ میرے سر درد کے بارے میں پوچھا۔

”حق نواز تم مجھے حلف دو کہ جو بھی میں تمہارے ساتھ بات چیت کروں گی تم اپنے بھائی تک کو نہیں بتاؤ گے اور اسی میں تمہارا فائدہ بھی ہو گا۔“

میں نے قسم کھا کر یقین دلا دیا کہ میں ان کی بات راز ہی رکھوں گا۔ اس نے کرسی میرے کچھ اور نزدیک کر لی اس کے ساتھ ہی سر سے دوپٹہ کرسی پر گرا دیا اور وہ بغیر دوپٹا بیٹھ گئی۔ جس کی وجہ سے اس کے جسم کے خطوط نمایاں ہو گئے۔ یہ اس کھائی گئی دوا کا اثر تھا یا جوشاندہ میں ملائی گئی دوا کا کہ میرے وجود میں گرمی سی محسوس ہونے لگی یہ غیرت نہ آئی کہ میں حمیرا سے کہوں کہ وہ دوپٹا اوڑھ لے بلکہ وہ منظر بہت اچھا لگنے لگا میں کوشش کے باوجود اس پرشباب سراپا سے نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ باریک کپڑے کی قمیص سے چھلکتا شباب مجھے بے خود کیے دے رہا تھا۔ بھابی میری کیفیت کو محسوس کر رہی تھی ان کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو کسی شکار کو بے بس دیکھ کر شیرنی کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

”حق نواز تم شہر میں رہے ہو کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے سچ سچ جواب دینا۔“ ساتھ ہی میرا ہاتھ بھی پکڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”میں نے زندگی میں اگر محبت کی ہے تو صرف بھائی صاحب سے وہی میرے باپ بھی ہیں اور ماں بھی۔“ یہ میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ پکڑنے سے میرے اندر گویا کرنٹ سا دوڑ رہا تھا۔ اس پر وہ بولی۔

”بے وقوف میں نے یہ پوچھا ہے کہ کبھی کسی لڑکی سے بھی تم نے محبت کی ہے۔“ پھر وہ ہنسنے لگی اور بولی۔

”عورت کی محبت ہی تو کسی مرد کو اصل مرد کہلوانے کا حق دار بناتی ہے اور تم اس سے دور ہو۔“ اسی دوران وہ مسلسل میرا ہاتھ سہلاتی اور دباتی جا رہی تھی پھر اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ اپنی ران پر رکھ لیا۔ اس کے اس عمل سے میرے اندر گویا طوفان سے اٹھنے لگے پھر وہ بولی تو اس کی آواز جذبات سے بھری ہوئی تھی۔

”میری بہن سمیرا تمہیں کیسی لگی اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے امی جان سے بات کروں۔“

”جیسی آپ کی مرضی آپ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے منظور ہو گا۔“ میں بولا تو میری آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی یوں لگ رہا تھا میرا خون میری جلد کو پھاڑ دے گا۔ میری سانسیں تیز ہو رہی تھیں اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

حمیرا بھابی نے میری یہ کیفیت دیکھی تو اٹھ کر میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اتنا نزدیک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ اس کے بعد میں اندھا بلکہ درندہ بن گیا۔ رشتوں کا سارا تقدس بھاپ بن کر اڑ گیا اور میں شیطان کا ہم سفر بن گیا۔

ہم اذانِ فجر تک اس جہنمی کھیل میں مصروف رہے اور پھر وہ میرے پاس سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور جاتے جاتے یہ کہہ گئی۔

”ملک گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں جو ہوا بہت اچھا ہوا تم واقعی جواں مرد ہو۔ ہیرو ہو میرے میں تمہارا خیال کروں گی کہ گرمی تم سے دور رہے اور تم میرا خیال کرو گے کہ مجھے سردی نہ لگ جائے۔“ اور اس طرح پانچ دن ہم کوٹ مٹھن میں رہے اور ہر رات یہ کھیل کھیلا جاتا رہا راتیں جاگ کر اور دن زیادہ تر سوتے ہوئے گزرتے۔

چھٹے دن ہم واپس جام پور آ گئے۔ جام پور جاتے وقت میں ایک انسان تھا لیکن جب واپس آیا تو مکمل بدکردار شیطان کا چیلا بن چکا تھا۔ پھر یہی ڈیوٹی جام پور آنے کے بعد بھی مجھے دن کے اوقات میں سرانجام دینا پڑتی کیونکہ بھائی صاحب تو ڈیوٹی کی ادائیگی کے لیے گئے ہوتے تھے۔ اس طرح کرتے کرتے دو ماہ گزر گئے۔ اس دوران میرا بی اے کا رزلٹ بھی آ گیا۔ جس میں میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ جس کی خوشی میں بھائی صاحب نے جہاں مٹھائی تقسیم کی وہیں پر میری من پسند چیزیں بھی بطور تحفہ لے کر دیں۔ مبارک بادی کے سلسلے میں سلیم احمد چوہدری بھی آئے اور جب وہ واپس جانے لگے تو کہا کہ برخوردار حق نواز اب تمہیں اور پڑھنے کی ضرورت نہیں تمہاری نوکری کا میں بندوبست کر دوں گا اب تمہارا فرض ہے کہ اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ بٹاؤ تاکہ بعد میں تمہاری شادی کا بھی بندوبست کیا جائے۔

میں اس سے اگلے دن ڈیرہ غازی خان کالج گیا۔ اپنے کالج چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ اور اسناد حاصل کیں اور پھر شام تک واپس جام پور آ گیا۔

بھائی صاحب گھر آئے تو انہیں سرٹیفکیٹ اور سند دی اور پھر بے دلی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کیونکہ میری خوشی کا کھیل بے غیرتی جو میں آج نہ کھیل سکا اس نے مجھے بے سکون کر دیا تھا۔ جیسے تیسے رات گزاری دن ہوا اور پھر بھائی صاحب نوکری پر چلے گئے اور ہم دونوں آزاد ہو گئے۔ پہلے تو ہم دونوں نے اپنی جسمانی بھوک مٹائی اور جب نہا کر پاک صاف ہو کر کپڑے بدل لیے تو حمیرا نے کہا۔

”حق نواز جی اب میں نے تمہاری ڈیوٹی ادا کر دی ہے تو پیارے دیور جی اب میرے پاس بیٹھو اور میری بات غور سے سنو اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ ورنہ آسمان ہمارے سر پر ٹوٹنے والا ہے۔“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارے بھائی صاحب خیر سے باپ بننے کے قابل نہیں ہیں۔ انہوں نے جس ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کروایا ہے وہ حرامی بڑا رنگین مزاج ہے۔ اس نے روپوں کے لالچ میں تمہارے بھائی کی رپورٹ کی فوٹو کاپی مجھے بھی دے دی کہ تمہیں سخت ہوشیاری سے وقت گزارنا ہو گا ورنہ جان سے جاؤ گی جس کے جواب میں میں نے اسے تو یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ ادکلموہے ڈاکٹر میں ایسی ویسی عورت نہیں کہ مجھے کوئی ڈر یا خوف ہو ملک جیسا بھی ہے وہی میرا خاوند میرے سر کا تاج ہے اور میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کروں گی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں ہی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتی بانجھ ہوتی تو پھر وہ بھی تو برداشت کرتا کیونکہ دوسری شادی کرنے کی مد میں اسے مجھ کو دس لاکھ روپے ادا کرنے پڑتے اور وہ اتنی بڑی رقم مجھے کہاں سے ادا کرتا اور اگر میں بھی اس سے طلاق مانگتی تو میں یا میرے وارث اتنی بڑی رقم اسے کہاں سے ادا کرتے لہٰذا ہمیں گزارہ تو کرنا ہی ہے تو پاک وصاف اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہو کر کیوں نہ گزاردیں۔ لہٰذا آج تو میں نے تمہاری بکواس سن لی ہے اور اگر تم نے آئندہ مجھ سے ایسی کوئی بات کی تو تم خود بھی اپنے مالی وجسمانی نقصان کے ذمہ دار ہو گے لہٰذا خدا حافظ ڈاکٹر۔ اسے تو میں نے اپنے آپ کو بچا لیا لیکن کوٹ مٹھن کے اکٹھے سفر میں جانے اور واپس آنے سے لے کر آج تک میں اپنے آپ کو تم سے نہ بچا سکی مانا کہ اس میں میری رضا بھی شامل تھی مگر یہ گناہ ہوا یا کیا گیا اس میں ہم دونوں ہی قصوروار ہیں۔ اب جب کہ ہم دونوں

نے اس پیاسی زمین کو سیراب کر کے بیج ڈالنا شروع کر دیا ہے تو طاقت ور بیج نے جڑیں پکڑ لی۔ یہی اس بات کو دوسرا ماہ ختم ہو کر تیسرا لگ چکا ہے اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو عنقریب جڑ سے نکل کر سامنے آنے والی کونپلیں پردہ فاش کر دیں گی اور جہاں ہماری بدنامی مقدر ہو گی وہیں پر حرام کاری کے جرم میں سزائے موت سے ہمیں کوئی بھی نہ بچا سکے گا اور اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم مرد ہو کوئی ایسی راہ نکالو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

ہماری بات چیت اور آگے بھی چلتی کہ بھائی صاحب نوکری سے آ گئے اور یہ خوش خبری سنائی کہ سلیم احمد چوہدری نے میرے کاغذات لے لیے ہیں اور کہا ہے کہ ہفتہ دس یوم کے اندر ہی اندر میں لاہور ہیڈ آفس جا کر حق نواز کی نوکری کے آرڈرز کروا لاؤں گا اور لاہور روانہ ہونے سے پہلے اس سے نوکری حاصل کرنے کی درخواست بھی تمہارے گھر آ کر لکھوا دوں گا۔ کیونکہ بس بھی تمہارے گھر کے نزدیک ہی سے ملنا ہو گی باقی اللہ تعالیٰ مالک ہے خیر ہی کرے گا۔

مجھے تو حمیرا کی بات چیت سننے کے بعد ہی سے اپنی خیر نظر نہیں آ رہی تھی۔ رات بھی سوتے جاگتے اور مختلف ڈراؤنے خواب دیکھتے ہوئے گزر گئی اور دل و دماغ میں ایک ہی بات سما گئی کہ اب کیا ہو گا اور تب کیا ہو گا۔ بھائی صاحب نے نوکری پر جانے کی تیاری کی اور پھر میری طرف جب ان کی نظر گئی تو انہوں نے میرے چہرے اور آنکھوں کی طرف دیکھ کر بڑی محبت سے کہا۔

"چھوٹے خیر تو ہے تمہاری آنکھیں سرخ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تم رات کو روتے رہے ہو اور تمہیں نیند بھی نہیں آئی۔"

جس کے جواب میں، میں نے کہا۔

"بھائی ساری رات سر میں بہت درد رہا ہے اور نیند بھی نہیں آئی۔" تو بھائی صاحب نے اسپتال سے دوائی لینے اور آرام کا مشورہ دیا اور چلے گئے۔ بھائی صاحب کے جاتے ہی حمیرا نے زبان کھولی۔

"حق نواز اس طرح ڈراما بازی سے کام نہیں چلے گا ناشتا کر لو پھر میں تمہاری اصل دوائی کی خوراک بھی تمہیں دیتی ہوں۔ مرد بنو اور حالات کا مقابلہ کرو بلکہ مقابلہ کرنا ہو گا اور جو بویا ہے اسے کاٹنا بھی ہے گھبراتے کیوں ہو میں عورت ہو کر نہیں گھبرائی اور حمل ضائع کروانے کے سلسلے میں دو چکر اس حرامی ڈاکٹر کے کلینک کے بھی لگا آئی ہوں۔ اس نے موٹی رقم لے کر بھی اپنا کمینہ پن دکھا دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی اور سے کروا سکتا ہوں۔ اس کے بعد بھی میں نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا اور ایک تم ہو ذرا سی مصیبت دیکھ کر ہاتھ پیر چھوڑ رہے ہو۔ آؤ پہلے تو تم اپنی خوراک کھا لو تمہارا دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں ایک بھرپور مشورہ دوں گی جس پر اگر عمل کیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے اور ہم دونوں پر کوئی بھی حرمت نہ آئے گی۔"

اس کے بعد حمیرا نے وہی شیطانی خوراک مجھے دی جس کے بھرپور جوش میں آ کر بھی تھکاوٹ کا احساس تک نہ ہوا اور اس کے بعد کہنے لگی۔

"ناراض نہ ہونا میں جس طرح کا مشورہ تمہیں دوں اسی طرح عمل کرو اور بڑے ملک صاحب کو قتل کر دو اسی میں ہماری بچت ہے اور ہم دونوں کسی بھی طرح قانون کی گرفت میں نہ آئیں گے اگر ہماری زبان بند رہی اور ایک دوسرے کے دفاع میں بھی رہے۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں بڑے بھائی کے تمام احسانات محبت و خلوص کو بھول گیا اور ان کو قتل کرنے کی تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

بڑے بھائی کے حق میں ہم نے جو فیصلہ کیا تھا اس کے بارے میں چھ سات دن سوچ بچار کی گئی کہ کام بھی خلاص ہو جائے اور انہیں قتل بھی نہ کرنا پڑے۔ لیکن بچت کی کوئی بھی راہ نظر نہ آئی۔ پھر حتمی فیصلہ کیا گیا کہ آج ملک صاحب کو موت کی نیند سلا دیا جائے اور اس کے سلسلے کے تمام تر انتظام مکمل کر لیے گئے۔

اس روز بھائی صاحب کے نوکری سے واپس آنے سے پہلے میں اپنے کمرے میں سو گیا اور یہ سونا ایک قسم کا مکر تھا۔ جب بھائی صاحب گھر میں داخل ہوئے تو میں ان کو نظر نہ آیا۔ انہوں نے حمیرا سے دریافت کیا۔ اس نے میری صحت کی خرابی کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ سننے کے بعد بھائی صاحب کمرے میں آئے اور مجھے آواز دی۔

"اٹھ چھوٹے میں آ گیا ہوں چل تجھے ڈاکٹر کو دکھا کر دوائی لے آئیں۔" اور پھر جا کر دوائی لی گئی۔ انہوں نے بسکٹ مجھے ہاتھ سے کھلائے دوائی کی خوراک دی اس کے بعد انہوں نے کھانا بھی میرے کمرے میں بیٹھ کر کھایا اور پھر مجھے آنکھیں بند کیے ہوئے دیکھ کر اٹھ کر دوسرے کمرے میں اٹھ کر چلے گئے کہ شاید مجھے نیند آ گئی ہے حالانکہ میں تو مکر و فریب سے کام لے رہا تھا۔ اس طرح میں رات نو بجے تک سویا رہا کہ اتنے میں بھائی صاحب نیم گرم دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں آئے اور مجھے آواز دی۔

"اٹھو چھوٹے ملک دودھ پی لو۔" میں نے اٹھ کر دودھ کا گلاس بھائی صاحب کے ہاتھ سے لے لیا اور تھوڑا تھوڑا سا کر کے پی لیا۔ خالی گلاس بھائی صاحب نے لے لیا تو میں نے کہا۔

"بھائی آج جمعرات کی رات ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ مجھے پیاری ماں اور والد صاحب کی قبر پر

قبرستان لے کر چلیں۔ شاید جو بے سکونی میرے سارے وجود میں آئی ہوئی ہے یا کسی پکڑ میں آیا ہوں تو قبرستان جانے کی وجہ سے مجھے سکون مل جائے۔ کوئی دور نہیں جائیں گے اور پھر جلد ہی واپس آ جائیں گے۔“

بھائی صاحب میری بات سن کر فوراً تیار ہو گئے۔

ہم دونوں بھائی قبرستان ماں اور باپ کی قبروں پر پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں ڈبل ڈوز جو حمیرا نے بھائی کے دودھ میں ملائی تھی اور زیادہ میٹھا ڈال دینے کی وجہ سے پتا نہ چل سکا کہ دودھ میں کچھ ملا کر دیا گیا ہے اور بھائی صاحب نے دودھ پی لیا تھا دودھ نے اپنا اثر دکھا دیا تھا اور بھائی صاحب بے ہوش ہو گئے اور قبر پر بیٹھے بیٹھے گر گئے تھے۔ ان کا قبر پر کیا گرنا تھا کہ میں نے دن میں آ کر چھپائی گئی کلہاڑی نکالی اور پورے زور سے ان کی گردن پر وار کر دیا اور پھر وار پر وار کرتا گیا۔ میں اپنے محبت کرنے والے بھائی کا قاتل بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے وجود پر دو تین ٹارچوں کی فل روشنی پڑی اور ساتھ ہی آواز آئی۔

”خبردار کون ہو ہاتھ اوپر کرو بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ گولی مار دی جائے گی۔“

میں نے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا اور ڈنڈوں سے ان لوگوں نے میری دل کھول کر مرمت کی اور ساتھ ہی میرے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں ڈال دی گئیں اور یہ سب پولیس چوکی جام پور کے اہل کار تھے جن کی سربراہی ایس آئی کر رہا تھا اور ان کے ہمراہ ڈاکٹر محمد ولی' ناگن نما عورت حمیرا اور قبرستان کا گورکن بطور گواہان تھے اور مجھے قاتل کی حیثیت سے موقع پر گرفتار کر لیا گیا۔

(اس قتل کی خبر اس وقت کے امروز اخبار میں چھپی تھی)

اور لاش پولیس نے اپنے قبضے میں لے کر سول اسپتال روانہ کر دی اور مجھے پولیس چوکی کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔

بعد میں پتا چلا کہ پولیس نے مجھ پر جو چارج لگایا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ حمیرا اقبال نامی عورت جس کے ہمراہ مددگار کے طور پر ڈاکٹر ولی صاحب تھے ساڑھے دس بجے کے قریب پولیس چوکی جام پور میں اس درخواست کے ساتھ حاضر ہوئے کہ انہیں شک کیا بلکہ یقین ہے کہ حمیرا اقبال کا چھوٹا دیور حق نواز ملک جو کہ تقریباً ساڑھے نو بجے رات کو اپنے بڑے بھائی محمد اقبال ملک کو گھر سے یہ کہہ کر لے گیا کہ ہم قبرستان والدین کی قبروں تک جا رہے ہیں۔ کہیں وہ اقبال ملک کو قبرستان لے جا کر قتل ہی نہ کر دے کیونکہ وہ پہلے ہی دو تین دفعہ اپنے بڑے بھائی کو قتل کرنے کی دھمکی دے چکا ہے اور اس نے بڑے بھائی کو یہ دھمکی اس لیے دی کہ یا تو وہ اپنی سالی سمیرا فیض سے میری جلد از جلد شادی کروا دے اور وہ یہ کام نہیں کر سکتا تو پھر اپنی بیوی حمیرا اقبال کو طلاق دے دے جب کہ ان دونوں کاموں سے محمد اقبال ملک نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میری سالی سمیرا فیض کا پہلے ہی نکاح ہو چکا ہے۔ میں تمہارا رشتہ اپنے سسرال سے کیسے مانگوں اور حمیرا اقبال میرے بچے کو دنیا میں لانے والی یعنی کہ پیدا کرنے والی ہے۔ اس معصوم و بے گناہ عورت کو میں طلاق کیوں دوں جس کے جواب میں حق نواز نے کہا کہ تو پھر بھائی آپ بھی اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکیں گے اور ہمیں ڈر ہے کہ کہیں وہ قبرستان جا کر اپنے بڑے بھائی کو قتل ہی نہ کر دے کیونکہ ان کو قبرستان گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔

جس پر ہم نے چوکی میں اندراج روانگی ڈال کر جب قبرستان میں جا کر چھاپہ مارا تو ملزم حق نواز ملک

اپنے بڑے بھائی کو قتل کر چکا تھا۔ آلۂ قتل کلہاڑی اور ملزم حق نواز کو حراست میں لیا جب کہ چھاپہ مارتے وقت محمد بلال گورکن بھی ہمارے ساتھ تھے اور وہ بطور گواہ اس قتل کا ہوگا اور زیر دفعہ 302 پاکستان کا یہ کیس ملزم کے لیے سزائے موت کا مستوجب ہے۔

سال بھر یہ کیس ڈیرہ غازی خان سیشن جج کی عدالت میں سماعت کے لیے پیش ہوتا رہا۔ جس میں چاروں طرف سے مجھ پر لوگوں کی طرف سے تھو تھو ہوتی رہی۔ میری کسی بھی بات کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اور بالآخر مجھے سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا اور پھر میرے کالج کے وقت کے ایک ساتھی نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی جس پر میری سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا گیا اور سینٹرل جیل ملتان میرا مقدر بنی۔ جیل میں بھی قیدیوں پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ میں نے اپنے بے گناہ بڑے بھائی کو قتل کیا ہے تو وہاں پر بھی لعنت ملامت ہی میرے حصے میں آئی۔

کوئی ایک سال پہلے میری رہائی ہوئی ہے جب کہ میں جیل سے باہر آزاد دنیا میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر جیلر نے مجھے کہا کہ جاؤ بھائی جاؤ۔ اب تم آزاد ہو باہر جا کر سچے دل سے بارگاہ خداوندی میں توبہ استغفار کرو اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کر دے۔

لہٰذا بھائی میں نے اپنی داستانِ غم آپ کو سنا دی ہے آپ بھی میرے حق میں دعائے خیر کریں۔ لیکن یہاں پر آ کر محمد حمزہ جان بول پڑا۔

”ملک صاحب آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ اس قتالہ صفت عورت کا کیا بنا۔“ جس پر اس کی ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

جناب خداوند کریم کی لاٹھی بے آواز ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ مجھ سے تو جو آپ سن چکے ہیں وہ سب کچھ کروا کر بعد میں مظلوم بن کر جیل کی چکی پسوا دی اور میں جوان سے بوڑھا ہو گیا۔ لیکن اس کی حرامی فطرت میں ہمارا گھرانہ اجاڑنے کے بعد پہلے تو ابارشن کروائی اور پھر کوئی سال بعد ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ ہمارے گھر سے سارا سامان اس کے بھائی ممتاز اور نواز اٹھا کر لے گئے کیونکہ دس مرلے کا مکان بھائی صاحب مرحوم نے میرے نام رجسٹر کروا رکھا تھا۔ جس کا مجھے بھی علم نہ تھا۔ اسے فروخت کر کے وہ رقم حاصل نہ کر سکے اگر ان کو مکان فروخت کرنے کی طاقت مل گئی ہوتی تو آج میں بے گھر ہوتا۔ ڈاکٹر ولی سے نکاح کرنے کے بعد وہ ایک سال تک اس کی وفادار رہی اور پھر اس نے ملک پیر بخش سے یاری گانٹھ لی۔ عشق اور مشک کبھی چھپائے سے نہیں چھپتا سامنے آ ہی جاتا ہے۔

اس کے نئے عشق کا علم ڈاکٹر ولی کو ہو گیا۔ جس پر ان کے درمیان جھگڑا ہوا اور پھر حمیرا ڈاکٹر کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور ڈاکٹر بعد میں ملک پیر بخش کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور آج ملک پیر بخش جیل میں دوہرے قتل کی سزا کاٹ رہا ہے۔ حالانکہ اس نے ایک قتل کیا تھا لیکن ابھی کسی کے علم میں نہ آیا تھا کہ حمیرا ابھی قتل ہو چکی ہے۔ اس لیے دوسرے قتل کو بھی باوجود اس کے انکار کے اس کے سر ڈال دیا اور سزا سنا دی گئی۔

بس یہیں پر اختتام ہوا آگے اور کچھ نہیں بس بارگاہ خداوندی میں دعا ہے کہ وہ مجھ کو بلکہ ہم سب کو راہِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔

☸

اسیر خیال

آداب! "اسیر" کے ساتھ حاضر ہوں۔ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جو کچھ نہیں کرسکتے وہ کہانیوں کے کرداروں میں ڈوب جاتے ہیں اور حقیقت کے بجائے ان خوابوں سے دل بہلاتے ہیں۔ کہنے کو یہ میرا بھی محبوب مشغلہ ہے۔ جب کہ حقیقتاً اسی مشغلے نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ مگر یہ جس لڑکی کی کہانی ہے۔ اس جیسے بہت سے لوگ اس معاشرے میں موجود ہیں۔ جو فرضی کہانیوں کو حقیقت کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند ہوتی ہیں اور جو ان داستانوں سے سبق حاصل کرنے کے بجائے من و عن ان پر ایمان لے آتے ہیں۔ اس کہانی کا آدھا پلاٹ آپ انگلش کی بک میں پڑھ چکے ہوں گے۔ مگر ایک حقیقت سے آپ کو روشناس کرانا تھا۔ سو دوبارہ پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کیا ایسا نہیں ہوتا......؟

آپ کی آرا کی منتظر
ناز سلوش ڈشے
میر پور آزاد کشمیر

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ موسم کی تبدیلی کے باعث شام تھوڑی سرد تھی۔ اس نے الماری سے شال نکال کر کندھوں پر ڈالی اور وال کلاک دیکھنے لگی۔ ابھی پانچ بجے تھے۔ اسد صبح جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ پانچ بجے تک واپس آئیں گے۔ سو وہ اپنے لیے چائے کا کپ لے کر باہر لان میں آ گئی۔ ہوائیں ہلکی ہلکی خنکی سی تھی۔ شام کے اندھیرے میں بادل کے سائے بھی شامل ہو گئے تھے۔ پرندے بارش سے قبل ہی گھونسلوں میں پہنچنے کو بے تاب تھے۔ وہ گلاب کی ایک ادھ کھلی کلی کے پاس کھڑی چائے کے ہلکے ہلکے شپ لے رہی تھی کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس کے جلدی آجانے کے خیال سے اس کے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ پھیل گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ مگر سامنے نائمہ کھڑی تھی۔ نائمہ ان کے پڑوس میں رہتی تھی۔ خوش شکل اور صاف رنگت والی نائمہ اسے بہت بھلی لگتی تھی۔ اکثر وہ اپنی پڑھائی کی غرض سے اس کے پاس مدد لینے کو آتی۔ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں دیکھ کر میمونہ مسکرائی اور اسے لے کر اندر آ گئی۔

چائے کا کپ نائمہ کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"آج کیا پڑھنے آئی ہو مومو؟"

"اصل میں کالج کی کلاسز تو شروع ہو گئی تھیں مگر میں نہیں گئی پہلے دس دن اب آج گئی تو پتا چلا کہ انگلش کے پہلے دو چیپٹرز کا ٹیسٹ ہے۔ آپ کے پاس اس لیے آئی تھی کہ آپ مجھے جلدی سے تیاری کروا دیں۔" نائمہ نے کتابیں کھول کر ٹیبل پر رکھیں اور اپنی گود میں نوٹ بک رکھ لی۔

"میمونہ نے پہلے چیپٹر کا جائزہ لیا۔ بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ کہانی اس کی پسندیدہ تھی۔ اپنے کالج کے زمانے میں بھی اس نے یہ بارہا پڑھی تھی اور آج جب نائمہ یہ کہانی لے کر آئی تو اس نے جھٹ سے بہت آسان لفظوں میں اس کو تیاری کروانا شروع کر دی۔

سات بجے جب نائمہ خوشی خوشی اپنے گھر گئی تو اس وقت تک میمونہ پور پور اس کہانی میں ڈوب چکی تھی۔ یہ اس کی کمزوری تھی اکثر وہ اپنی پسندیدہ کہانیوں میں کسی ایک کردار میں خود کو ڈھال لیتی اور پھر دنیا جہاں سے بے خبر ہو جاتی۔ ابھی بھی سرشاری کا احساس لیے وہ ذہن میں کہانی کے تانے بنتے رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ کیونکہ اسد کے آنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی بچا تھا۔

ہوا کے تیز دباؤ سے کھڑکی اچانک کھل گئی۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا میمونہ کے گالوں سے ٹکرایا تو گہری نیند کے باوجود اس کی آنکھ کھل گئی۔ دوسرے ہی لمحے سخت سردی کے احساس نے میمونہ کے پورے جسم کو اپنی زد میں لے لیا۔ میمونہ نے بستر سے اٹھ کر کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ نیند کو بھگانے کے لیے وہ بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

دبلی پتلی، گورا رنگ، نیلی نیلی بھیگی آنکھیں اور ان میں ٹھہرا پانی گویا وہ نیلے سمندر ہوں جس میں ڈوب جانے کو من کرتا۔ گلابی ہونٹ گویا گلاب کی پنکھڑیاں، گردن ایسی جیسے کہ صراحی ہو۔ اس پر خدا نے اسے سنہرے بال عطا کیے تو کیا بات۔

ہوا کے جھونکوں سے اس کے سنہری سونے کی مانند بال بکھر کر چہرے پر آ گئے۔ اس نے پہلے تو ان کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ پھر نجانے اس کے دل میں ایسی کیا بات آئی کہ اس نے انہیں کھلا ہی رہنے دیا۔ ہوا کے سرد جھونکے اب اس کو برے نہیں لگ رہے تھے۔ بلکہ وہ ان سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ موسم یکدم ہی اتنا حسین ہو گیا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے خیالوں کے سمندر میں جیسے کھو سی گئی۔

وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ جب کسی نے بیل بجائی۔ اس نے کسلمندی سے اپنے شوہر کو آواز دی۔

"اسد پلیز اٹھیں اور ذرا باہر دیکھیں کہ کون ہے؟"

اسد میمونہ سے زیادہ سست ثابت ہوا۔

"میں اخبار کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔ پلیز تم ہی دیکھ لو۔"

میمونہ نے ایک ناراض سی نگاہ اپنے سے زیادہ سست شوہر پر ڈالی اور بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"قسم سے نا آپ بھی اسد۔ جھوٹ ہی ہو کہ کبھی آپ اٹھ کر کوئی کام کر لیں۔" تیزی سے سلیپر گھسیٹتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی اور ساتھ ہی دوپٹا اوڑھتے ہوئے کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کون؟ کون ہے؟" وہ جھنجلائی۔

اس نے کچھ دیر صبر کیا مگر کوئی بھی نہیں بولا۔ آخر اس نے دروازہ کھولا تو باہر کوئی بھی نہ تھا۔ جیسے ہی میمونہ دروازہ بند کرنے لگی تو اس کی نظر ایک ڈبے پر پڑی۔ پہلے وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی اس نے گلی میں نکل کر دیکھا مگر ارد گرد قریب کوئی بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر اس نے سوچا پھر ڈبا اٹھا کر اندر لے آئی۔ اسد کی نظریں تو اخبار پر تھیں مگر میمونہ کے قدموں کی چاپ سن کر وہ مصروف سے لہجے میں بولا۔

"آ گئیں کون تھا؟"

میمونہ اپنے شوہر کے اس انداز پر جل کر رہ گئی۔

"پارسل آیا ہے بندہ تو کوئی نظر نہیں آیا۔ مگر یہ باہر کوئی رکھ گیا ہے۔ اوپر نام بھی آپ کا لکھا ہوا ہے۔ مجھے تو تجسس ہونے لگا ہے۔ پلیز اسے کھولیں تو، ذرا دیکھیں کیا ہے اس میں۔" ایک پاؤں فولڈ کر کے وہ بیڈ پر بیٹھی اور پارسل اسد کے سامنے رکھ دیا۔

اسد بھی اس انوکھے پارسل کے تجسس میں سیدھا ہو کر بیٹھا اور پرانے اخبار کو ایک طرف ڈالتے ہوئے پارسل کا جائزہ لینے لگا۔

"کھولیں نا۔" میمونہ نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔

اسد نے کڑی نگاہوں سے اسے گھورا تو وہ ٹھنڈی ہو کر بیٹھ گئی۔

"صبر بھی کرلیا کرو۔" اسد نے احتیاط سے پارسل کی ریپنگ کھولی۔ اندر گتے کا ایک ڈبا تھا۔ جس کے اندر ایک اور لکڑی کا ڈبا تھا۔ جس پر سوائے ایک بٹن کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میمونہ نے تجسس سے ڈبا دیکھا اور سوالات کے انبار لگا دیے۔ "یہ بٹن کس چیز کا ہے؟ کس مقصد کے لیے ہے؟ ہمارے گھر میں کون رکھ گیا ہے؟ کیوں رکھ گیا ہے؟" اس کے برعکس اسد نہایت اطمینان سے ڈبے اور پارسل کا جائزہ لے رہا تھا۔ پارسل پر فقط اسی کے گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ بھیجنے والے کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔

"تم ذرا میرے لیے چائے لے آؤ۔ تب تک میں اس ڈبے کا مقصد معلوم کرتا ہوں۔" اسد نے سر اٹھائے بغیر اسے چائے کا بولا اور پھر سے ڈبے کے کونے کھدروں میں جھانکنے لگا۔ اچانک ہی اس میں سے ایک پرچہ نیچے گرا۔ اس نے ڈبا چھوڑ کر پرچا اٹھا لیا۔ "وہ مارا۔" وہ خوشی سے چیخا۔

"کیا مارا۔" میمونہ کچن سے بولی۔

"تم چائے لے کر آؤ تو بتاتا ہوں۔ ڈبے میں سے ایک پرچا نکلا ہے یقیناً اس کے اندر ڈبے کا راز ہوگا۔"

"تب تو پھر میرے آنے تک کا انتظار کریں۔ بس چائے بھی تیار ہے۔" اگلے دو منٹ میں وہ چائے کے ساتھ حاضر تھی۔

"ویسے مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہ پارسل کوئی ہمیں ہی کیوں دے گیا ہے۔"

"بھئی دینے والے نے پہلے مجھ سے پوچھا نہیں تھا ورنہ میں ضرور تمہارے اس سوال کا جواب دیتا۔"

"اچھا چھوڑیں یہ بتائیں کیا لکھا ہے اس پرچے میں۔"

"اس میں تو صرف دو لائنیں لکھی ہیں کوئی جاوید صاحب رات آٹھ بجے آئیں گے اور وہی بتائیں گے کہ یہ کیوں اور کس لیے بھیجا گیا ہے۔"

میمونہ کو انتہائی تجسس تھا کہ ڈبا کیا ہے؟ رات کو اس کے بارے میں کیا بتایا جائے گا۔ وہ خواہشات سے بھرپور عورت تھی۔ زندگی کو آسائشات سے بھرپور دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ خیال ہی خیال میں الٰہ دین کے چراغ کا سوچتی رہتی اور اب جو ایک نہایت عجیب قسم کا پارسل گھر آیا تھا اس نے الٰہ دین کے چراغ کی جگہ لے لی تھی۔ "پرانا وقت تھا تو جن چراغوں میں ہوا کرتے تھے۔ اب نیا دور ہے ادھر بٹن دبے گا ادھر کھٹاک سے جن باہر۔" وہ اپنی سوچ پر مسکرا دی۔ اسد نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تو اس کا کندھا ہلایا۔

"خیریت تو ہے بیگم صاحبہ۔"

وہ چونکی۔ "اوہ ہاں اصل میں میں سوچ رہی تھی کہ رات کو کیا بناؤں۔"

"جو تمہاری مرضی ہے بنالو۔ آج موسم ویسے بھی ابر آلود ہے آدھا دن تو گزر گیا ہے مگر گمان شام کا ہوتا ہے۔ جو بھی پکالوگی ہم تو کھا ہی لیں گے۔" اسد نے شرارتی انداز میں کہا اور اخبار ایک طرف کر کے بیڈ سے ٹیک لگالی۔

"کیا میں اتنا برا پکاتی ہوں۔" میمونہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ارے ارے یہ میں نے کب کہا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ اچھا تم بریانی بنالو۔ تب تک میں ذرا آرام کرلوں۔ طبیعت صبح سے بوجھل ہو رہی ہے۔" چائے کا کپ اٹھاتی میمونہ کے ہاتھ ذرا رکے۔ اس نے جھٹ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے گرمی کا احساس ہوا۔

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں صبح سے یہی سوچ رہی تھی کہ آپ دفتر کیوں نہیں گئے۔ ورنہ آپ تو ان لوگوں میں ہیں جو اتوار کو بھی دفتر جانے کو بے چین ہوتے ہیں۔ چلیں اب آرام کریں۔ میں دوائی لے کر آتی ہوں اور خدا کا واسطہ ہے کتابیں مت پڑھنے بیٹھ جائیے گا۔ میں سوپ بنا کر لاتی ہوں۔" اس کی طبیعت کا سن کر اس کے ذہن سے کچھ دیر کے لیے مشین نما بٹن والا قصہ نکل گیا اور وہ اپنی روزمرہ زندگی میں پھر سے مشغول ہوگئی۔

☆/...../☆

رات کے کھانے سے فارغ ہوئے انہیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ اسد نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پستہ قد انسان موجود تھا۔ اس کے سر سے آگے کے بال زمانے کی نذر ہوگئے تھے اور ہاتھ میں ایک سیاہ لیدر کا چھوٹا سا بیگ تھا۔

"جی کون؟" اسد نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام جاوید ہے۔ صبح آپ کو ایک پارسل موصول ہوا ہوگا۔ اس کے بارے میں تفصیلاً بتانے آیا ہوں۔" آنے والے نے مختصراً اپنا بتایا تو اسد کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں گول ہوگئے۔

وہ اسے لے کر اندر سٹنگ روم میں آیا تو کچن سے میمونہ بھی باہر آگئی اور جب اسے علم ہوا کہ آنے والی شخصیت الٰہ دین کے چراغ جیسے ڈبے کا پتا دینے آئی ہے تو وہ تجسس اسد کے ساتھ ہی صوفے پر ٹک گئی۔ وہ حیرانی سے اس شخص کا جائزہ لینے لگی۔ جیسے جاوید کوئی انسان نہیں بلکہ خلائی مخلوق ہو۔

"بتائیے جاوید صاحب ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟" اسد نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

جاوید صاحب نے گلا صاف کیا اور بولے۔

"میرا تعلق ایک غیر ملکی کمپنی سے ہے۔ جو ہر سال نت نئی ایجادات کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہم ہر سال لوگوں کو حیران کر دینے والی پروڈکٹس تیار کرتے ہیں۔ اس دفعہ ہم نے یہ بٹن والا آلہ تیار کیا ہے۔ جسے "Desire" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک جادوئی مشین ہے بٹن دبانے پر یہ بیک وقت تین کام کرتی ہے۔ اس کے اندر موجود سسٹم بٹن دبنے پر سب سے پہلے اس کرۂ ارض پر بسنے والے کروڑوں انسانوں میں سے ایک نہایت فالتو اور ناکارہ شخص کا خاتمہ کرتا ہے۔ ایسا شخص جس سے آپ کا کوئی تعلق، واسطہ نہیں ہوتا۔ دوسرا کام ایک خطیر رقم ملے گی۔ جس کی مالیت پچاس لاکھ تک ہوگی۔"

"اور تیسرا کام؟" جاوید صاحب ذرا سانس لینے کو رکے تو میمونہ نے فوراً کہا۔

"تیسرا کام یہ کہ ان دونوں کاموں کے بعد آپ کے ذہن میں فوراً ایک سوال گردش کرے گا۔ اگر آپ اس کا جواب تلاش کرلیں گے تو باقی زندگی عیش ہی عیش اور اگر نہیں کر پائیں گے تو ساری عمر ایک پچھتاوا آپ کے ساتھ رہے گا۔"

اسد جو نہایت غور سے یہ ساری باتیں سن رہا تھا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"لیکن ہم کیوں کسی کو بلاوجہ ماریں۔ دنیا میں کوئی بھی چیز بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی اور بالفرض اگر ایسا ہے بھی تو اس ناکارہ انسان کا قتل ہمارے ہاتھوں ہی کیوں ہو؟ نہ بابا ہمیں کسی ایسے پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کسی کو مار کر لیا جائے۔"

میمونہ جو منہ ہی منہ میں پچاس لاکھ۔ پورے پچاس لاکھ کا ورد کر رہی تھی اسد کے انکار پر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"اسد سوچو ہمیں بیٹھے بٹھائے پورے پچاس لاکھ ملیں گے۔ ہمارے بہت سے خواب بھی پورے ہوجائیں گے۔ نئی گاڑی بھی آجائے گی اور.....!"

"میمونہ خود غرض مت بنو۔ ہمیں اس طرح کی لالچ نہیں رکھنی چاہیے اور جاوید صاحب آپ کا شکریہ۔ ہمیں یہ آفر بالکل بھی قبول نہیں۔ آپ اپنے ساتھ اس مشین کو بھی لے جایئے۔" اسد نہایت تلخ لہجے میں گویا ہوا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔" جاوید صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا بیگ کھولنے لگا۔

"جاوید صاحب میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ کی پروڈکٹ واقعی نہایت حیران کن ہو مگر مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اب آپ مہربانی فرمائیں اور خود سے ہی چلے جائیں۔ یہ نہ ہو کہ مجھے کوئی اور راستا اختیار کرنا پڑے۔"

اپنی اتنی عزت افزائی پر آخرکار جاوید صاحب اٹھ کھڑے ہوئے مگر جاتے جاتے پھر پلٹے۔ "میں چلا تو جاتا ہوں لیکن یہ میرا کارڈ رکھ لیں مجھے امید ہے کہ آپ کو میری ضرورت پڑے گی۔"

اسد کا پارہ ہائی ہوگیا۔

"نکل جاؤ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے۔"

اسد کے غصے کی انتہا نہ تھی۔ اس نے کارڈ کے پرزے پرزے کردیے اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"پتا نہیں اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ بستے ہیں۔ جو دوسروں کی زندگیاں اپنے تجربات کی نذر کر کے خوش ہوتے ہیں۔" وہ منہ ہی منہ بڑبڑاتا ہوا لیٹ گیا۔ جب کہ میمونہ ابھی تک پچاس لاکھ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ اس کا الٰہ دین کے چراغ والا خواب حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے۔

اگلے دن اسد کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ وہ صبح جلدی اٹھا تھا اور ہمیشہ کی طرح آج بھی میمونہ کروٹ بدلے سو رہی تھی۔ کھڑکی سے سورج کی کرنیں اس کے سنہرے بالوں پر پڑ رہی تھیں۔ مگر وہ پھر بھی بے سدھ تھی اسد نے اسے جگایا اور ناشتا بنانے کا کہا۔ مگر وہ آج بدلی بدلی اور ڈھیلی ڈھیلی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے گزشتہ رات وہ ٹھیک طرح سے سو نہ سکی ہو۔ الماری سے اپنے کپڑے نکالتے وقت بھی اسد نے اسے ایک آواز لگائی مگر وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ اسد کو شک گزرا کہ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ مگر لیٹ ہونے کے ڈر سے وہ فوراً تیار ہونے کو چل دیا۔ جب کہ میمونہ منہ دھو کر پچاس لاکھ کا ورد کرتے کرتے بادل ناخواستہ ناشتا بنانے لگی۔ وہ میمونہ کہ جو ناشتا دس منٹ میں تیار کرلیتی تھی آج اتنی دیر گزرنے کے باوجود ٹھیک سے چائے کا کپ بھی تیار نہ کرسکی۔

ڈائننگ ٹیبل پر کڑوی چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اسد نے اس کی بے دھیانی کو شدت سے نوٹ کیا۔

"خیریت تو ہے آج بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو۔"

"اسد ہم جاوید صاحب کی پیش کش قبول کرلیتے ہیں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" اسد نے غصے سے کپ ٹیبل پر پٹخا۔ "میں نے کہہ جو دیا تھا کہ ہمیں ایسے پیسے کی ضرورت نہیں جو کسی کو تکلیف دے کر حاصل کیا گیا ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم یہ خناس اپنے ذہن سے اتار دو۔"

اسد نے بیگ اٹھایا اور بغیر ناشتے کے ہی گھر سے نکل گیا۔

ادھر میمونہ بھی غصہ ہونے لگی۔ "میں اپنے لیے تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ آخر انہیں حالات کیوں نظر

نہیں آتے۔ ہماری ضرورتیں ایک ہیں تو اعتراض کیسا۔ ہاں مگر مجھے اپنے لیے ایک گھر اور ایک گاڑی چاہیے۔ میں بھی پر آسائش زندگی کی خواہش مند ہوں۔ پچاس لاکھ میں ہمیں یہ سب مل سکتا ہے۔"

میمونہ کی آنکھوں پر پچاس لاکھ کی پٹی بندھ گئی تھی اور اسے اپنے علاوہ کسی اور کی ذات نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔

سارا دن وہ یہی سوچتی رہی کہ کس طرح وہ پچاس لاکھ حاصل کرے؟ کس طرح وہ اسد کو منائے۔ مگر ساتھ میں یہ خیال بھی آتا کہ کچھ بھی ہوجائے اسد اس کام کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔

اس کی طرح اسد بھی دفتر میں ٹھیک طرح سے کام نہ کرسکا۔ وہ میمونہ کی سوچ سے پریشان تھا کہ وہ کس طرح کسی انسان کو صرف اپنی بے لگام خواہشات اور پیسے کے لیے مار سکتی ہے۔ اسے کس طرح روکا جائے؟ بہت سی سوچوں نے جب اس کے ذہن میں گھر کیا تو اسے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ گھر آیا تو نہ پہلے جیسی میمونہ موجود تھی اور نہ اس کی تھکاوٹ دور کردینے والی میمونہ کی مسکراہٹ۔ اسے گیٹ پر ایک مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہنے والی میمونہ کی شدت سے یاد آئی۔ میمونہ کا منہ بنا دیکھ کر وہ اور زیادہ تھکاوٹ محسوس کرنے لگا اور مزاج چڑچڑا ہوگیا۔ بات بات پر غصہ کرنے لگا۔

"آج کا دن ہی بڑا خراب ہے۔" آخر اس نے غصہ ون پر نکالنا شروع کردیا اور بیگ صوفے پر پھینکا اور جوتے اتارتے ہوئے میمونہ سے چائے لانے کا کہا۔ کچھ وقت گزرا تو وہ کچن میں جا کر میمونہ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ مگر اس کا موڈ پھر بھی بہتر نہ ہوا۔ بلکہ جہاں اس کی سوئی صبح رکی تھی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

چائے پیتے ہوئے اسد نے تحمل سے اپنی بات کا

آغاز کیا۔

”تم خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں کتنوں سے بہتر رکھا ہوا ہے۔ ہمیشہ انسان کو اپنے سے نیچے دیکھنا چاہیے تب ہی انسان خدا کا شکر ادا کرسکتا ہے۔ تم دیکھو خدا نے ہمیں ہر طرح کی نعمت سے نوازا ہے۔“ اور پھر اسد نے چائے کا گھونٹ بھرا اور میمونہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اس کا موڈ بھانپ لیا اور سمجھ لیا کہ یہ سمجھنے والی نہیں ہے۔ اس لیے خود کو کوستا ہوا اٹھا اور باہر چل دیا۔

میمونہ کے ذہن میں گھر اور گاڑی ہی تھی اور کوئی چیز تو اسے نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ ایک طرف پچاس لاکھ اور دوسری طرف اسد کی باتیں اس کے ذہن میں گردش کررہی تھیں۔

”تم جانتی ہو کہ میں گھٹیا انسان نہیں ہوں کہ اپنی خوشی کی خاطر کسی بھی انسان کا خون کردوں۔ چاہے وہ بے کار شخص ہی کیوں نہ ہو۔ اگر پیسا ہمارے نصیب میں ہوا تو خدا تعالیٰ اس سے بہتر سبب بنائے گا۔ لیکن اس وقت تم خود غرض مت بنو۔“

ان باتوں کے ساتھ ساتھ میمونہ اس سوال کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو رقم ملنے کے بعد ذہن میں بیدار ہوتا تھا۔

رات اسد لیٹ گھر آیا اور بنا کھانا کھائے اور بات کیے کمبل تان کر سو گیا۔ میمونہ ساری رات جاگتی رہی اور اپنی خواہشات کے تانے بانے بنتی رہی۔ خواہشات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اسے بار بار مجبور کررہا تھا کہ وہ اٹھے اور بٹن دبا کر پچاس لاکھ وصول کرے۔ میمونہ نے سوچا کہ آج رات فیصلہ ہو کر ہی رہے گا کیونکہ اچھی زندگی ہر انسان کا حق ہے۔ بعد میں جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا اپنے فیصلے پر وہ مطمئن ہو کر سو گئی۔

صبح اسد کے آفس جانے کے بعد میمونہ نے بے تابی سے وہ کاغذ کے پرزے نکالے جن کو اسد نے پھینک دیا تھا۔ اس نے بہ مشکل پرزوں پر سے نمبر حاصل کیا اور جاوید صاحب کو کال ملائی۔ بیل کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی گنگناتا رہا۔ آخر فون پک کرلیا گیا۔

”جاوید اسپیکنگ۔“ جاوید صاحب کی باریک سی آواز سنائی دی۔

”جی میں مسز اسد بات کررہی ہوں۔ کیا مجھے وہ مشین دوبارہ مل سکتی ہے۔“

میمونہ نے چھوٹتے ہی کہا۔ اس کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کے باہر آجائے گا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی لرزش بھی وہ واضح محسوس کررہی تھی۔

”ٹھیک ہے! کچھ ہی گھنٹوں میں مل جائے گی۔“

اور پھر اگلے تین گھنٹوں میں وہی مشین میمونہ کے دروازے پر تھی۔ میمونہ کے پاس اس مشین کی چابی بھی تھی۔ جو انہوں نے مشین کے ساتھ بھیجی تھی۔ اس نے فوراً پیکنگ کھولی اور بلا حجت چابی لگا کر بٹن دبا دیا۔ پھر چابی اور بٹن والا ڈبا ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور مسکراتے ہوئے صوفے پر لیٹ کر پیسوں کا انتظار کرنے لگی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا مگر کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ جب دوسرے گھنٹے کے بعد وہ باؤلی ہونے کے قریب تھی۔ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ سامنے اسد کا وکیل کھڑا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اسد نے اپنا آبائی گھر بیچنے کے لیے وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ شاید اب بھی وہ اسی سلسلے میں گھر آیا تھا۔

”جی فرمائیے۔“ اس نے بے تاب نظروں سے وکیل کو دیکھا کہ شاید وہ ہی پیسے دینے آئے ہوں۔

وکیل نے کچھ کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھے اور بولا۔ ”آپ کے لیے دو خبریں ہیں ایک اچھی ایک بری۔“ وہ کچھ ڈرامائی انداز میں رکا اور میمونہ کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ ہنوز چپ اور بے تاب تھی۔

”اچھی خبر یہ ہے کہ اسد صاحب کے آبائی گھر کا سودا طے ہوگیا ہے اور یہ اس کا تیس لاکھ کا چیک ہے۔“ وکیل نے چیک میمونہ کی طرف بڑھایا۔ جسے میمونہ نے بے دلی سے پکڑا۔ کیونکہ بقول جاوید صاحب کے اسے پچاس لاکھ ملنے تھے۔ جب کہ یہ تیس لاکھ تھے۔

”اور بری خبر۔“ اس نے ابرو اچکا کر وکیل سے پوچھا۔

”بری خبر یہ کہ آپ کے شوہر یعنی اسد صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اب سے ایک گھنٹہ قبل وہ میرے آفس میں آئے تھے اور یہ ایک خط دے گئے تھے اور کہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد یہ میں آپ تک پہنچا دوں۔ پھر وہ میرے آفس سے نکلے تو سامنے روڈ پر ان کی گاڑی کی کھمبے سے ٹکر ہوئی اور وہ الٹ گئی۔ جب تک ان کو مدد پہنچی۔ ان کی روح پرواز کرچکی تھی۔ ان کی ڈیڈ باڈی اسپتال میں ہے۔ کچھ دیر تک گھر آجائے گی اور......!“ وکیل اور بھی نجانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر میمونہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ لرزتے ہاتھوں سے اسد کا آخری خط کھول رہی تھی جس میں ایک مختصر سی تحریر تھی۔

”جانِ اسد!

میرے لاکھ سمجھانے کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم وہ حرکت ضرور کرو گی جو مجھے ناگوار ہے۔ چلو تم خوش رہو۔ شاید آج میں گھر واپس نہ آسکوں۔ اپنا خیال رکھنا۔

تمہارا اسد

اس کے ذہن میں ہتھوڑے برسنے لگے۔ ”گھر واپس نہ آسکوں‘ ایکسیڈنٹ‘ اسد کی موت‘ اف خدا۔“ اسے یاد آیا کہ اسد نے اس کی اور اپنی انشورنس کروا رکھی تھی جو کہ بیس لاکھ کی تھی۔ ”تو کیا بیس اور تیس یہ ہیں وہ پچاس لاکھ۔“ پچاس لاکھ کا خیال آتے ہی وہ کچن کی طرف لپکی۔ وکیل نے حیرانی سے اس کو دیکھا۔ وہ ڈسٹ بن سے لکڑی کا بکس نکال رہی تھی۔ پھر اس نے سنگ مرمر کی سل سے وہ بکس توڑا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک چھوٹے سے کارڈ کے جس پر بڑا بڑا ”اپریل فول“ درج تھا۔ اس نے خالی بکس دیوار پر کھینچ مارا اور زور زور سے رونے لگی۔ ”کیا اسد میری بے جا اور بے لگام خواہشات کی نذر ہوا ہے؟“ یہ سوال اچانک ہی اس کے دماغ میں گونجا اور وہ لہرا کر زمین پر گری۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت زور سے بیڈ سے نیچے گری تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔ دفتر کے لیے تیار ہوتا اسد لپک کر اس کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا؟ آج پھر کوئی خواب دیکھ لیا کیا؟“ اسے اٹھا کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے اسد نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ اکثر میمونہ کو دورے پڑتے تھے وہ خواب میں ڈر جاتی تھی اور ایسا تب ہوتا تھا جب وہ کسی کہانی کو خود پر سوار کرلیتی تھی۔ ”آپ‘ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ اوہ شکر ہے یہ خواب تھا۔“ وہ بڑبڑائی۔

”کیا تم نے پھر کوئی کہانی پڑھی تھی۔“ اسد نے پیار سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں......!“ میمونہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسد نے آہ بھری۔ ”کون سی......!“

”بٹن بٹن......!!“

قرآنی عورتیں

مجاھد لکھنوی

زیرِ نظر تحریر نہ تو کوئی کہانی ہے نہ ہی خواتین کے کارناموں کا احوال یہ تذکرہ ہے۔ان پاک بی بیوں کا جن کا تذکرہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے خود قرآنِ مجید میں کیا ہے۔ہم یہ تذکرہ قارئین کی معلومات میں اضافہ کے لیے دے رہے ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے کچھ عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ان میں اکثریت انبیاء علیہم السلام کی بی بیوں کی ہے لیکن قرآنِ کریم میں کسی جگہ بھی ان عورتوں کا اپنا نام نہیں لیا گیا۔ان کے نام ہم کو تاریخوں اور تفسیروں میں ملتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ہر بی بی کا ذکر کسی مرد کے حوالے سے کیا ہے۔البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ بی بی مریم وہ واحد ہستی ہیں جن کا نہ صرف قرآنِ پاک میں نام لے کر ذکر کیا گیا ہے بلکہ آپ کے نام سے ایک پورا سورہ "سورہ مریم" بھی موجود ہے۔اس کے علاوہ بیشتر مقامات پر حضرت عیسیٰ کا نام ان کی والدہ کی نسبت کے ساتھ لیا گیا ہے یعنی عیسیٰ ابن مریم (مریم کا بیٹا عیسیٰ) کہا گیا ہے۔

دیگر بی بیوں سے ان کے مردوں کے حوالوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱)۔حضرت آدمؑ کی بی بی "حوا" کو "آدم کی زوجہ" کہا گیا (البقرہ۔الاعراف)

(۲)۔حضرت ابراہیمؑ کی بی بی "سارہ" کو "ابراہیم کی عورت" کہا گیا (ہود۔الذاریات)

(۳)۔حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بی بی "ہاجرہ" کو "ابراہیم کی ذرّیت" کہا گیا (ابراہیم)

(۴)۔حضرت لوطؑ کی بی بی "والہہ" کو "لوط کی عورت" کہا گیا (ہود۔الحجر۔التحریم)

(۵)۔حضرت نوحؑ کی بی بی "والہہ" کو "نوح کی عورت" کہا گیا (التحریم)

(۶)۔حضرت ایوبؑ کی بی بی "رحمہ" کا ذکر اشارۃً کیا گیا (ص)

(۷)۔ختم الانبیاءؐ حضرت محمدؐ کی ازواج کو اللہ نے خود "اے نبی کی عورتوں" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔اسی سورۃ میں دوسری جگہ "نبی کی بی بیاں" کہا گیا (الاحزاب)

(۸)۔حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا "موسیٰ کی ماں" کہہ کر ذکر کیا گیا (طٰہٰ)

(۹)۔فرعون کی زوجہ بی بی آسیہ کو "فرعون کی عورت" کہا گیا (التحریم۔القصص)

(۱۰)۔مصر کے بادشاہ کی بیوی "زلیخا" کو "عزیز کی عورت" کہا گیا (یوسف)

(اس بادشاہ کا اصل نام ولید بن معصب تھا۔اس زمانہ میں مصر کے ہر بادشاہ کو "عزیز مصر" کہا جاتا تھا)

حضرت بی بی حوا:۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ پوری کائنات میں چھ جاندار ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بغیر ماں اور باپ کے پیدا کیا اور انہیں کسی مادہ نے جنم نہیں دیا۔سب سے پہلے حضرت آدمؑ ہیں جن کو خدا نے اپنی قدرت سے پیدا کیا۔اسی طرح ان کی بی بی حضرت حوا کی تخلیق کی گئی۔تیسرا وہ دنبہ جو حضرت اسماعیلؑ کے بدلے ذبح ہوا۔چوتھا وہ اژدہا جو حضرت موسیٰؑ کے عصاء پھینکنے پر وجود میں آیا۔پانچویں وہ اونٹنی جس کو ناقہ صالح کہا جاتا ہے جس کو حضرت صالحؑ کی قوم کے اصرار پر اللہ تعالیٰ نے ایک پہاڑ سے پیدا کیا۔

چھٹا اور آخری ذی روح وہ پرندہ ہے (چمگادڑ) جس کو حضرت عیسیٰؑ نے اپنے ہاتھوں سے مٹی سے بنایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونک کر زندہ کیا۔

تفسیر لکھنے والوں نے حضرت حوا کی تخلیق کے بارے میں لکھا ہے کہ انہیں اس مٹی سے پیدا کیا گیا جو حضرت آدمؑ کا پتلا بنانے کے بعد بچ رہی تھی۔اسی لیے اسلام نے عورت کو مرد کے مقابلہ میں کم درجہ دیا ہے۔اگر اللہ چاہتا تو دونوں کو ایک ساتھ خلق کر سکتا تھا لیکن حضرت حوا کا کچھ عرصہ کے بعد وجود میں آنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مرد اپنی زندگی کی تکمیل کے لیے عورت کا انتظار کرے۔جب حضرت حوا کو خلق کیا گیا تو حضرت آدمؑ جنت میں سو رہے تھے۔یہ نیند اللہ کی طرف سے طاری کی گئی تھی۔حضرت حوا نے حرکت کی تو حضرت آدمؑ کی آنکھ کھل گئی۔آپ نے دیکھا کہ آپ کے پیروں کے پاس بی بی حوا بیٹھی ہیں۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے عورت کو مرد کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ورنہ اللہ تعالیٰ بی بی حوا کو حضرت آدمؑ کے سرہانے یا کسی جگہ بھی بٹھا سکتا تھا۔پھر اللہ کے حکم پر حضرت آدمؑ اٹھ کر بی بی حوا کے قریب گئے اور ان سے گفتگو کی۔اسی لیے آج تک شوہر خود زوجہ کے قریب جاتا ہے اور تعلقات کی ابتدا کرتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جنت میں رہنے کے لیے کہا اور کھلی آزادی دے دی کہ جو چاہے کھاؤ پیو البتہ ایک درخت کے قریب جانے سے منع کیا لیکن شیطان نے بی بی حوا کو ترغیب دی کہ وہ اس درخت کا پھل کھائیں۔انہوں نے حضرت آدمؑ سے ایسا کرنے کے لیے اصرار کیا اور حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کو جنت سے نکلنا پڑا اور دونوں کو زمین پر اتار دیا گیا۔

حضرت آدمؑ کو زمین کے جس حصہ پر اتارا گیا وہ ایک پہاڑ تھا اور یہ پہاڑ جس جگہ واقع ہے اس کو پہلے "سراں دیپ" کہتے تھے۔آج کل اس کو "سری لنکا" کہتے ہیں۔اس پہاڑ پر حضرت آدمؑ کے پیروں کے نشان اب تک اسی طرح باقی ہیں اور روزانہ ایک ابر کا ٹکڑا آتا ہے، بارش ہوتی ہے اور حضرت آدمؑ کے پیروں کے اس نشان پر جو کچھ خاک مٹی ہوتی ہے دھل جاتی ہے۔

پھر حضرت آدمؑ کو حکم ہوا کہ وہ مکہ کی طرف سفر کریں۔آپ زمین کے جس حصہ پر سے گزرے وہ سبزہ زار ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ آپ "کوہ صفا" پر پہنچ گئے۔ادھر بی بی حوا کو "کوہ مروہ" پر اتارا گیا تھا۔طویل عرصہ کے بعد دونوں ملے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی توبہ قبول کر لی تھی۔اس لیے نعمتوں کا نزول شروع ہو گیا۔سب سے پہلے جبرئیل جنت سے ایک شامیانہ لے کر آئے۔اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور حضرت آدمؑ سے کہا کہ آپ اپنی زوجہ کے ساتھ اس کے سائے میں قیام کریں۔یہیں سے خیموں میں رہنے کی ابتدا ہوئی جو آج بھی جاری ہے۔اللہ تعالیٰ جنت سے میوے اور پھل بھیجتا جنہیں دونوں مل کر کھاتے تھے۔کچھ بیج اور پودے حضرت آدمؑ جنت سے اپنے ہمراہ لائے تھے جنہیں بحکم خدا آپ نے زمین میں لگا دیا۔اور بیج کو مٹی میں چھپا دیا۔اس کے علاوہ خرمہ (کھجور) انار اور زیتون کے پودے بھی حضرت آدمؑ کے لیے جنت سے لائے گئے۔اس طرح زمین پر کھیتی اور باغبانی کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت حوا کے بطن سے پہلے ہابیل اس کے بعد قابیل پیدا ہوئے۔قابیل نے اپنے بڑے بھائی ہابیل کو حسد کی بنا پر قتل کر دیا پھر طویل عرصہ تک بی بی حوا کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔حضرت آدمؑ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہتے تھے کہ مجھے ایک نیک بیٹا عطا

کر جس کو میں زمین پر اپنا نائب بناؤں پھر بی بی حوا کے یہاں حضرت شیثؑ کی ولادت ہوئی۔ آپ روئے زمین پر اللہ کے بھیجے ہوئے دوسرے نبی ہیں۔ آپ ہی کی اولاد سے نسل انسانی میں اضافہ ہوا۔ حضرت آدمؑ نو سو چھتیس (۹۳۶) سال زندہ رہے اور بی بی حوا ان کے بعد ڈیڑھ سال تک زندہ رہیں۔ دونوں کو مکہ میں دفن کیا گیا۔

حضرت بی بی سارہ اور بی بی ہاجرہ:۔

بی بی سارہ حضرت ابراہیمؑ کی پہلی بیوی تھیں۔ آپ حضرت نوحؑ کی نسل میں دسویں اولاد تھے اور دونوں کے درمیان دو ہزار دو سو چالیس سال کا فاصلہ گزرا ہے۔ بی بی سارہ حضرت ابراہیمؑ کی خالہ زاد بہن تھیں اور بہت خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے اپنی ساری دولت اور مال و متاع شوہر کے حوالے کر دیا۔ ان کے پاس بہت بڑی تعداد میں بھیڑوں کا گلہ تھا (اس زمانے میں یہی سب سے بڑی دولت سمجھی جاتی تھی) حضرت ابراہیمؑ نے ان کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کی اور اس میں بڑا اضافہ ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ نے بیت المقدس جانے کے ارادے سے اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ اور بی بی سارہ کے ساتھ سفر کیا۔ جب آپ مصر کی سرزمین پر پہنچے تو کسی نے وہاں کے بادشاہ صادرف کو اطلاع کر دی کہ ایک شخص شہر میں داخل ہوا ہے جس کے ساتھ ایسی عورت ہے جو اپنے حسن و جمال میں یکتا ہے۔ یہ بادشاہ انتہائی ظالم تھا' اس نے حکم دیا کہ اس عورت کو فوراً میرے سامنے پیش کیا جائے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے بی بی سارہ کو بادشاہ کے آدمیوں کے ساتھ بھیج دیا۔ انہیں سمجھا دیا کہ اگر بادشاہ تم سے میرا رشتہ پوچھے تو یہی کہنا کہ تم میری بہن ہو جو کہ خاندان اور اسلام کے رشتہ سے سچ ہے۔ بی بی سارہ کے جانے کے بعد آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے کہ وہ بی بی سارہ کو ظالم بادشاہ کے ظلم و بری نیت سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حضرت ابراہیمؑ کی نگاہوں کے سامنے سے سارے پردے اٹھا دیئے اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے جو کچھ بادشاہ اور بی بی سارہ کے درمیان گفتگو اور واقعہ ہوا۔

بی بی سارہ بادشاہ کے محل میں پہنچیں تو فوراً وضو کر کے نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے اپنی عزت و ناموس کے تحفظ کی دعا کرنے لگیں۔ اسی دوران بادشاہ آ گیا اور آپ کی طرف بڑھا۔ فوراً ہی اس پر مرگی کا دورہ پڑا اور وہ خاک پر گر کر تڑپنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی پاک دامن بی بی ہے۔ اس لیے معذرت کرنے لگا اور بی بی سارہ سے کہا کہ آپ میرے لیے دعا کریں' میں آپ سے کچھ نہ کہوں گا۔ بی بی سارہ نے اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دعا کی اور وہ تندرست ہو گیا لیکن فوراً ہی شیطان نے غلبہ کیا اور وہ پھر آپ کی طرف بڑھا اور پھر اس کی وہی حالت ہو گئی۔ اسی طرح تین بار ہوا۔ آخری بار وہ اپنے ارادے سے باز آیا اور بی بی سارہ کو بحفاظت حضرت ابراہیمؑ کے پاس واپس بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی ایک کنیز بھی بی بی سارہ کو بطور تحفہ دی۔

دوسری روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ' بادشاہ کی طلبی پر خود بی بی سارہ کو لے کر بادشاہ کے سامنے گئے۔ بادشاہ نے سوال کیا کہ یہ عورت تمہاری کون ہے؟ آپ نے جواب میں صاف کہہ دیا کہ یہ میری خالہ کی بیٹی ہے پھر جیسے ہی بادشاہ نے بی بی سارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ خشک ہو گیا۔ وہ اس بات سے خوف زدہ ہو گیا اور حضرت ابراہیمؑ سے گڑگڑا کر کہنے لگا کہ آپ میرے لیے دعا کریں' میں آپ کی بزرگی تسلیم کرتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی اور اس کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ بادشاہ نے شکرانے کے طور پر اپنی بیٹی ہاجرہ کو محل سے بلوا کر آپ کے ساتھ کر دیا اور کہا کہ یہ آپ کی بہن کی خدمت کرے گی۔

حضرت ابراہیمؑ کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو گئی تھی مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دونوں میاں بیوی اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ ادھر بی بی سارہ بھی اپنی عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اب اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکی تھیں۔ ایک دن انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ میں اپنی کنیز ہاجرہ کو آپ کے سپرد کرتی ہوں۔ آپ اس سے نکاح کر لیں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس کے وسیلے سے آپ کو اولاد عطا کر دے اور آپ کی نسل قطع ہونے سے بچ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے بی بی ہاجرہ کو حضرت اسماعیلؑ کی شکل میں ایک بیٹا عطا فرمایا۔

لیکن اس کے بعد بی بی سارہ کا احساسِ محرومی اور بھی بڑھ گیا۔ وہ گھر میں بی بی ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو دیکھ کر اور بھی کڑھنے لگیں۔ آخر انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہہ دیا کہ آپ ان دونوں ماں بیٹے کو کسی دوسری جگہ پہنچا دیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ میری لونڈی تو اولاد والی ہو اور میں بانجھ بنی بیٹھی رہوں۔

ادھر حضرت ابراہیمؑ کے پاس اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو زمینِ مکہ پر پہنچا دو۔ اس وقت حضرت اسماعیلؑ شیر خوار تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بی بی ہاجرہ کو سفر کا حکم دیا اور آپ بغیر یہ پوچھے کہ کہاں اور کتنے عرصہ کے لیے جانا ہے یا اس ننھے سے بچہ کو لے کر سفر کی مشکلات کس طرح برداشت ہوں گی' فوراً روانگی کے لیے تیار ہو گئیں۔ حضرت ابراہیمؑ حکم خدا کے مطابق دونوں کو لے کر مکہ پہنچے اور ریگستان میں جہاں نہ آبادی تھی نہ کھانے پینے کی کوئی چیز' نہ آس پاس کوئی دوسرا انسان نظر آتا تھا' دونوں کو بٹھا دیا۔ ایک پانی کی مشک اور کچھ کھانے کی چیزیں ان کے قریب رکھ دیں اور واپس چلے گئے۔ جاتے ہوئے آپ نے دعا فرمائی۔

''اے پروردگار! میں نے اپنی کچھ ذریت کو یہاں بغیر کھیتی والی زمین پر تیرے حرمت والے گھر کے زیر سایہ بسا دیا ہے۔ تو ان کی طرف لوگوں کے دلوں کو موڑ دے۔''

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ وہ پانی جو حضرت ابراہیمؑ مشکیزے میں رکھ گئے تھے ختم ہو گیا اور بچہ پیاس کے مارے تڑپنے لگا۔ بی بی ہاجرہ اٹھ کر گئیں اور ادھر ادھر پانی تلاش کرنے لگیں۔ اسی کوشش میں انہوں نے ''صفا اور مروہ'' دو پہاڑوں کے درمیان سات چکر لگائے لیکن پانی کہیں نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر واپس آئیں تو دیکھا کہ بچے کے پیروں کے پاس پانی کا ایک چشمہ ابل رہا تھا۔ بی بی ہاجرہ نے فوراً آواز دی۔ ''ذی ذی'' (ٹھہر جا' ٹھہر جا)

بی بی ہاجرہ کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے حاجیوں کے لیے واجب قرار دیا۔ ہر حاجی ''صفا'' اور ''مروہ'' کے درمیان سات چکر لگاتا ہے جسے ''سعی'' کہتے ہیں۔

حدیث میں ہے۔ ''اللہ اسماعیلؑ کی ماں پر رحم کرے اگر وہ یہ صدا نہ دیتیں تو زم زم اپنی جگہ قائم نہ رہتا بلکہ جاری چشمہ ہو جاتا۔''

بی بی ہاجرہ کے انہی الفاظ کی بنا پر اس چشمہ کا نام ''زم زم'' پڑا اور آج تک اپنی جگہ قائم ہے جس سے حجاجِ کرام خود بھی فیضیاب ہوتے ہیں اور انہی کے وسیلے سے اس چشمہ کا پانی دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اپنی بی بی سارہ کے ساتھ شام میں رہتے تھے لیکن بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کی خیریت اور خبر گیری کے لیے مکہ آتے رہتے تھے پھر آپ نے خواب میں حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اس پر عمل کیا لیکن بی بی ہاجرہ سے کچھ ذکر نہیں کیا کہ کہیں ماں کی محبت آپ کے ارادے میں حائل نہ ہو جائے پھر جب حضرت اسماعیلؑ کی جان بچ گئی تو آپ نے سارا واقعہ بی بی ہاجرہ سے بیان کر دیا۔ بی بی ہاجرہ نے بیٹے کی گردن پر چھری کا نشان دیکھا تو بہت صدمہ ہوا اور سوچا کہ اگر دنبہ نہ آتا تو میرا بچہ ذبح ہو جاتا۔ اسی غم میں بیمار ہوئیں اور پھر انتقال فرما گئیں۔

یہ محض ماں کا دل اور انسانی فطرت تھی ورنہ جب حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے لیے لے کر چلے گئے اس وقت شیطان ایک انسان کی شکل میں بی بی ہاجرہ کے پاس آیا اور ساری بات بتا کر انہیں بہکانے کی کوشش کی تو بی بی ہاجرہ نے اسے جواب دیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو یہ حکم دیا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں صبر کروں گی۔ پھر اسے دھتکارتے ہوئے کہا تھا کہ تو ضرور شیطان ہے اور مجھے اللہ اور میرے شوہر کی طرف سے شک میں مبتلا کرنے کے لیے آیا ہے۔ جا چلا جا میرے سامنے سے دور ہو جا۔

بی بی ہاجرہ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کا نکاح بنی جرہم کی ایک لڑکی رملہ سے کیا تھا یہ وہی لوگ تھے جو زم زم کے جاری ہونے کے بعد سب سے پہلے مکہ کی سرزمین پر پہنچے اور چشمہ دیکھ کر اسی جگہ بس گئے۔ انہوں نے بی بی ہاجرہ سے یہ کہہ کر اجازت طلب کی کہ "تو ہم کو اپنے پانی میں شریک کر لے، ہم تجھے اپنے دودھ میں شریک کر لیں گے۔"

حضرت اسمٰعیلؑ کی شادی کے بعد بی بی ہاجرہ کا انتقال ہو گیا اور آپ کو "حجر" کے مقام پر دفن کر دیا گیا۔ آپ کی عمر کے متعلق مورخین نے کوئی تفصیل نہیں لکھی۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ بی بی سارہ حضرت ابراہیم کی سگی خالہ زاد بہن تھیں اور حضرت لوطؑ بی بی سارہ کے سگے بھائی تھے لیکن بعض کتابوں میں حضرت لوطؑ کو حضرت ابراہیمؑ کا بھتیجا لکھا گیا ہے۔ جبکہ کچھ مورخین نے دونوں کے درمیان چچازاد اور خالہ زاد دونوں رشتے لکھے ہیں۔ دراصل یہ غلطی ترجمہ کرنے والوں کی ہے جس کے باعث مختلف باتیں لکھ دی گئیں۔ جس طرح کہ انگریزی زبان میں چچا، ماموں، خالو وغیرہ کے لیے "انکل" اور ان کی اولادوں کے لیے "کزن" استعمال ہوتا ہے اسی طرح عربی زبان میں "انکل" کی جگہ "عم" اور "کزن" کے لیے "ابن عم" اور "بنت عم" لکھا جاتا ہے۔ بہرحال یہ بات صحیح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ دونوں ایک دادا کی اولاد تھے۔ حضرت لوطؑ سے جو سلسلہ نسب حضرت ابراہیمؑ تک ملتا ہے اس میں دونوں کے دادا کا نام "ناحور" لکھا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت لوطؑ اور بی بی سارہ حضرت ابراہیمؑ کے چچا زاد ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح تقریباً تمام تاریخوں میں بی بی سارہ کو حضرت ابراہیمؑ کی خالہ زاد بہن ہی لکھا گیا ہے۔ اس طرح چچازاد اور خالہ زاد دونوں ہی رشتے بہ یک وقت ممکن ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کو ایک ہی وقت میں ہدایت اور تبلیغ دین کے لیے بھیجا گیا، جب حضرت ابراہیمؑ نے قحط کی وجہ سے بابل کے علاقہ سے ہجرت کی تو حضرت لوطؑ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے شامات کے مقام پر قیام کیا اور حضرت لوطؑ کو چونتیس میل کے فاصلے پر واقع ایک آبادی میں تبلیغ کے لیے بھیجا۔

اس وقت حضرت اسماعیلؑ کی ولادت کو تیرہ سال گزر چکے تھے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کے پاس چار آدمی آئے۔ انہوں نے آپ پر سلام بھیجا اور آپ نے بھی ان کو سلام کا جواب دیا پھر آپ اٹھ کر اپنی بی بی سارہ کے پاس آئے اور مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی پھر کہا کہ کھانے کا کچھ انتظام کرو۔ بی بی سارہ لاولد تھیں اس لیے انہوں نے ایک بچھڑا پال رکھا تھا اور اسی سے اپنا دل بہلاتی تھیں۔ شوہر کی مایوسی دیکھ کر انہوں نے فوراً کہا کہ آپ اس بچھڑے کو ذبح کر لیں۔ ہم اس کا گوشت بھون کر مہمانوں کو کھلا دیں گے۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا اور بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لا کر مہمانوں کے سامنے رکھ دیا لیکن انہوں نے کھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ حضرت ابراہیمؑ کو افسوس ہوا، اس زمانے میں یہ دشمنی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ آپ اٹھ کر آئے اور بی بی سارہ سے یہ بات بیان کی کہ مہمان ہمارا کھانا نہیں کھا رہے ہیں۔ بی بی سارہ نے بھی ان سے اصرار کیا تب انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہم اللہ کے بھیجے ہوئے چاروں فرشتے ہیں اور ہم قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ ہم یہاں آپ کو اللہ کی طرف سے بشارت دینے کے لیے آئے ہیں کہ آپ کی بی بی (سارہ) سے ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ اس کا نام اسحاق ہوگا۔ یہ سن کر بی بی سارہ ہنس پڑیں اور اپنا ہاتھ اپنے منہ پر مار کر کہا۔ "ہائے اب جبکہ میں اور میرا شوہر بوڑھے ہو چکے ہیں، میں بچہ پیدا کروں گی۔"

بی بی سارہ کی اس بات کا جبرائیلؑ نے جو جواب دیا وہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

......☆☆☆......

"تم خدا کی قدرت میں تعجب کرتی ہو۔ اے اہلِ

سنت نبوت تم پر تو اللہ کی رحمت اور برکت نازل ہوتی ہی رہی ہے۔ بے شک وہ لائقِ حمد مجد ہے۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس بشارت کے مطابق بی بی سارہ کے یہاں حضرت اسحاقؑ کی ولادت ہوئی جبکہ اس ولادت کے وقت ان کی عمر نوے (۹۰) سال ہو چکی تھی اور اللہ کی مقرر کی ہوئی وہ تمام نشانیاں جو ایک عورت کو ماں بننے کے قابل بناتی ہیں مٹ چکی تھیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ بھی ایک سو اکیس (۱۲۱) سال کے ہو چکے تھے لیکن آپ کے چہرے اور قد و قامت سے بڑھاپا ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ تھا کہ آپ ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال تک جوان نظر آتے رہے۔ پھر بھی مشرکوں اور کافروں نے یہی طعنہ دیا کہ اس بڑھاپے میں بچہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں یہ لڑکا (حضرت اسحاقؑ) کہیں سے اٹھا لائے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بات اور ہر کام کے لیے اصول اور قاعدے بنا دیئے ہیں انہی کے مطابق اس دنیا کا سارا نظام قائم ہے لیکن یہ ہماری گمراہی ہے کہ ہم اس نظام اور اس کے اصولوں کو تو یاد رکھتے ہیں مگر اس کو بھول جاتے ہیں جو اس پورے کارخانہ قدرت کا مالک اور چلانے والا ہے۔ جو بات بھی ظاہر ہوتی ہے ہم اس کو مادی اصولوں پر پرکھتے اور جانچتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس نے یہ تمام اصول وضع کیے ہیں وہ چاہے تو انہیں توڑ بھی سکتا ہے۔

کلام پاک میں ایسے لاتعداد واقعات موجود ہیں۔ حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کا بغیر ماں اور باپ کے وجود میں آنا اور نوے (۹۰) سال کی عمر میں بی بی سارہ کے یہاں حضرت اسحاقؑ کی ولادت کے بارے میں آپ نے اس مضمون میں پڑھا۔ ایسے ہی حیرت و تعجب والے واقعات مصر کے بادشاہ کی بیوی زلیخا کا بوڑھی ہو جانے کے بعد دوبارہ جوان ہو کر کنواری لڑکی بن جانا اور حضرت مریمؑ کا کنواری ہونے کے باوجود بغیر کسی مرد کی قربت کے ماں بن جانا ہیں۔ یہ واقعات اللہ کے وجود اور اس کے قادر مطلق ہونے کا ثبوت ہیں اور ان واقعات پر یقین کرنا ہی اللہ اور اس کے کلام پر ایمان لانے کی دلیل ہے۔

تاریخ لکھنے والوں نے حضرت ابراہیمؑ کی دو اور بی بیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ایک کا نام قطورہ تھا جو کنعانیوں کے خاندان سے تھیں۔ ان سے حضرت ابراہیم کے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ دوسری کا نام حجورہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے سات بچوں کی ماں تھیں لیکن ان بی بیوں اور ان کے بچوں کی مزید تفصیل اور واقعات نہیں ملتے۔

بی بی سارہ کا ایک سو ستائیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ نے انہیں دفن کرنے کے لیے حبرون میں زمین کا ایک ٹکڑا خریدا جو کہ بیت المقدس کے قریب ہے۔ اس مقام کو اب "الخلیل" کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کو مورخین نے اس طرح لکھا ہے کہ جب بی بی سارہ کا انتقال ہوا تو حضرت ابراہیمؑ قبر کے لیے زمین کی تلاش میں نکلے اور حبرون کے مالک عفرون کے پاس جا کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اجازت دے دی کہ آپ جہاں چاہیں اپنی بی بی کو دفن کر دیں مگر حضرت ابراہیمؑ نے قیمت ادا کرنے پر اصرار کیا۔ عفرون نے کہا کہ میں چار ہزار درہم (اس زمانے کا سکہ) قیمت لوں گا مگر شرط یہ ہے کہ ہر درہم پانچ درہم کے برابر ہو اور ہر سکہ پر کسی بادشاہ کی مہر ہو۔ عفرون نے یہ شرطیں اس لیے رکھی تھیں کہ حضرت ابراہیمؑ قیمت ادا نہ کریں کیونکہ یہ بہت بڑی رقم بنتی تھی جسے آپ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ مایوس ہو کر واپس چلے آئے۔ اس وقت جبرائیلؑ تشریف لائے اور عفرون کی شرطوں کے مطابق مطلوبہ رقم آپ کے حوالے کر دی۔ حضرت ابراہیمؑ نے بی بی سارہ کو اس مقام پر دفن کر دیا۔ یہ پہلی قبر تھی جو حبرون میں بنائی گئی۔ دوسری قبر خود حضرت ابراہیمؑ کی تھی جو بی بی سارہ کی قبر کی مغربی سمت بنائی گئی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ اسی زمین میں جو حضرت ابراہیمؑ نے خریدی تھی حضرت اسحاقؑ، ان کی بی بی رفقہ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی بی بی لائقہ یا الیا بھی دفن ہیں۔ حضرت یعقوب کے بیٹوں نے اس قبرستان کے چاروں طرف چار دیواری بنا دی تھی اور ہر قبر پر ایک مخصوص نشان کے ساتھ وہاں دفن ہونے والے کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ پھر رومیوں نے اس مقام پر قبضہ کر لیا اور ان کی حکومت کے دوران تمام نشانات مٹ گئے۔

تاریخ کے مطابق ۵۱۳ھ میں بیت المقدس کے قریب یہ قبریں دوبارہ ظاہر ہوئیں۔ محمد ابنِ ابی بکر ابن محمد خطیبِ مسجد الخلیل بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک نقش دیکھا جو رفقہ زوجہ حضرت اسحاقؑ کی قبر کے سامنے ہے۔ انہوں نے پہلے اس کتبہ کو خوب دھو دھو کر صاف کیا اور وہ تمام تحریر ایک کاغذ پر جوں کی توں اتار لی۔ پھر انہوں نے مختلف زبانوں کے جاننے والوں کو بلا کر اسے پڑھنے کے لیے کہا مگر سب نے معذوری ظاہر کی ان لوگوں نے ایک بوڑھے کا پتہ بتایا جو حلب میں رہتا تھا۔ اس بوڑھے کو بلوایا گیا اور اس نے پڑھ کر جو کچھ سنایا اس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔ یہ تحریر قدیم یونانی زبان میں تھی۔

"میرے پروردگار کے نام سے جو عرش کا خدا ہے، قہر والا، ہدایت دینے والا، سخت گرفت کرنے والا اور جاننے والا ہے اس کی حمد نہیں کی جا سکتی۔ یہ قبر ابراہیم خلیل کی ہے اور وہ ستون جو مشرق کی جانب میں سامنے ہے۔ وہ آپ کی بی بی سارہ کی قبر ہے۔ دوسرا ستون جو ابراہیم کی قبر کے سامنے ہے یعقوب کی قبر ہے اور مشرقی جانب والا ستون ان کی بیوی الیا کا ہے۔

ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر، معمار القدسی نے اپنی کتاب 'البدائع' میں لکھا ہے کہ حبری (حبرون) ابراہیم الخلیل کے گاؤں کا نام ہے۔ اس میں ایک بڑا قلعہ ہے، کہتے ہیں کہ اسے جنوں نے حضرت سلیمان پیغمبر کے حکم سے تعمیر کیا تھا۔ اس کے پتھر منقوش ہیں۔ بیچ میں جو پتھر لگے ہیں وہ اسلامی دور کی یادگار ہیں۔ آگے اسحاقؑ کی قبر ہے اور حضرت یعقوب کی قبر پیچھے ہے۔ ہر نبی کے سامنے اس کی بیوی کی قبر ہے۔ پھر اس قلعہ کو مسجد بنا دیا گیا اور اس کے اردگرد مجاوروں کے لیے مکانات بنا دیئے گئے۔ یہاں پانی کی ایک سوت نکلتی ہے اور اس گاؤں سے نصف منزل تک انگور اور سیب وغیرہ کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اس گاؤں میں ہمیشہ مہمانی رہتی ہے۔ کھانا، روٹی اور خدام ہر ایک کے لیے عام (بلا قیمت) ملتے ہیں۔ عام طور پر ہزاروں فقیر و مسکین روزانہ کھانا کھاتے ہیں۔ اگر کوئی امیر دولت مند تبرکاً یہ کھانا لینا چاہے تو وہ بھی لے سکتا ہے۔

درج بالا تحریر دو سو برس قبل کی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔ اب بیت المقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے بعد اللہ جانے انبیاءؑ کے ان مزارات اور ان سے متعلق فیض و برکات پر کیا اثر ہوا۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ یہودیوں کو اپنے ارادوں میں ناکام بنا دے اور اہلِ اسلام کو قبلۂ اول اور مزاراتِ انبیاءؑ کی زیارت و فاتحہ کا شرف حاصل ہو۔ (آمین)

□

قسط نمبر 7

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

محبت کی روایتی تکون سے شروع ہونے والی یہ خونی داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے کہانی سے جڑے کرداروں کو کسی عفریت کی طرح نگلتی جاتی ہے۔ اس میں کرپٹ سیاست دانوں کی نقاب کشائی نہایت مہارت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کیسے وہ وطن عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کہلانے والے مجبور و مقہور طبقے کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ گفتار کے یہ غازی کیسے عوام کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت و جان اور مال و متاع کے سودے وطن دشمنوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ان کے وعدے پانی پر کھینچی گئی لکیر کی طرح نا پائیدار ہوتے ہیں۔

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لیے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

مجھے میرے خیالات کے بھنور سے سیل فون کی بیل نے نکالا۔ میں نے موبائل کی روشن اسکرین پر نگاہ ڈالی تو اس پر عشاء کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس بات کو محسوس کر کے کہ عشاء کو مجھ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے چند بیلوں کے بعد آنسر کا بٹن پش کیا اور کان سے فون لگا کر کہا۔

''جی عشاء کہیے......!''

''حیرت ہے آپ کو میرا نام اور نمبر دونوں یاد ہیں۔'' دوسری جانب سے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔

''میرا خیال ہے اس میں اتنا حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ شاید میری میموری اب اتنی بری بھی نہیں ہے کہ چند گھنٹوں قبل کی بات بھی بھول جاؤں۔'' میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

''خیر مجھے اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں اس وقت امی سے چھپ کر آپ کو فون کر رہی ہوں۔'' وہ تڑخنے سے لہجے میں بول رہی تھی۔

''زہے نصیب!'' میں نے اس کی بات کے درمیان میں ٹوکا۔

''کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر!'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ اپنے بارے میں بالکل سچ بتائیں کہ آپ ہیں کون اور آپ نے اپنے آپ کو بھائی جان کا دوست ظاہر کر کے اتنی بڑی رقم کس لیے ہمیں دی ہے۔ مجھے اس بات کا سو فیصد یقین ہے کہ آپ بھائی جان کے دوست نہیں ہیں۔

"کیونکہ میری اور بھائی جان کی اتنی زیادہ انڈر اسٹینڈنگ تھی کہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ایک دوسرے کو معلوم ہوتی تھی اور عماد نام کا کوئی بھی شخص عمر کے کسی بھی حصے میں ان کا دوست نہیں رہا۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ تو میں فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔

"بولیں اب آپ بولتے کیوں نہیں، مسٹر آپ نے امی کو تو بے وقوف بنالیا۔ مگر میں آپ کی اس جھوٹی کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ حقیقت کیا ہے۔ وہ آپ کو بتانا پڑے گی۔ آپ بھائی کو کس طرح جانتے ہیں اور یہ رقم کیوں لائے ہیں۔" اس نے گزشتہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ اپنا غصہ ختم کر کے میری بات سنیں گی تو بہتر ہوگا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آئی ایم سوری!" اس نے دھیرے سے کہا۔

"آپ کہیے میں سن رہی ہوں۔"

"میں آپ کو بتانا تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن آپ کی سمجھداری اور ہمت کو دیکھتے ہوئے میں یہ اہم بات آپ کو بتا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کا توقف کیا وہ اس دوران خاموش رہی۔

"آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا ہے میں آپ کے بھائی کا دیرینہ دوست نہیں ہوں۔ بس ذرا دیر کے لیے میری ان سے شناسائی ہوئی تھی وہ بھی ٹرین میں۔" میں پھر خاموش ہوگیا تب وہ بے قرار لہجے میں بولی۔

"آگے بتائیں آپ چپ کیوں ہوگئے۔"

"جس وقت حادثہ ہوا میں اور وہ ساتھ ہی تھے حادثے میں آپ کے بھائی......!" میں پھر خاموش ہوگیا۔

"ہاں کیا ہوا حادثے میں......!" وہ ایک دم چیخ اٹھی۔

"وہ بہت زیادہ زخمی ہوگئے تھے...... سر کی چوٹ بہت گہری تھی سارا چہرہ کچلا گیا تھا پہچانا نہیں جارہا تھا۔ آخری لمحات میں انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر صرف اتنا کہا۔ 'میری ماں اور بہن کا خیال رکھنا۔'"

"نہیں، نہیں آپ اب بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا کہ وہ جیل میں ہیں ان پر قتل کا الزام ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ کیا ملے گا آپ کو ہمارے جذبات کے ساتھ کھیل کر۔" وہ بری طرح بکھر گئی بلک بلک کر رونے لگی۔

"پلیز، پلیز عشاء میری بات سنو۔ میں تمہیں اتنے بڑے دکھ کی خبر کبھی نہ دیتا۔ اگر تم میرے خلوص پر شک نہ کرتیں۔ پلیز اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ صدمہ تمہارے لیے تنہا اٹھانا آسان نہیں ہے لیکن اگر مناسب سمجھو تو ابھی اپنی امی کو یہ روح فرسا خبر نہ سنانا۔ وہ برداشت نہیں کرسکیں گی۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا۔

"لیکن امی بھائی کے جیل جانے کی خبر سن کر بھی تو مری گئی ہیں۔ اف میرے اللہ میں کیا کروں؟"

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کس طرح سے سمجھاؤں۔ کن الفاظ میں تسلیاں دوں۔ پھر اچانک ہی اس نے فون بند کردیا۔ میرے اندر ایک عجیب سی بے قراری پیدا ہوگئی۔ میرا دل شدت کے ساتھ چاہا کہ ابھی اڑ کر عشاء کے پاس پہنچ جاؤں۔ اس کے خوب صورت بالوں سے بھرے سر کو اپنے سینے پر رکھ لوں۔ اسے ساری دنیا کے غموں سے دور لے جاؤں۔

میں اپنے اوپر حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کے خیالات اور احساسات میرے اندر پیدا ہو رہے ہیں۔ میں اور میرا دل تو پتھر کا بن چکا ہے۔ اس میں محبت جیسے لطیف جذبے کا گزر کیسے ہوسکتا ہے لیکن میرے دل پر یہ واردات ہوچکی تھی۔ میں رات بھر عشاء کے لیے بے چین رہا۔ سوچ رہا تھا کہ کل کسی وقت اس کے گھر جاؤں اور جا کر دیکھوں کہ کیا صورت حال ہے۔ اگر اس نے اپنی امی کو یہ خبر سنادی ہے تو ان کا کیا حال ہے اور اگر وہ تنہا اس غم کو اٹھا رہی ہے تو وہ کیسی ہے۔

لیکن پھر خیال آیا کہ میں وہاں کیسے جاسکتا ہوں۔ وہ نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔ میں نے اتنی جلدی جلدی اپنے بیانات کیوں بدل دیے۔ ابھی اس نے میرے اوپر اعتبار کہاں کیا ہوگا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح میرے سیل فون کی بیل بجی اور ایک ان جانا نمبر دکھائی دیا۔ میں نے تھوڑے تذبذب کے بعد فون ریسیو کیا اور بھاری لہجے میں "لیس" کہا۔

"شمروز بول رہے ہو؟" دوسری جانب سے مجھے باس کی آواز سنائی دی۔

"جی باس میں شمروز بول رہا ہوں۔" میں نے الرٹ ہو کر اپنا لہجہ نارمل بناتے ہوئے کہا۔

"تم آج کیا کر رہے ہو؟" اس نے نارمل انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں فارغ ہی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تو تم میری کلفٹن والی کوٹھی پر پہنچ جاؤ یاد ہے ناں ہماری پہلی ملاقات جہاں ہوئی تھی۔"

"جی باس یاد ہے۔ اب تو میں کراچی کے چپے چپے سے واقف ہوچکا ہوں۔ آپ بتائیے کتنے بجے پہنچ جاؤں۔" میں نے حد سے زیادہ مؤدب لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"بس تم فوراً نکل آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں اور ہاں یہ میرا خاص نمبر ہے۔ جس سے میں نے ابھی تمہیں فون کیا ہے اسے Save کرلو لیکن صرف اپنے ذہن میں۔ موبائل پر Save کرنے کی غلطی مت کرنا۔" اس نے کہا۔

"جی باس اس بات کا شعور ہے مجھے!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اوہ، تم تو ناراض ہوگئے۔" اس نے میرے لہجے میں چھپی معمولی سی خفگی کو محسوس کرلیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم ایک پڑھے لکھے ذہین انسان ہو، بائی دی وے تم آؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے بات ختم کر کے فون بند کردیا اور میں سوچنے لگا کہ اچانک آغا قزلباش کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔

میں ناشتے سے فارغ ہو کر جھٹ پٹ تیار ہوا۔ باہر آیا تو کنیز بھی اٹھ چکی تھی۔ چہرے سے وہ تھکی تھکی سی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھیں بھی ہلکی سرخی لیے متورم ہو رہی تھیں۔

"گڈ مارننگ!" مجھے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کل سارا دن غائب رہیں رات کو کس وقت واپس آئیں مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" میں نے کہا۔

"ہاں باس کے ایک کام میں مصروف تھی تم سناؤ کہیں جارہے ہو۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں اپنے آپ کو لاؤنج میں موجود صوفے پر گراتے ہوئے میری بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"ہاں، باس نے بلایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ان کا فون آیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے جاؤ، اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔" اس نے کہا اور اکرم کو آواز دے کر اپنے لیے چائے لانے کے لیے کہا۔

میں اسے اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل آیا، سیڑھیاں

اترتے ہوئے میں کنیز کے الفاظ پر غور کرنے لگا کہ اس نے یہ کیوں کہا کہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔" تیزی سے سیڑھیاں اتر کر میں نیچے پہنچا تو مجھے وہی شخص دوبارہ دکھائی دیا جو کل میرا تعاقب کر رہا تھا مجھے دیکھا تو میرے نزدیک آیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ ہمیشہ سیڑھیاں ہی کیوں استعمال کرتے ہیں۔ لفٹ کیوں نہیں۔"

"تمہیں کوئی پریشانی ہے کیا؟" میں نے ناگوار لہجے میں کہا اور کار کا دروازہ کھولنے کے لیے جیب سے چابی نکالنے لگا۔

"نہیں تو بس یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ ویسے میرا نام یعقوب ہے اور سب مجھے قوبا کہہ کر پکارتے ہیں۔" اس نے برا مانے بغیر اپنا تعارف کرایا۔

"ویسے یار قوبے تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔" میں نے چابی کی نوک اس کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم آئندہ سے کسی کا تعاقب مت کرنا کیونکہ تمہیں یہ کام آتا ہی نہیں۔ یہ کام تو کسی ہوشیار آدمی کو کرنا چاہیے اور تم ٹھہرے احمق انسان......!"

"تو آپ نے کل مجھے دیکھ لیا تھا۔" اس نے کھسیا کر دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" میں نے جھک کر چابی کی ہول میں ڈالتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ پھر دروازہ بند کر کے اس سے کہا۔

"میں اس وقت باس کے پاس جا رہا ہوں اور ان سے تمہاری اس خراب کارکردگی کا ذکر ضرور کروں گا۔"

"نہیں، نہیں شمروز بھائی اللہ کے واسطے باس سے میری شکایت مت کیجیے گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ باس نے چھٹی کر دی تو میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"یار کیوں اپنے بچوں کو حرام رزق کھلا کر ان پر ظلم کر رہے ہو۔ کوئی اور کام کرو اور اپنے بچوں کو رزق حلال کھلاؤ۔ اگر ان سے محبت کرتے ہو۔" میں نے اتنا کہہ کر اگنیشن میں چابی گھما کر کار اسٹارٹ کر دی۔

"کام کہاں ملتا ہے مجھ جیسے ان پڑھ اور جاہل انسان کو۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"اچھا تم سے پھر بات ہوگی۔ اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔" میں نے کہا اور کار ریورس کرنے لگا۔

"باس سے میری شکایت مت کیجیے گا۔" چلتے چلتے مجھے اس کی التجا سنائی دی تو میں نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اسے تسلی کا اشارہ کیا جواب میں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اوپر کیا شاید اس انداز سے میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

میں بہت تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ پہلے کبھی میں اتنی فاسٹ ڈرائیونگ نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ بہت محتاط ڈرائیونگ کرتا تھا۔ مگر جب سے میں نے اپنی شخصیت کو بدلا تھا۔ میرا مزاج میری ہر عادت بدل گئی تھی۔ میرے اندر ہر وقت ایک غصہ سا بھرا رہتا تھا اور ہر کام کرتے ہوئے میں اپنا غصہ اس پر نکالنے لگتا تھا۔

میں بیس پچیس منٹ میں کلفٹن آغا قزلباش کے وسیع و عریض کوٹھی پر پہنچ گیا۔ گارڈ نے میرا نام پوچھنے کے بعد میرے لیے گیٹ کھول دیا اور میں گاڑی سمیت اندر پہنچ گیا۔

ایک دوسرا گارڈ جو مجھے وہاں کھڑا ہوا ملا وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا لیکن اندر لے جانے سے پہلے اس نے میری تلاشی لینا ضروری سمجھا میرے پاس ایک ریوالور تھا۔ جسے اس نے معذرت کرنے کے بعد اپنے قبضے میں لے لیا یہ کہتے ہوئے کہ واپسی

پر جاتے ہوئے لے جایئے گا۔

مجھے اس بات پر قطعی حیرت نہیں ہوئی اور نہ ہی مجھے برا لگا کیونکہ ایسا کرنا احتیاط کا تقاضا تھا۔

گارڈ نے دروازے پر پہنچ کر میرے لیے دروازہ کھولا اور خود باہر کھڑا رہا۔ میں اندر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو باس کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ باس کے ساتھ ایک بہت ہی وضع دار انسان جس کی عمر پچاس، پچپن کے قریب تھی۔ سفید کلف دار کرتے اور پاجامے میں ملبوس، سفید ہی کلف لگی ٹوپی سر پر تھی، سفید چھوٹی سی داڑھی اور سرخ و سفید رنگت وہ پان سے شغل فرما رہے تھے۔ گویا ایک ہی نگاہ میں ان کی شخصیت دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پہلا خیال انہیں دیکھتے ہی مجھے جو آیا وہ کسی نواب کا تھا۔ میں رک کر بڑی دلچسپی سے ان کا جائزہ لے رہا تھا کہ باس کی آواز سنائی دی۔

"آؤ بھئی شمروز ان سے ملو یہ ہیں نواب سطوت الاسلام!"

"السلام علیکم!" میں چونک کر آگے بڑھا اور قدرے جھک کر ان سے ہاتھ ملایا۔

گویا میرا خیال بالکل ٹھیک تھا وہ واقعی کوئی نواب ہی تھے۔ مگر آغا قزلباش جیسے شخص کے ساتھ انہیں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

میں نے نواب صاحب کے بعد باس سے ہاتھ ملایا اور باس ہی کے کہنے پر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ پہلے تو دونوں مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ نواب صاحب اپنے پرکھوں کے قصے سنا رہے تھے۔ ان کے نوابی ٹھاٹ بیان کر رہے تھے۔ باتوں کے دوران وہ کبھی اپنی چاندی کی پانوں کی ڈبیا سے پان نکال کر منہ میں رکھ لیتے۔ کبھی بٹوہ کھول کر ایک آدھ چھالیہ کا دانہ منہ میں رکھ لیتے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو اتنی نفاست سے پان کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مسلسل بول رہے تھے مگر مجال ہے جو ایک چھینٹ بھی ان کے منہ سے اڑی ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آغا قزلباش نے مجھے کس لیے یہاں بلوایا ہے اس نواب زادے سے ملنے کے لیے لیکن کیوں......؟ آخر اس ملاقات کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوال مسلسل میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ تب ہی نواب صاحب نے کہا۔

"اچھا تو یہ شمروز خان ہیں۔ تم نے ان ہی کی ذہانت کی ہم سے اتنی تعریف کی تھی۔ تو بھئی اب ان کے سامنے وہ مقصد رکھو جس مقصد کے لیے انہیں یہاں بلوایا گیا ہے۔"

"جی نواب صاحب......!" آغا قزلباش نے مسکراتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔ جتنی دیر ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اتنی دیر میں ہم چائے اور دوسرے لوازمات سے فارغ ہو چکے تھے۔ ملازمہ چائے کے سامان کی ٹرالی واپس لے جا چکی تھی اور جاتے ہوئے ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی بند کر چکی تھی اور اب نواب صاحب اصل مقصد کی جانب آئے تھے۔

"شمروز نواب صاحب ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔ یوں سمجھو کہ زندگی کے بہت سے معاملات میں ہم ان کے احسان مند ہیں۔ نواب صاحب کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ صدر اور وزیراعظم تک پہنچ ہے۔ مگر خوددار اتنے ہیں کہ کبھی بھی اپنے کسی کام کے لیے اپنے تعلق کو استعمال نہیں کیا۔ بس ہمارے پاس ہی آتے ہیں۔ مجھے اپنا چھوٹا بھائی ہی تصور کرتے ہیں۔ آج نواب صاحب اگر کسی پریشانی میں مبتلا ہیں تو ہمیں ان کی یہ پریشانی دور

کرنی چاہیے۔'' آغا قزلباش نے کھڑے ہو کر کہا اور نواب صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ نواب صاحب کا مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ خود ہی فرمائیے نا نواب صاحب!'' آغا قزلباش نے کہا۔

''بھئی ابھی تمہیں قزلباش نے ہمارے بارے میں ایک بہت ہی اہم بات تو بتائی نہیں اور وہ یہ کہ قبلہ ہمارے دادا حضور ایک پیر تھے۔ لاکھوں مرید تھے ان کے اجمیر میں آج بھی ان کا مزار موجود ہے۔ ان کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد میرے والد صاحب سجادہ نشین ہوئے اور ان کے بعد ہم ہیں۔ میاں ہمارے خاندان کی ایک آن بان شان ہے۔ ہمارے گھر کی خواتین نہایت دین دار اور پردے دار ہیں۔ ہمارے مریدین والد صاحب کی درگارہ پر آتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے سالانہ عرس کے موقع پر ہمارے مرید کے ایک لڑکے نے ہماری دختر نیک اختر کے ساتھ حد درجہ گستاخی کی انہیں بے حجاب دیکھا اور پھر یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ہماری صاحب زادی ہیں انہیں فون کر کے اظہار عشق بھی فرمایا اماں لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ ہماری صاحب زادی نے تو رو رو کر طوفان اٹھالیا ہے۔ انہوں نے اپنی اس بے عزتی پر خودکشی کی کوشش بھی کی۔ جب ہم نے انہیں روکا تو انہوں نے کہا کہ جب تک وہ زندہ ہے میں زندہ کیسے رہوں۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی ہمارے حسن کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ ہم اس شرمندگی کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے۔

میاں اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں۔ واللہ ہم بہت پریشان ہیں۔ اپنی اکلوتی اور باحیا صاحب زادی کو اتنی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری آنکھوں سے راتوں کی نیند رخصت ہو چکی ہے۔ اسی سلسلے میں آغا کے پاس آئے تھے تو انہوں نے تمہاری بہت تعریف کی کہ تم ہی ہمیں اس دکھ سے نجات دلا سکتے ہو۔''

یہ باتیں کرتے ہوئے نواب صاحب کے چہرے پر بہت دکھ اور افسردگی تھی۔ بات ختم کر کے وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ میں نے آغا قزلباش کی جانب نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو اس نے سر کے ہلکے سے خم کے ساتھ اشارہ کیا کہ میں اس سے اگلا حکم دریافت کروں۔

''آپ یہ فرمائیے کہ میرے لیے کیا حکم ہے۔'' میں نے نواب صاحب کی باتوں سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

''ختم کر دیجیے میاں انہیں۔'' انہوں نے بے چارگی سے کہا۔

''جی!'' میں نے حیرت سے کہا تو آغا نے غصیلی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

''مم...... میرا مطلب ہے وہ کون خبیث انسان ہے جس نے یہ کوشش کی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ان کے بارے میں تمہیں آغا بتا دیں گے۔'' انہوں نے سر اٹھا کر کہا۔

''ٹھیک ہے نواب صاحب آپ اندر چل کر اپنے کمرے میں آرام فرمائیے میں اس کو سمجھاتا ہوں۔'' آغا نے نواب صاحب کا ہاتھ تھام کر انہیں سوفے سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ کھڑے ہوئے تو میں نے دیکھا وہ ایک چھوٹے سے قد کے قدرے فربہ انسان تھے۔ آغا نے آواز لگائی۔ ''حسینہ......!''

فوراً ہی ایک طرح دار لڑکی کمرے کا دروازہ کھول کر جن کی طرح حاضر ہو گئی تو آغا بولا۔

''حسینہ نواب صاحب کو ان کے روم میں لے جاؤ اور پوچھنا انہیں کسی خدمت کی ضرورت تو نہیں۔'' حسینہ نے نواب صاحب کا ہاتھ تھاما اور مسکراتے ہوئے انہیں لے کر کمرے سے چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ بند کرنا نہ بھولی۔

مجھے نواب صاحب کی باتیں اور یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا لیکن کیا کہہ سکتا تھا اس لیے خاموش ہی رہا۔ تب آغا دوبارہ میرے نزدیک آبیٹھا اور اس نے بتایا۔

''تمہیں سردار انڈسٹری کے ہیڈ آفس جانا ہے۔ وہاں تمہیں دو افراد کاشف اور اظہر نام کے ملیں گے تمہیں ان کا کام تمام کرنا ہے۔ یاد رہے کہ یہ کام بھی تمہیں بہت مہارت اور احتیاط کے ساتھ کرنا ہے اور اگر تمہیں کوئی دیکھ لے تو ان کا بھی صفایا کرنا ہے۔ کام ہو جانے کے بعد سیدھے گھر پہنچنا اور مجھے اسی نمبر پر کال کر کے صرف یہ میسج دینا ہے ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''یہ کام کب تک ہونا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کل تک...... نواب صاحب کل تک میرے پاس ہیں۔ پھر میں تم سے دوبارہ تفصیلی ملاقات کروں گا۔'' آغا نے حتمی لہجے میں کہا۔

''سردار انڈسٹری کا ہیڈ آفس کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''آئی آئی چندریگر روڈ پر۔ اب تم جاؤ آج جو ابتدائی معلومات کرنی ہیں کر لو لیکن کل یہ کام ہر قیمت پر ہو جانا چاہیے یاد رکھو اگر تم کل یہ کام اپنی مہارت کے ساتھ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ نواب صاحب تمہارے کتنے کام آسکتے ہیں۔ ''سردار شیر افضل'' بھی نواب صاحب کے مریدین میں سے ہیں۔ تمہاری اس تک رسائی آسان ہو جائے گی۔ بس انہیں خوش کرنے کا تمہیں اس سے اچھا موقع نہیں مل سکے گا۔''

''جی بہتر!'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے سب سے بڑے دشمن سردار شیر افضل کا کام تمام کرنے کا سنہری موقع مل رہا ہے۔

آغا قزلباش کی کوٹھی سے نکل کر میں سیدھا ساحل سمندر پر آ گیا۔ آغا کی کوٹھی سمندر کے نزدیک ہی تھی۔ اس لیے یہاں آنے میں مجھے زیادہ ٹائم نہیں لگا میں صرف دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا اور ایک قدرے پرسکون حصے میں گاڑی روک دی یہاں اِکا دُکا دور دور ایک دو آدمی دکھائی دے رہے تھے۔

میں ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی تیزی سے آتی اور ساحل سے اپنا سر ٹکراتی اور پھر واپس جاتی لہروں کا نظارہ کرنے لگا۔ سمندر کی لہروں کے شور اور انسانوں کی خاموشی میں میرا ذہن تیزی کے ساتھ اپنے کام کا پلان بنانے لگا۔ پھر میں ایک محفوظ پلان بنانے میں کامیاب ہو گیا اور پھر میرے ذہن میں نواب سطوت الاسلام کی بیان کردہ کہانی گردش کرنے لگی۔ میں جتنا اس کی باتوں کو سوچتا جا رہا تھا میرے ذہن میں بہت کچھ کلیئر ہوتا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا ذہن اس کی بیان کردہ کہانی کو سچ ماننے سے انکاری تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جو کچھ نواب نے بیان کیا ہے وہ سوائے جھوٹ کے پلندے کے اور کچھ نہیں اور نواب کی اصل شخصیت کچھ اور ہی ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سجادہ نشین ہو اور اس کے مرید بھی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہوں لیکن آغا قزلباش سے کسی نیک انسان کا اس طرح کا تعلق ہونا کہ وہ اس کے آگے

ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے کسی اور ہی بات کی جانب اشارہ کرر ہا تھا۔

بہر حال مجھے کرنا تو وہی تھا جیسا مجھے کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ بعد میں اس نواب کی حقیقت کا بھی پتا لگ ہی جائے گا کہ اصل میں وہ ہے کون اور آغا سے نواب کا اصل تعلق کیا ہے۔

میں یہاں سے سیدھا آئی آئی چندریگر روڈ جانا چاہ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے اسٹیرنگ کا رخ گلشن اقبال کی جانب موڑ دیا۔

میں وہاں پہنچا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے مجھے کنیز فلیٹ میں ہی مل گئی مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی۔

''ہو گئی باس سے ملاقات کسی خاص کام کے لیے بلایا تھا میرا مطلب ہے کوئی مشن سونپا ہے تمہیں۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکاری بھری اور دھیرے سے سر ہلایا۔

''کیا بات ہے۔'' وہ میرے پرسوچ چہرے کی گہری لکیریں دیکھ کر فکر مندی سے میرے نزدیک آ گئی۔

''ہم کسی محفوظ جگہ پر بات کر سکتے ہیں۔'' میں نے اس کے بالکل نزدیک ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔ کیونکہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں کہاں کہاں خفیہ کیمرے اور اسپیکر لگے ہیں۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ میری بات سمجھ گئی اور مزید کچھ پوچھے مڑ گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا میں نے دیکھا وہ اپنے کمرے میں جا رہی ہے۔ کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے ایک ادا سے مسکرا کے پیچھے دیکھا اور بولی۔

''بلا جھجک چلے آؤ جانو۔'' اور یہ کہہ کر اندر چلی گئی جواب میں، میں ندیدوں کی طرح اس کے پیچھے لپکا۔

میرے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے لے کر بستر پر دراز ہو گئی اور میرے چہرے کے ساتھ اپنا چہرہ ملا کر بولی۔ ''اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔''

''یار ایک تو اس فلیٹ میں بات کرنا بھی عذاب ہے کیا ہم باہر نہیں جا سکتے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''فی الحال تو نہیں، میں تمہیں تفصیل سے نہیں بتا سکتی لیکن تم بتاؤ کہ کیا بات ہے۔'' اس نے میرے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کا آنچ دیتا ہوا جسم میرے جسم سے جڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم کا گداز میں اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے اور میری سانسیں تیز ہو گئیں۔ کنیز نے میری کیفیت کو محسوس کر کے کہا۔

''پلیز اپنے آپ کو کنٹرول کرو، ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم اسی طرح بات کر سکتے ہیں بتاؤ نا باس نے کیا بات کی۔''

اس کے سنجیدگی سے کہے گئے اس جملے نے میرے حواس بحال کر دیے اور میں ہوش میں آ گیا۔ تب میں نے آہستہ آہستہ اسے وہاں گزری ساری روداد سنا دی۔

''بس اب جب کہ تمہیں باس نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دے ہی دیا ہے تو تم صورت حال پر غور کرو پھر اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا۔ باس نے تمہیں جن لوگوں کے قتل کا حکم دیا ہے میرا خیال ہے ان لوگوں کا گروپ باس کے گروپ کی طرح بڑا اور مستحکم ہوگا۔ تب ہی تو وہ ان کے خاص بندوں کو مارنا چاہتا ہے۔'' کنیز نے کہا۔

''لیکن وہ نواب والی کہانی۔'' میں نے الجھ کر کہا۔

''تم اس بکواس پر دھیان نہ دو تو اچھا ہے۔''

''کیا مطلب؟ تمہارا بھی کیا وہی خیال ہے جو میرا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بالکل!'' اس نے یقینی لہجے میں کہا ''بلکہ میں سو فیصدی کہہ سکتی ہوں کہ وہ ساری کہانی جھوٹی ہے اور حقیقت میں نواب وہ نہیں جو دکھائی دیتا ہے تمہیں بس ایسا کچھ کرنا ہے کہ اس کام کے ذریعے تم باس اور نواب کا دل جیت لو پھر شاید تمہارے اوپر سے بہت سی پابندیاں اٹھا لی جائیں۔'' کنیز نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا اس نے ایک عجیب حرکت کی اور اپنے ہونٹوں کے ذریعے مجھے بولنے سے روک دیا۔

میں ایک پھر بے قابو ہونے لگا چند لمحوں بعد وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔

باہر آئے تو اکرم مجھے دکھائی نہیں دیا تو میں نے آواز لگائی۔ ''اکرم......!''

''وہ مصروف ہوگا۔'' کنیز نے کہا۔

''یار میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کھا لوں پھر جاتا ہوں۔'' میں نے کہا اتنے میں اکرم اپنے چھوٹے سے روم سے باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی بولا۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا۔''

''ہاں یار کچھ کھانے کے لیے دے دو مجھے ابھی ایک ضروری کام سے نکلنا ہے۔''

''ابھی لایا۔'' وہ مجھے اور کنیز کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے چلا گیا۔ ''الو کا پٹھا۔'' کنیز نے اس کی مسکراہٹ پر جل کر کہا۔

''ایک تو اس اکرم کا کردار میرے سامنے واضح نہیں ہے۔'' میں نے کنیز کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اس کے بارے میں اتنا جان لو کہ یہ باس کا مخبر ہے ایک ایک لمحہ کی خبر دیتا ہے۔ اس کے کمرے میں مانیٹر ہے یہ وہاں بیٹھ کر ہم سب کی خبر رکھتا ہے۔'' کنیز نے سرگوشی میں کہا تو میری سمجھ میں ساری بات آ گئی۔

کھانا کھا کر میں سردار انڈسٹریز کے ہیڈ آفس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ اپنے منصوبے کے بارے میں سوچتے ہوئے میں ان کے آفس پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر میں نے پیون سے کہا کہ مجھے عمران سردار سے ملنا ہے۔ یہ نام مجھے باس نے بتایا تھا۔ پیون نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور میرا نام پوچھا، میں نے اپنا نام رضوان بتایا پیون نے مجھے اوپر رضوان کی سیکریٹری سے ملنے کے لیے کہا۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا تو مجھے دو اشخاص اوپر سے اترتے ہوئے دیکھائی دیے۔ ان دونوں آدمیوں کے چہرے پر مجھے شناسائی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی لیکن نہ انہوں نے مجھ سے کچھ کہا اور نہ میں نے۔ میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ اوپر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا وہ دونوں آدمی مجھے دکھائی نہیں دیے تو میں آگے بڑھ گیا۔ وہ جا چکے تھے۔ سامنے دیکھا تو مجھے میز اور کرسی تو دکھائی دی مگر یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی مجھے نہ صرف سیکریٹری یہاں بیٹھی دکھائی دی بلکہ کوئی اور بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں کس سے پوچھوں۔ تب ہی ایک شخص تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا وہ ان میں سے ایک تھا جو ابھی سیڑھیوں پر مجھے نیچے جاتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ وہ میرے نزدیک آیا اور خوش دلی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''آپ کو سر رضوان سے ملنا ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کس سلسلے میں۔'' اس نے پوچھا۔

''دیکھیں یہ تو میں ان ہی سے مل کر انہیں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا ٹھہریں میں باس سے بات کرتا ہوں۔ میں باس کا سیکریٹری ہوں۔ وہ جو صاحب میرے ساتھ تھے انہیں میں نیچے تک سی آف کرنے کے لیے گیا تھا۔ اسی لیے آپ کو میری سیٹ خالی دکھائی دے رہی ہے۔'' اس نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور تیزی سے سامنے پڑی میز کی جانب بڑھ گیا۔ یہاں کمپیوٹر کے علاوہ دو تین ٹیلیفونز بھی رکھے تھے اس نے ایک سیٹ کا ریسیور اٹھایا اور دھیمے لہجے میں کوئی بات کی جو مجھے سنائی نہیں دی۔ ''او کے سر'' کہہ کر اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور بولا۔

''آجایئے سر آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔''

''تھینک یو!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور سامنے والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لمحہ بھر کو تو میں چکرا کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ کمرہ جس طرح روشن ہونا چاہیے تھا اس طرح روشن نہیں تھا بہت ہی دھیمی روشنی کا ایک بلب روشن تھا اور اس دھیمی روشنی میں میری تیز نگاہوں نے لمحہ بھر میں اندر کا جائزہ لے لیا تھا۔

باس کی بڑی سی میز کے پیچھے رکھی ہوئی کرسی خالی تھی۔ البتہ دائیں جانب بچھے صوفے پر تین مسٹنڈے بیٹھے تھے میں جھک کر تیزی سے پیچھے ہو گیا۔

''اندر چلو!'' مجھے اپنی کمر پر لوہے کی کسی سرد سی چیز کی چبھن محسوس ہوئی اور ایک غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی تو دوبارہ وہی آواز آئی۔

''سنائی نہیں دے رہا ہے کہ اندر چلو۔'' اس نے اس لوہے کی چیز کو جو یقیناً پستول تھی میری پیٹھ میں چبھوتے ہوئے سابقہ لہجے میں کہا تو میں نے اندر قدم بڑھا دیے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یکا یک یہ اچانک مجھ پر کیسی افتادہ آن پڑی ہے۔ کوئی بھی میرے اوپر کسی بھی قسم کا شک کس طرح سے کر سکتا ہے کہ میں یہاں کسی ٹھیک ارادے سے نہیں آیا۔ آخر ان لوگوں کو کون خبردار کر سکتا ہے کہ......!

''آؤ آؤ شہزادے مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔'' مجھے ایک آواز سنائی دی اندر آنے کے بعد میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا یہ وہی آدمی تھا جس نے اپنا تعارف مجھے سیکریٹری کہہ کر کرایا تھا۔

میرے چہرے پر سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح سے ظاہر کیا جیسے کہ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ ''یہ...... یہ سب کیا ہے تم لوگ کون ہو اور میرے ساتھ اس طرح سے کیوں کر رہے ہو؟'' میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔ جب کہ میرا دماغ تیزی کے ساتھ اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر ان لوگوں کو میرے اوپر کس طرح سے اور کیوں شک ہوا جب کہ میں نے تو ایسی کوئی بات کی ہی نہیں۔

''یہ سوال تو ہمیں تم سے کرنا ہے کہ تم کون ہو اور عمران سردار سے تمہیں کس سلسلے میں ملنا ہے۔'' اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر میرے نزدیک ہو کر خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سوال کرنے کا یہ کیا طریقہ ہے۔ تم لوگ مجھ سے آرام سے بھی یہ سوال کر سکتے تھے۔ مگر تمہارا انداز تو بدمعاشوں والا ہے۔'' میں نے اس مرتبہ اپنے لہجے میں تیزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے بیٹے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ کوئی سورما عمران سردار کا کام تمام کرنے کے لیے آ رہا ہے اور ہمیں جو حلیہ بتایا گیا تھا وہ تمہارا ہی تھا۔'' اس نے اپنے سر کے بالوں پر لمبائی کا اشارہ اور چہرے پر داڑھی مونچھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اطلاع ملی تھی۔'' میرے منہ سے بے

ساختہ حیرت زدہ انداز میں نکل گیا۔

''ہوں۔'' اس نے بغور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر ہلایا اور بولا۔ ''اب سچ بتاؤ کہ تم کون ہو اور تمہیں کس نے بھیجا ہے۔''

''میرا خیال ہے اس سے یہاں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کو وہیں لے جاتے ہیں۔'' میرے جواب کا انتظار کیے بنا اس کا دوسرا ساتھی بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر لے چلو اسے......!'' اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے رہو لیکن خبردار جو تم نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی ورنہ مجھے صرف اپنی انگلی کو ذرا سی حرکت کی زحمت ہوگی اور گولی تمہارے دل میں اتر جائے گی۔'' میرے پیچھے کھڑے اس شخص نے جس نے پستول میری پسلیوں سے لگایا ہوا تھا غراتے لہجے میں کہا۔

''چل رہا ہوں میں بھی چاہتا ہوں کہ تمہاری غلط فہمی اچھی طرح سے دور کر دوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہاں موجود دونوں آدمیوں نے بھی مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور وہ لوگ مجھے وہاں سے لے چلے ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے مگر حیرت انگیز طور پر وہاں لوگ موجود نہیں تھے جبکہ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ عمارت ہیڈ آفس ہے تو یہاں لوگ موجود ہونے چاہییے تھے۔ اللہ جانے کیا چکر ہے۔ اس نواب کے بچے نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا تھا اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو میرے بارے میں کس نے اطلاع دی کیا باس کے گروپ میں ایسا کوئی بندہ یا کالی بھیڑ موجود ہے جس نے ان لوگوں کو میرے بارے میں بتایا ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جس وقت باس اور نواب مجھ سے بات کر رہے تھے تو وہاں کوئی تیسرا موجود نہیں تھا اور میں نے یہ بات صرف کنیز کو ہی بتائی تھی تو کیا کنیز نے یہ مخبری کی ہے؟ میرا دماغ سنسنانے لگا پھر خیال آیا کہ کنیز ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ یہ تو کوئی اور ہی ہے۔

اسی سوچ بچار میں ہم آفس سے باہر نکل کر آ گئے اور گیٹ کے بالکل سامنے کھڑی بلیک کلر کی کرولا میں بیٹھ گئے جس میں پہلے سے ہی ڈرائیور موجود تھا اور گاڑی اسٹارٹ بھی تھی ایک شخص آگے بیٹھ گیا اور باقی دو افراد میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے اس شخص نے ابھی تک پستول میری پسلیوں سے لگا رکھا تھا۔

''یار ذرا پستول میری پسلی سے دور رکھو مجھے بری طرح اس کی نال چبھ رہی ہے۔'' میں نے اپنی ٹینشن دور کرنے کے لیے ازراہ مذاق کہا۔

''بکومت' چپ چاپ بیٹھے رہو۔'' اس نے تپ کر کہا۔

جیسے ہی دروازے بند ہوئے گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی میری آنکھیں کھلی تھیں اور میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ہم کہاں سے اور کس روڈ سے گزر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ڈیفنس کی جانب مڑ گئی۔ بالآخر مختلف شاہراؤں پر سے ہوتے ہوئے ہماری گاڑی ڈیفنس کے ایک بنگلے کے سامنے جا کر رک گئی۔

ڈرائیور نے ہارن دیا تو ذرا ہی دیر میں ایک باوردی گارڈ نے مین گیٹ کھول دیا گن اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ گاڑی اندر کار پورچ میں جا کر رک گئی۔ تو وہ لوگ اتر گئے ساتھ ہی مجھے بھی اترنے کے لیے کہا۔ میرے اترتے ہی اس نے ایک بار پھر تیزی سے میرے پیچھے آ کر پستول میری پسلیوں میں گھسیڑ دیا۔

ابھی ہم باہر ہی تھے اور برآمدے تک ہی پہنچے تھے کہ اندر بنگلے سے تین آدمی باہر نکلے وہ تینوں قوی الجثہ تھے۔ انہوں نے بلیک جینز اور بلیک ہی ٹی شرٹس پہنی ہوئی تھیں۔ ایک آدمی بیڑی پی رہا تھا۔ ایک نہایت بے ہودہ طریقے سے پان چبا رہا تھا۔ تیسرے کے ہاتھ میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

ہم سب ایک دم رک گئے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ سگریٹ پینے والے نے رک کر سگریٹ کا ایک طویل کش لگایا اور پھر اسے نیچے پھینک کر اپنے جوتے تلے مسل دیا۔ بیڑی پینے والے نے بھی یہی کیا اور وہ دونوں سگریٹ اور بیڑی پھینکنے کے بعد تیزی سے میری جانب بڑھے اور میرے دائیں بائیں آ کر میرے بازو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے کم بخت کی انگلیاں بھی فولاد کی تھیں۔ جو میرے بازو میں گڑی جا رہی تھیں۔

پھر پان چبانے والا آدمی پان چباتا ہوا اور اپنے لال لال دانتوں کی نمائش کرتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے قدموں میں جھک گیا۔

کم از کم اس وقت تک تو میں یہی سمجھا کہ یہ مجھے تعظیم دے رہا ہے اور جیسا ہندو معاشرے میں ہوتا ہے کہ آنے والے کو تعظیم دینے کے لیے اس کے پیروں کو چھوا جاتا ہے یہ بھی میرے پیر چھو رہا ہے لیکن یہ کیا......! اس نے میرے دونوں پیروں کو پکڑ کر اٹھا لیا۔

''ارے......رے......رے یہ کیا کر رہے ہو۔'' میں بوکھلا کر چیخا تو جواب میں ان سب کا اونچا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا وہ تینوں مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے وہاں سے لے جانے لگے۔

وہ تینوں مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے وہاں سے اندر چلے اور وہ ایک زمین دوز تہہ خانے میں اترنے لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ تینوں افراد بھی آ گئے۔ پستول بردار شخص بھی اندر آ گیا۔ وہ میرا نشانہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ تو ان تینوں نے مجھے زمین پر کھڑا کر دیا پھر بڑی بے دردی کے ساتھ مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں زور سے دیوار سے ٹکرایا اور میرے سر میں پٹاخے پھوٹنے لگے۔ ان تینوں نے نہایت پھرتی دکھائی اور مجھے وہاں موجود لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ لوہے کی یہ زنجیریں دیوار میں لوہے کے ایک کنڈے سے منسلک تھیں۔ مجھے زنجیروں میں جکڑنے کے بعد ان میں تالے ڈال دیے گئے مجھے ہاتھ اور پیروں سے اچھی طرح سے بے بس کر دیا گیا تھا۔ وہ سب میرے سامنے کھڑے تھے اور میں بے پروا انداز میں تہہ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں تہہ خانے کی اونچی چھت پر ایک بلب روشن تھا۔ اس کے علاوہ لوہے کے سریے اور ڈنڈے وغیرہ بھی وہاں موجود تھے۔

ان میں سے ایک آدمی میرے سامنے اپنے پیروں کو چوڑائی میں پھیلا کر کھڑا ہوا اور بولا۔

''ہاں اب بتاؤ کہ تم وہاں کس ارادے اور نیت سے آئے تھے؟''

''میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں عمران سردار سے ملنے کے لیے آیا تھا اور تم لوگوں نے مجھے نہ جانے کیا سمجھ لیا۔ بھئی میں ایک عام سا سیدھا سادا آدمی ہوں۔'' میں نے بلاخوف وخطر اطمینان سے کہا۔

میرے چہرے پر پھیلا اطمینان دیکھ کر اسے آگ لگ گئی اور وہ طیش بھرے لہجے میں بولا۔

''دیکھ بیٹے تو میری بات اچھی طرح سے کان کھول کر سن لے کہ ہم ذرا ظالم قسم کے لوگ ہیں۔ رحم کس چڑیا کا نام ہے ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ اب تو سب کچھ سچ سچ خود ہی بتا دے ورنہ ہمیں خوامخواہ ایک تکلیف کرنی پڑے گی اور پھر تجھے بھی خاصی

تکلیف ہوگی۔''

''آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟'' اس بار میں نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم صرف تمہارے منہ سے یہ سچ سننا چاہتے ہیں کہ تمہارا اصل مقصد کیا تھا ادھر آنے کا۔''

''میں بتا تو چکا ہوں اور کتنی بار بتاؤں۔'' میں نے رو دینے والا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اوں، ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تیری اس بکواس پر ہمیں یقین نہیں ہے۔''

''پھر تم ہی بتاؤ کہ میں تمہیں یقین دلانے کے لیے اور کیا کروں۔'' میں نے اپنے چہرے پر بے پناہ لاچاری اور مسکینی لاتے ہوئے کہا۔

''سچ! سچ بولو میری جان۔'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''وہ میں بول چکا ہوں۔ بار بار کہہ رہا ہوں اور اب پھر کہہ رہا ہوں کہ مجھے عمران سردار سے ذاتی کام تھا اس لیے اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم پہلے بھی عمران سے ملے ہو؟'' اس نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنی ایک آنکھ کو تھوڑا سا میچ کر پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''تو تمہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوگا کہ وہ بنا اپائنٹ منٹ کے کسی سے نہیں ملتا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کیونکہ وہ میرا دوست ہے۔'' میں نے پُر اعتماد لہجے میں جھوٹ بولا اور دوسرے ہی لمحے میرے منہ پر اس کا زناٹے دار تھپڑ پڑا۔

''بکواس کرتا ہے سالا حرامی! یہ کیوں نہیں کہتا کہ تجھے کسی نے عمران صاحب کو مارنے کے لیے بھیجا ہے۔ اب سیدھی طرح سے بک دے کہ وہ سالا ہے کون؟'' اس نے غصے میں مجھے گالی دی اور چیخ کر بولا۔

''مجھے یہاں تیرے باپ نے بھیجا ہے کہ جا اور جا کر میرے سور ما سے مار کھا۔ سمجھ گیا یا اور سمجھاؤں۔'' میں نے بھی جواباً چیختے ہوئے کہا۔

''ابے یہ سیدھی شرافت کی زبان نہیں سمجھتا۔ اپنے آپ کو میرا بھی باپ سمجھ رہا ہے۔'' اس نے قریب کھڑے اپنے دوسرے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔

''تو پھر اپنی زبان میں سمجھاؤ۔'' دوسرے نے اطمینان سے کہا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اپنے مضبوط جوتے سے ایک زور دار ٹھوکر میرے منہ پر ماری اس کی زور دار ضرب سے مجھے اپنے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور گال میں اندر کی جانب شدید جلن کا احساس ہوا۔ میں نے تکلیف کی شدت کو برداشت کرنے کے لیے اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے ان کمینوں نے مجھے زنجیروں سے اس طرح سے جکڑ رکھا تھا کہ میں جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''دیکھ میں آخری وارننگ دے رہا ہوں کہ ہمیں اس شخص کا نام بتا دے۔ ورنہ دو ہاتھیوں کی لڑائی میں تو بچارہ مارا جائے گا۔ ہم تجھ پر اس وقت تک تشدد بڑھاتے رہیں گے جب تک تو اپنے باپ کا نام نہیں اگل دیتا اور پھر تو خواہ مخواہ میں مر جائے گا۔ تیرے باپ کا کیا جائے گا۔ وہ تیری جگہ کسی اور کو لے آئے گا۔'' میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے پوری طرح بے بس کر ہی دیا ہے اب یہ میرے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں گے اور میں کسی بھی طرح اپنا دفاع نہیں کر سکوں گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے منہ میں بھرے ہوئے خون کی کلی دائیں جانب کر کے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں تمہیں اصل بات بتا دیتا ہوں لیکن وعدہ کرو کہ سچ سننے کے بعد تم مجھے آزاد کر دو گے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے بعد وہ بھی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اس لیے اگر تم مجھے زندہ چھوڑنے اور کچھ رقم دینے کا وعدہ کر دو تو میں تمہیں مزید بہت سی اہم اطلاعات دے سکتا ہوں۔ جس میں سراسر عمران سردار کا فائدہ ہے۔''

''تجھے کس نے بھیجا ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''آغا غضنفر نے......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ بری طرح چونک پڑا اور زیر لب آغا غضنفر دہرایا۔

''ہاں آغا نے اور یہ ساری باتیں میں عمران صاحب ہی کو مل کر بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''تو نے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے بتا دی یقین نہیں آتا اور اب بھی تیری وہی مرغے کی ایک ٹانگ والی بات ہے کہ تو عمران صاحب سے ضرور ملے گا۔ ابے اتنے بڑے کام کے لیے اتنا کچا بندہ کوئی نہیں بھیجتا۔'' اس نے میری بات کا قطعی یقین نہیں کیا۔

''مت کرو میری بات کا یقین۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ میں گھات لگا کر بیٹھتا اور آرام سے عمران سردار کی کار پر فائرنگ کر کے اسے مار کر چلا جاتا۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''بکواس مت کر۔ اسے مارنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔''

''میرے لیے بہت آسان ہے۔ میرا نشانہ بڑا پکا ہے۔ یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لو میں چلتی گاڑی میں بھی بندہ پھڑکا سکتا ہوں۔ میں آغا غضنفر کی یہی بات عمران سردار سے مل کر اسے بتانا چاہتا تھا لیکن میں نے غلط توقعات رکھ لیں۔ میرا کیا جاتا ہے مجھے عمران سردار خوش ہو کر کچھ رقم دے دیتا۔''

''دیکھ پیارے جرم کی دنیا میں کسی سے بھی بھلائی کی توقع رکھنا بہت بڑی بے وقوفی ہوتی ہے اور تو یہ بے وقوفی کر چکا ہے۔'' اس نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو میں نے تمہیں سچ بتا دیا ناں تو اب مار دو مجھے گولی اور اپنی جان چھڑاؤ۔ کیوں میرا اور اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

میری بات سن کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کوئی بات کی۔ پھر تینوں ایک ساتھ تہہ خانے سے باہر چلے گئے اور میں سوچنے لگا کہ اب یہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آپس میں کوئی مشورہ کرنے گئے ہوں یا پھر اس عمران سردار سے بات کرنے گئے ہوں جسے میں نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد ان تینوں میں سے دو آدمی اندر آئے اور میری زنجیریں کھولنے لگے میرا دماغ تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ بہت ہی سنہری موقع تھا۔ میں نے آنے والے وقت کے لیے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے دیا۔

دونوں کے سر اور کمر جھکی ہوئیں تھیں اور وہ زنجیروں کھول رہے تھے۔ جیسے ہی میرے ہاتھ کی زنجیریں اور پیروں کی زنجیریں کھلیں میں نے گھڑی کی چوتھائی میں انہیں سیدھا ہونے کا موقع دیے بنا اپنا دایاں ہاتھ اور بائیں ٹانگ کو حرکت دی۔ دائیں ہاتھ سے تو میں نے اس کی گردن اس طرح جکڑی کہ وہ اگر خود کو آزاد کرنے کے لیے ذرا سا بھی زور لگاتا تو اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ دوسرے آدمی کے

سیدھے ہونے سے قبل ہی میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اپنے جوتے کی نوک پوری طاقت سے ماری تکلیف کی شدت سے صرف اس کا منہ کھلا اور آنکھیں باہر نکل آئیں مگر منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی اور وہ دہرا ہوتا چلا گیا۔ یہ تکنیک میرے چینی استاد چاؤلی نے سکھائی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس طرح کی ضرب لگانے سے بندے کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ آج پہلی مرتبہ اس داؤ کو آزمایا تھا اور میں پوری طرح کامیاب بھی رہا تھا وہ دوہرا ہوتے ہوئے اوندھے منہ گر پڑا۔

دوسرا شخص جس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے زور لگا رہا تھا کہ وہ اپنی گردن چھڑا سکے۔ لیکن میں نے اسے ذرا بھی موقع نہیں دیا اور ہاتھ کو ایک مخصوص جھٹکا دیا ایک تڑاخ کر کے آواز آئی اور اس کا لحیم شحیم جسم پھڑک کر رہ گیا۔ میں نے اس کی گردن سے ہاتھ نکالا اور اس کا جائزہ لیا اس کی روح اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے ذریعے اس کا جسم چھوڑ چکی تھی۔

اسے چھوڑ کر میں تیزی سے دوسرے بندے کی جانب متوجہ ہوا وہ بے ہوش تھا لیکن مرا نہیں تھا۔ اس کی سانسیں بہت مدہم مدہم چل رہی تھیں۔ میں اسے ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اچانک ہی ہوش میں آجائے اور مجھے دبوچ لے یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کسی طرح سے میری اس حرکت کی اطلاع اپنے دوسرے ساتھیوں کو دے دے۔ میں نے اسے بھی گردن کا مخصوص جھٹکا دے کر زندگی کی قید سے رہائی دلا دی۔

میں تیزی سے سامنے بنی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن باہر نکلنے میں مجھے بہت زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کرنا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تہہ خانے سے باہر کتنے لوگ موجود ہیں میں نے انہیں ہر طرح سے بے وقوف بنانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طرح بھی میری باتوں میں نہ آئے۔

سیڑھیوں سے اوپر چڑھ کر میں نے دروازے سے ذرا سا سر نکال کر باہر جھانکا تو مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا تو میں بڑی آہستگی سے پورا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

میں نے ایک کمرے میں اپنے آپ کو پایا یہاں چند لمحے رک کر میں نے باہر کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی تب میں نے اس کمرے سے باہر نکلنے کے بارے میں سوچا۔

میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تب سامنے اوپر کی منزل سے نیچے آتے ہوئے زینے پر دو آدمیوں پر میری نگاہ پڑی وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے اسی کمرے کی جانب آرہے تھے۔

میں تیزی سے اندر کی جانب ہوگیا۔ وہ اسی طرف آرہے تھے اب میں کیا کروں۔ میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ بس دو تین منٹوں کی بات ہے وہ تہہ خانے کے اندر اتریں گے اور انہیں اپنے سورماؤں کی لاشیں نظر آجائیں گی اور ان کا شکار یا مجرم یعنی میں غائب ہوں گا تو وہ بری طرح چیختے اور دہاڑتے ہوئے باہر آجائیں گے اور میں اس کمرے سے کسی چوہے کی مانند پکڑا جاؤں گا۔ پھر مجھے مرنے سے کوئی بھی نہیں بچا پائے گا۔

میں نے تیزی کے ساتھ اپنے سر کو چاروں جانب کمرے میں گھمایا۔ میں وقتی طور پر اپنے آپ کو ان لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہ رہا تھا۔ ان لوگوں کے قدموں کی چاپ مجھے واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

تب ہی میری نگاہ اس کمرے میں موجود کھڑکی کے دیوار گیر گھنے پردوں پر پڑی کھڑکی کے آگے ایک

صوفا رکھا ہوا تھا۔ میں ایک ہی جست میں پردے کے پیچھے چھپ گیا اور اسی لمحے دروازہ کھول کر وہ دونوں اندر داخل ہوگئے اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہوجاتی تو میں دھر لیا جاتا۔

میں دم سادھے پردے کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تہہ خانے میں اتر گئے۔

میرے پاس بس اتنا ہی ٹائم تھا میں پھرتی سے پردے سے باہر نکلا اور بلا کھٹکے کمرے سے باہر نکل آیا کسی بھی لمحے وہ دونوں افراد بھی باہر آنے ہی والے تھے۔

اور وہی ہوا جیسا میں سوچ رہا تھا وہ بری طرح گالیاں دیتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے باہر آئے میں ان کی آوازیں سن کر سامنے والے کمرے میں گھس گیا۔ یہاں ایک آدمی بیٹھا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ تہہ خانے سے باہر آنے سے پہلے میں نے ان سورماؤں کے اسلحہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ چونکہ اب میں نہتا نہیں تھا اس لیے ذرا سا ڈر کم ہوگیا۔ میرے لیے اب معاملہ آر یا پار والا تھا۔ مجھے انہیں بھی مارنا ہوگا۔ اگر میں نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ مجھے مار دیں گے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ دونوں اسی کمرے میں آئیں گے اس لیے میں نے پستول ہاتھ میں لے لی اور دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ کمرے میں موجود شخص کو میری آمد کے بارے میں قطعی علم نہیں ہوسکا وہ کسی کا نمبر بار بار ملانے کی کوشش کر رہا تھا اور رابطہ نہ ہونے پر بار بار جھنجلا کر دوبارہ نمبر ملا رہا تھا۔

ان دونوں آدمیوں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں سن کر وہ شخص چونک پڑا اور فون سے توجہ ہٹا کر دروازے کی جانب مڑ کر دیکھنے لگا۔ اب اس شخص کا چہرہ میرے سامنے تھا ورنہ اب تک تو وہ پیٹھ موڑے ہی بیٹھا تھا۔

”وہ سالا حرامی ہمارے بندوں کو مار کر بھاگ گیا ہے۔“ وہ دونوں ایک ساتھ تیزی سے اندر آئے اور آتے ہی ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔

”کیا بک رہے ہو وہ تو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔“ اس شخص نے تیزی سے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر حیرانی سے پوچھا۔

”آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اسے کھول کر یہاں لاؤ‘ کیونکہ ہماری اطلاع کے مطابق آغا قزلباش کا کوئی بندہ ادھر آنے والا تھا تو آپ نے اس کے بیان پر یقین کرلیا کہ یہ وہی شخص ہے جو آپ کو مارنے کے لیے آیا ہے۔“

دوسرے شخص نے جواب دیا۔

اچھا تو یہ ہے عمران سردار‘ باس نے جس شخص کو مارنے کے لیے مجھے بھیجا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ میرے لیے یہ بہترین موقع تھا عمران سردار میرے نشانے پر تھا۔ وہ تینوں اس کمرے میں میری موجودگی سے بالکل بے خبر تھے۔

”تم سب ناکارہ ہو‘ نکمے ہو‘ اسے تلاش کرو وہ اسی گھر میں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔ باہر تو نہیں جاسکتا۔“ عمران سردار نے بوکھلا کر کہا شاید یہ سوچ کر کہ اسے قتل کرنے کے لیے آنے والا شخص آزاد ہوچکا ہے۔ اس کی رنگت زرد ہونے لگی اور چہرے پر سراسیمگی سی پھیل گئی۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو ورنہ میرے ہاتھ سے چلائی ہوئی گولی کسی کی خیریت نہیں پوچھتی سیدھی بھیجے میں اتر کر اسے باہر لے آتی ہے۔“ میں نے دروازے کے پیچھے سے باہر نکلتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔ میرا ہاتھ سیدھا تھا اور اس میں اسی کے ساتھی کا پستول تھا۔

میری آواز سن کر وہ تینوں بری طرح چونک پڑے ان دونوں نے تو فوراً ہی اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے لیکن

میری عقابی نگاہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ عمران سردار ہاتھ اوپر کرتے ہوئے اپنے کوٹ کے اندرونی حصے کی جانب اپنا ہاتھ لے جا رہا ہے۔

''شاید تمہاری قوت سماعت ذرا کم ہے۔ تم نے سنا نہیں عمران سردار کہ میں نے کیا کہا۔ کوٹ کے اندر سے اپنا اسلحہ نکالنے کی قطعی حماقت نہ کرنا۔ ورنہ نتیجے کے تم خود ذمہ دار ہوگے۔'' میں نے تیزی سے پستول کا رخ عمران سردار کی جانب کر دیا تو اس نے اپنا ہاتھ سر کے اوپر بلند کر لیا۔

''شاباش۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو تم جو کوئی بھی ہو، میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا تھا اور تمہیں بلوانے کے لیے اپنے ساتھیوں کو اوپر بھیجا تھا، پھر تم نے انہیں کیوں مار ڈالا اور اب میرے اوپر بھی پستول تان کر کھڑے ہو۔ آؤ بیٹھو ہم اطمینان سے بات کرتے ہیں۔'' عمران نے اپنے اندر کے خوف کو تھوڑا کم کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری باری ختم ہوگئی اور اب میری باری ہے عمران سردار!'' میں نے عمران سردار کا نشانہ ٹھیک طریقے سے لیتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا مطلب......؟'' وہ گھبرا کے ہکلا گیا۔

''مطلب یہ کہ جو تمہیں کرنا تھا کر چکے اور اب......!'' اتنا کہہ کر میں نے توقف کیا اور اس کی خوفزدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا وہ بری طرح ہراساں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے کی جانب آ رہا تھا اور وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

''ہاتھ اوپر رکھو......!'' میں زور سے دہاڑا تو اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ اونچا کر لیا اور چیخ کر بولا۔

''آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

''وہی جو کرنے کے لیے آیا تھا۔'' میں نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں نے نہتا ہونے کے باوجود جس طرح سے اس کے تین ساتھیوں کو مار ڈالا تھا۔ یہی بات انہیں سمجھا رہی تھی کہ وہ مجھے ہلکا نہ لیں۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تم مجھ سے آغا قزلباش کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے۔ دیکھو تم مجھ سے بات کرو میں تمہاری بات توجہ سے سنوں گا اور تمہاری ڈیمانڈ بھی منظور کروں گا۔'' عمران سردار نے کہا۔

''ایک بات تو بتاؤ عمران سردار تمہاری اور آغا قزلباش کی دشمنی کی کیا وجہ ہے؟'' میں نے پستول کا نشانہ لیے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے میری نگاہیں اس کے دوسرے کھڑے ساتھیوں پر بھی تھیں۔ میں ان کی جانب سے ذرا سا بھی بے پروا نہیں تھا۔ ورنہ وہ میری معمولی سی بھی غفلت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

''میری دشمنی آغا قزلباش سے نہیں ہے میرا دشمن تو غضنفر ہے وہ ہماری سردار انڈسٹری پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ میرے والد کو تو وہ مروا ہی چکا ہے۔ اس کی راہ کا کانٹا صرف میں ہی ہوں۔'' اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''تمہاری اس سے کوئی رشتہ داری ہے یا پھر کاروباری رقابت ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اگر صرف کاروباری رقابت ہوتی تو مجھے اتنا زیادہ دکھ نہیں ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ میرا چچا ہے۔'' عمران سردار نے کہا۔

''یہ غضنفر کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی تو اصل آدمی ہے آغا قزلباش تو اس کا پالتو کتا ہے۔'' عمران سردار نے جواب دیا۔

میں لمحہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا کہ یہ غضنفر کون ہے۔ مجھے عمران سردار کے قتل کے لیے تو نواب نے بھیجا تھا اور اسی لیے میری توجہ ذرا دیر کو ان دونوں آدمیوں سے ہٹی اور غضب ہو گیا۔ ان میں سے ایک آدمی نے میرے اوپر چھلانگ لگائی وہ مجھے قابو میں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں اس کے ہلتے ہی چوکنا ہو گیا اور میرے ہاتھ کا رخ اس کی جانب ہو گیا۔ ٹریگر پر میری انگلی کا دباؤ بڑھا اور گولی سیدھی اس کے دل کے مقام پر پیوست ہوگئی اور وہ راستے میں ہی اوندھے منہ گر پڑا۔

اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عمران سردار نے تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا وہ مجھ پر فائر کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا میرا ہاتھ تیزی سے اس کی جانب گھوما اور میں نے اس پر فائر جھونک دیا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی اپنا پستول نکال رہا تھا۔ میں نے اسے بھی ہاتھ سیدھا کرنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر گولی چلا دی۔

گولی اس کی پسلی میں گھس گئی اور وہ وہیں دہرا ہو گیا اور اس کا پستول نیچے گر گیا۔ میری توجہ عمران سردار کی جانب ہوگئی۔ میرا فائر اس کے بازو میں لگا تھا اور وہ اپنے پستول والے ہاتھ سے اپنا زخمی بازو تھامے ہوا تھا۔

میں ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑ کر اس کا پستول بردار ہاتھ پکڑ کر کمر کے پیچھے کر کے پکڑ لیا۔

''تم مجھے چھوڑ دو، تم جتنی رقم مانگو گے میں تمہیں دوں گا۔'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''بات چیت کا وقت تم نے کھو دیا ہے دوست، تمہاری بات سن کر مجھے تم سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کرتا مگر تمہارے اس احمق ساتھی نے سارا کھیل بگاڑ دیا، معاف کرنا دوست مجھے اپنا کام کر کے جلدی واپس لوٹنا ہے گڈ بائے۔''

یہ کہہ کر میں نے اپنے مخصوص داؤ سے اس کی گردن کو ایک جھٹکا دیا اور اس کا منکا ٹوٹ گیا۔ میں نے اس کے مردہ وجود کو قریبی صوفے پر پھینکا اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور اسے اس شخص کے ہاتھ میں دے دیا جس نے مجھ پر چھلانگ لگانے کی حماقت کی تھی۔

پھر میں نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس بات کا تو مجھے اطمینان تھا کہ اس بنگلے میں کوئی اور موجود نہیں ہے اگر ہوتا تو فائر کی آواز سن کر فوراً چلا آتا۔

میں بھاگتا ہوا آیا اور گیٹ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت باہر کوئی نہیں تھا۔ کسی نے بھی مجھے اس بنگلے سے باہر آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ باہر آ کر میں اطمینان کی چال چلتا ہوا ایک جانب چلنے لگا۔ میرا رخ مین روڈ کی جانب تھا۔ میں روڈ پر آیا اور وہاں کھڑی ایک ٹیکسی والے کو گلشن اقبال چلنے کے لیے کہا۔

''ام نہیں جائے گی، یہ امارے آرام کا وقت اے۔'' پٹھان ٹیکسی ڈرائیور جو ڈرائیونگ سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکائے منہ پر رومال ڈالے لیٹا تھا میرے جگانے پر برا مانتے ہوئے بولا۔

''چلو میرے بھائی ماں کی بہت حالت خراب ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ جائے اور ان سے آخری ملاقات بھی نہ کر سکوں۔'' میں نے رو دینے والے لہجے میں مسکین سی شکل بنا کر پشتو زبان میں کہا۔

پشتو زبان سن کر اور اماں سے آخری ملاقات کا

ذکر سن کردہ خان صاحب بھی جذباتی ہوگیا اور پشتو میں بولا۔

''چلو بھائی ابھی ہم اتنا خبیث کا بچہ بھی نہیں ہے کہ تمہاری ماں سے تمہارا آخری ملاقات بھی نہیں کرائے۔'' میں تیزی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ وہ خان صاحب مجھ سے ماں کی بیماری کی تفصیلات پوچھنے لگا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں اپنی ماں کی بیماری کا قصہ سنانے لگا جو پشاور میں رہتی تھی۔ مجھے اس کی باتوں سے شدید الجھن اور بے زاری محسوس ہورہی تھی لیکن کیا کرتا مجبوری تھی، گلشن اقبال کا علاقہ شروع ہوا تو میں نے ٹیکسی رکوادی اور اتر گیا حالانکہ ابھی مجھے کافی دور جانا تھا۔ لیکن میں ایک ہی ٹیکسی سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں سے میں نے دوسری ٹیکسی لی اور اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔

میں کل صبح آغا قزلباش اور نواب سطوت الاسلام سے ملا تھا اور نواب صاحب نے ہی مجھے اپنی صاحب زادی کی عزت بچانے کے لیے سردار انڈسٹری کے مالک کے بیٹے عمران سردار کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے اپنا کام تو کرلیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس کام کے لیے چوبیس گھنٹے دیے تھے اور میں نے مقررہ وقت میں اپنا کام انجام بھی دے دیا تھا۔ لیکن اس وقت بہت سی باتیں مجھے بے چین کررہی تھیں۔ بہت سے سوالات تھے میرے دماغ میں اور سوچ بچار کے بعد اپنے ذہن میں اٹھنے والے ان سوالوں کے جوابات بھی مجھے خود ہی تلاش کرنے تھے۔ میں اپنے کمرے میں جاکر اطمینان سے تنہائی میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا لیکن جب میں فلیٹ پر پہنچا تو اپنے تینوں ساتھیوں کو اپنا منتظر پایا جعفر اور کلیم بھی جم نہیں گئے تھے۔ کنیز تو تھی ہی بے قراری کے ساتھ میری منتظر......!

''تم ٹھیک تو ہوناں شمروز......! سب کچھ ٹھیک ہوگیا ناں......!'' مجھے دیکھتے ہی کنیز تیر کی مانند میری جانب لپکی اور پوچھا۔ کلیم اور جعفر بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے مگر خاموش زبان سے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

''ہاں اللہ کا شکر ہے میں ٹھیک ہوں اور کام بھی ہوگیا۔'' میں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''شکر......!'' کنیز نے ایک اطمینان بخش طویل سانس لیتے ہوئے کہا پھر بولی۔

''سب سے پہلے تم باس کو اپنے کام کی رپورٹ دو باقی باتیں پھر ہوں گی۔''

''ہاں میں وہی کرنے جارہا ہوں۔ میرا موبائل فون گھر پر ہی ہے، باس نے فون ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میں اپنے روم میں آگیا۔ میرا فون یہاں چارجنگ پر لگا ہوا تھا اب یہ کام کنیز یا اکرم ہی کا ہوسکتا تھا۔

میں نے فون سے تار نکالا اور باس کا وہ خاص نمبر پش کیا جو انہوں نے مجھے بطور خاص موقعوں پر استعمال کرنے کے لیے ہی دیا تھا۔

پہلی ہی بیل پر باس نے فون ریسیو کرلیا اور پوچھا۔

''یس......شمروز کیا رپورٹ ہے۔''

''ایوری تھنگ از اوکے باس۔'' میں نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''گڈ، ویری گڈ۔'' اس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تم ٹھیک تو ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔'' اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے مجھے کیسا ہونا چاہیے۔'' میں نے الٹا اس سے سوال کرڈالا۔

''میرا خیال تو یہ ہے کہ تم بالکل فٹ فاٹ ہو گے۔ تمہارا انتخاب یوں ہی تو نہیں کیا تھا۔'' اس نے پھر چہک کر کہا۔

''اس اعتماد کا شکریہ باس۔ آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ۔''

''گڈ، ویری گڈ۔'' اس نے اپنا تکیہ کلام دہرایا پھر بولا۔ ''اگر تم کچھ ریسٹ کرنا چاہو تو ریسٹ کرو پھر آج شام ہی پانچ بجے مجھے کلفٹن والی کوٹھی پر ملو۔ نواب صاحب بھی تم سے وہیں ملیں گے۔''

''اوکے باس میں پانچ بجے پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''وقت کا خیال رہے شمروز، پانچ بجے کا مطلب ٹھیک پانچ بجے ہی ہوتا ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں ہر بات کو یاد رکھتا ہوں باس۔ آپ کو یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے بھی ہر بات فرسٹ اینڈ لاسٹ ہی ہوتی ہے۔'' میں نے خاصے اعتماد سے کہا۔

''اوکے اینڈ دیٹس آل۔'' آغا قزلباش نے کہا اور لائن ڈسکنکٹ ہوگئی۔

فون جیب میں رکھ کر میں کمرے سے باہر آگیا۔ وہ تینوں میرے ہی منتظر تھے۔ میں نے مختصراً انہیں بتایا کہ میں نے اپنا مطلوبہ ہدف مکمل کرلیا ہے اور باس مجھ سے بہت خوش ہیں اور آج شام کو پانچ بجے مجھے دوبارہ کلفٹن والی کوٹھی پر بلایا ہے۔

میں نے سب کے ساتھ مل کر ناشتا کیا ناشتے کے بعد کلیم اور جعفر تو چلے گئے کنیز کو بھی جانا تھا وہ اپنے روم میں تیار ہونے چلی گئی تو میں اپنے روم میں آگیا اور اکرم کو خاص ہدایت کی کہ میں سونے جارہا ہوں مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے جاگ جاؤں گا تو خود ہی باہر آجاؤں گا۔

میں نے اپنے روم کا دروازہ بند کیا اور بیڈ پر دراز ہوگیا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی پھر سے وہ سارے سوالات میں نے اپنے دماغ میں تازہ کرلیے۔ سب سے پہلے میں نواب سطوت الاسلام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دیکھنے میں ان کی پرسنالٹی واقعی نوابوں والی تھی۔ مگر انہوں نے جو کہانی سنا کر مجھے عمران سردار کو مارنے کے لیے کہا تھا وہ سب مجھے جھوٹ لگ رہا تھا دوسری بات یہ کہ آغا قزلباش اس کے آگے کیوں بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

پھر مجھے عمران سردار کی بات یاد آئی کہ اس نے کسی غضنفر کا نام لیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ آغا قزلباش تو اس کا پالتو کتا ہے اصل آدمی تو غضنفر ہے اور غضنفر اس کا چچا ہے۔ اس نے اس کے باپ یعنی اپنے بھائی کو بھی مروایا اور اب جائیداد کے تنہا وارث عمران سردار کا بھی صفایا کروادیا۔

یہ غضنفر کون ہے؟ کہیں نواب سطوت الاسلام اور غضنفر ایک ہی شخصیت تو نہیں۔ عمران سردار نے جب مجھے یہ بتایا کہ کسی غضنفر نامی شخص نے اسے مروانے کے لیے کوئی آدمی بھیجا ہے تو یہ بات عمران سردار کو کس نے بتائی کہ کوئی شخص اس کی جان لینے کے لیے آرہا ہے۔

کیا آغا قزلباش ایسا کرکے میری آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ یا پھر آغا قزلباش کے گروہ میں ایسا کوئی خاص مخبر ہے جو ساری باتیں باس کے دشمنوں تک پہنچاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو باس کو اس بات کی اطلاع ہونی چاہیے۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ عمران سردار سے بیٹھ کر بات کروں مگر اس کے احمق ساتھی نے مجھے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا اور مجھ پر چھلانگ لگادی۔ میرے پاس کوئی موقع نہیں تھا اگر میں اپنی جان بچانے کے لیے انہیں نہ ہلاک کرتا تو وہ میری جان لے لیتے۔

خیر شام کو جب باس سے ملاقات ہوگی تو میں یہ

ساری باتیں ڈسکس کروں گا۔ میں نے سوچا اور میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو میں گہری نیند سو گیا۔

بہت گہری نیند سو رہا تھا تب سوتے میں میں نے عشاء کو خواب میں دیکھا۔

آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر یکایک بہت تیز بارش ہونے لگی۔ میں تنہا کھڑا اس بارش میں بھیگ رہا تھا۔ مجھے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ میں اس تیز بارش سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کر رہا تھا لیکن اندھیرا بہت تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کہاں جاؤں کیا کروں۔ اچانک بارش رک گئی اندھیرا چھٹ گیا۔ ہر جانب اجالا پھیل گیا میری نگاہوں کے سامنے دور دور تک سبزہ ہی سبزہ تھا دھلا دھلا سا سبزہ لائن سے خاموش کھڑے تناور درخت تھے اور ان درختوں کے درمیان وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی میری جانب آ رہی تھی۔ پھر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ درخت خوشی سے جھومنے لگے۔ میں مسرت آمیز حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"عشاء!" میرے لبوں سے سرگوشی سی نکلی۔

"ہاں میں!" وہ ایک ادا سے اٹھلائی۔ میں اس کے حسین اور ملیح چہرے کی خوب صورتی میں کھو سا گیا۔ اس کے رخساروں میں انار سے دہک رہے تھے۔ جھیل جیسی آنکھوں میں ننھے منے روشن دیے تیر رہے تھے۔ گلاب کی پتیوں جیسے لب شبنم سے بھیگے بھیگے دکھائی دے رہے تھے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" اس نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم اچانک کہاں سے آ گئیں۔" میں نے آگے بڑھ کر بڑی نرمی سے اسے تھام لیا۔ اس کے شبنم سے بھیگے لبوں سے شبنم کے سارے قطرے چن لیے۔ اس کا انداز سپردگی لیے ہوئے تھا۔

"تم کہاں چلی جاتی ہو مجھے اکیلا چھوڑ کر۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میں تو ہمیشہ سے آپ کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔ آپ ہی تو میرے شریک حیات ہیں کیا آپ نے کبھی موتیے کی مہک میں مجھے محسوس نہیں کیا......؟" اس نے مصنوعی روٹھے روٹھے لہجے میں پوچھا۔

"موتیے کی مہک؟" میں نے حیرانی سے دہرایا۔

"ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "چاندنی راتوں کی ٹھنڈک اور صبح دم چلنے والی ہواؤں میں اور جب تپتی دوپہروں میں برسات کے بادل چھا جائیں تو آپ مجھے اپنے پاس محسوس کریں گے میرے ہم دم۔"

"لیکن میں تو یہ سب بھول چکا ہوں۔ موتیے کی مہک، چاندنی راتیں، برسات میں چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں۔" میرے لبوں سے کراہ سی نکل گئی۔

"یقیناً بھول گئے ہوں گے کیونکہ آپ کے ہاتھ دوسروں کے لہو سے رنگ گئے ہیں۔ آپ کے اردگرد لہو ہی لہو ہے۔ آپ کو موتیے کی مہک کہاں محسوس ہوگی۔ آپ تو تپتے ہوئے صحرا میں ننگے پاؤں چل رہے ہیں اور صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر آپ کے پاؤں میں آبلے تو پڑ سکتے ہیں۔ پیاس سے آپ کا حلق چیخ تو سکتا ہے لیکن آپ چاندنی راتوں کی ٹھنڈک اور برسات کی ٹھنڈی ہوا کو نہیں محسوس کر سکتے۔" یہ کہتے ہوئے وہ تڑپ کر میری بانہوں کے حصار سے نکل گئی اور بھاگتی ہوئی ایک جانب چل دی اور میں بے بسی سے ہونٹ کاٹتا ہوا اسے خود سے دور جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر وہ میری نگاہوں سے دور ہو گئی اور ہر جانب گھور اندھیرا چھا گیا۔ میری سانسیں

بند ہونے لگیں۔ دم گھٹنے لگا۔ حلق خشک ہو گیا اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

میرا سارا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھی۔ میں نے سائڈ ٹیبل سے جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں ختم کر دیا گلاس رکھ کر میں تھکے تھکے انداز میں دوبارہ تکیے پر گر پڑا۔

میں اس خواب کو دیکھ کر بے حد پریشان ہوا۔ یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میری زندگی نے مجھے جن راہوں پر دھکیل دیا ہے وہاں صرف صحرا ہی صحرا ہے خاردار جھاڑیاں ہیں، کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ محبت تو ایک لطیف جذبہ ہے جو دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے تو اس میں سے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ انسان کے چاروں اطراف میں رنگ، روشنی اور خوش بو ہوتی ہے۔

لیکن میرے دل میں تو صرف نفرت ہے انتقام ہے مجھے نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری اور میرے خاندان کی تباہی کا ذمہ دار اس دنیا کا ہر فرد ہے مجھے کسی سے بھی محبت نہیں ہے۔ میرے دل میں تو صرف نفرت اور انتقام پل رہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ نفرت کی اس آگ میں جھلستے جھلستے میں ایک دن ختم ہو جاؤں گا۔ پھر عشاء کیوں میرے خوابوں میں چلی آتی ہے۔ رنگ و خوش بو کی باتیں کرتے اس نے مجھ سے ابھی تو کہا تھا کہ تم بیلے کے پھولوں کی مہک کو محسوس کر ہی نہیں سکتے کیونکہ تمہارے ہاتھوں سے لہو کی بو آتی ہے۔

"ہاں میں قاتل ہوں۔" میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ کر کہا۔

"میں سب کو مار ڈالوں گا۔ ختم کر دوں گا۔ میری زندگی میں کسی کی محبت کی گنجائش نہیں ہے۔ اپنی زندگی سے میں نے محبت کے پنے کو ہی پھاڑ ڈالا ہے۔ شمروز کا دوسرا نام ہی نفرت اور انتقام ہے۔" میں نے زور سے بیڈ پر ہاتھ مارا، پھر بیڈ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے رکھی کرسی پر زور سے لات ماری اور اسے نیچے گرا دیا۔

تھوڑی دیر میں میرا اشتعال ختم ہو گیا اور میں نے تصور میں عشاء کو مخاطب کر کے کہا۔

"خبردار جو آئندہ میرے خواب میں آنے کی کوشش کی میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔"

میں اپنے طور پر مطمئن سا ہو گیا۔ حالانکہ میں یہ بات بھول گیا تھا کہ محبت کے جذبوں پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ کی نہیں جاتی خود بخود ہو جاتی ہے اندھا دھند دوڑتی ہوئی آتی ہے اور انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

میں نے دیوار پر لگے وال کلاک پر نگاہ ڈالی ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں شاور لینے کے لیے باتھ روم چلا گیا۔ مجھے پانچ بجے کلفٹن باس کی کوٹھی پر پہنچنا تھا۔ شاور لے کر باہر آیا تو الماری سے شلوار قمیص کا کھدر کا سوٹ نکال لیا۔ میرے گیٹ اپ پر گھیردار شلوار اور قمیص ہی اچھے لگتے تھے۔

تیار ہو کر میں باہر آیا تو اکرم سے کچھ کھانے کے لیے لانے کو کہا۔ کھانا کھا کے فارغ ہوا تو اچھا خاصا وقت صرف ہو چکا تھا۔ مجھے پانچ بجے تک کلفٹن پہنچنا تھا۔ اس لیے میں نے گاڑی کی اسپیڈ تیز کر دی اور کلفٹن کی جانب روانہ ہو گیا۔ آفیسز کی چھٹی کا ٹائم ہو گیا تھا اس لیے روڈ پر ٹریفک کا رش بھی بڑھ گیا تھا۔ میری نگاہیں ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

میری زندگی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ اس کو تبدیل ہونے میں زیادہ وقت بھی نہیں لگا تھا۔ بلاشبہ میں ایک مجرم تھا جرائم پیشہ لوگوں کا ساتھ اپنایا تو مجرم بن گیا۔ میں جو معصوم صورت لیے دنیا میں آیا تھا

معصومیت کی آغوش میں پرورش پائی اور زندگی کے بہت سے سہانے سپنے لے کر بچپن کی حدود پھلانگی۔ میرے سنہرے خواب میری آنکھوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بہت سی اچھی توقعات کے قلعے جن کا عکس میری آنکھوں سے عیاں تھا۔ امنگوں بھری جوانی کے ہجوم میں داخل ہوا پھر میں نے اپنے آدھے خوابوں کی تعبیر پا بھی لی لیکن پھر میری زندگی میں کچھ ایسے نامساعد حالات آئے کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھا جرائم کی جس دنیا میں میں قدم رکھ چکا تھا ان کا تو نام و نشان بھی میری سوچوں میں دور دور تک نہیں تھا۔ ایک ڈاکٹر بن کر میں نے شاید یہ سوچا تھا کہ دنیا میرے قدموں تلے آ گئی ہے۔ مگر دنیا نے ہی مجھے اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔

ہوسکتا ہے کہ میری اس کہانی کو پڑھنے والے کسی اور شخص کی زندگی میں بھی ایسے حادثات رونما ہوئے ہوں۔ وہی ایک شخص میرے احساسات اور میری کیفیت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے اور جو خوش نصیب اس کیفیت سے ناآشنا ہیں میری دعا ہے کہ وہ کبھی ان حالات کا شکار نہ ہوں۔

میرے بدترین حالات کے بھیانک اور زہریلے سانپوں نے جب مجھے چاروں جانب سے گھیر لیا وہ میرے سامنے پھن لہراتے رہے۔ میں جب تک ان سانپوں کا مقابلہ کرسکتا تھا کیا۔ پھر میں بے بس ہوگیا۔ بے بسی کی سوچ عموماً انسان کو غلط راستوں پر ہی لے جاتی ہے۔ میں نے بھی جرائم کی دنیا میں پناہ لے لی۔ آخر زندگی کو کسی ڈھب پر تو لانا تھا۔ تو کیوں نہ ان راہوں کا انتخاب کرتا قصور میرا بھی نہیں تھا دنیا میں شریف اور شرافت کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ یہاں بدمعاش بن کر رہنا زیادہ آسان ہے۔ دنیا شاید مجھے اس راستے پر لانا چاہتی تھی اس لیے میں ان لوگوں کا ساتھی بن گیا۔ جس وقت انسان برے راستوں میں قدم رکھتا ہے تو اس وقت بہت سی آسانیاں اس انداز میں فراہم ہوجاتی ہیں کہ پھر وہ راستے برے نہیں لگتے یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

اچانک خود بخود میرے پاؤں کا دباؤ بریک پر بڑھ گیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو میں اپنی سوچوں کے حصار سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے آپ کو آغا قزلباش کی کوٹھی کے سامنے پایا۔ میں نے کلائی پر بندھی اپنی ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو پانچ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ گویا میں بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ہارن بجایا تو خودکار گیٹ کھلتا چلا گیا۔ اس مرتبہ گارڈ نے آ کر مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کی شاید اسے میری آمد کے بارے میں پہلے سے انفارم کردیا گیا تھا۔ میں گاڑی اندر لے گیا اور تیزی سے اتر کر اندر کی جانب قدم بڑھائے اندر والے دروازے پر بھی اسلحہ بردار گارڈ موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا اور ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا میں اندر داخل ہوگیا۔

یہ وہی نشست گاہ تھی۔ جہاں پہلے بھی میری ملاقات آغا قزلباش اور نواب سطوت الاسلام سے ہوئی تھی۔ اس وقت یہ کمرہ خالی تھا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پانچ بجنے میں ابھی ایک منٹ باقی تھا اور ٹھیک پانچ بجے دروازہ کھلا اور کوٹھی کے اندرونی حصے سے آغا قزلباش اور نواب صاحب اندر آئے۔

میں نے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔ دونوں مسکرا دیے تھے۔ نواب سطوت الاسلام نے چہکتے ہوئے کہا۔

”ویلکم جوان تم نے ہمارا دل خوش کردیا۔“

”شکریہ نواب صاحب!“ میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

”بھئی آغا تم شمروز کو مجھے دے دو۔“ نواب صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آغا قزلباش کو مخاطب کیا۔

”بالکل لے لیجیے میری طرف سے اجازت ہے۔“ آغا نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہم تمہارے کام سے بہت خوش ہوئے ہیں شمروز تم نے مقررہ وقت پر اپنا کام بہت بہترین طریقے سے پورا کیا ہے۔ ہمیں تمہارے جیسے ہی جوانوں کی تلاش رہتی ہے۔ یقین مانو ہم بہت قدر دان ثابت ہوں گے۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”آپ شرمندہ کررہے ہیں۔ میں نے تو آپ کا کام اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ آپ خوش ہیں تو مجھے صلہ مل گیا۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

”آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ نواب صاحب نے کہا اور مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔

”ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں۔ دراصل مجھ کو ایک بات نے الجھن میں ڈالا ہوا ہے۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”تم بلاجھجک پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”یہ غضنفر کون ہے؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

میری بات سن کر وہ دونوں چونک پڑے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد نواب صاحب نے پوچھا۔

”تم غضنفر کو کیسے جانتے ہو؟“

”جس وقت میں عمران سردار کو مارنے والا تھا تو اس نے یہ نام لیا تھا کہ وہ اس کا چچا ہے اور وہ اس کی جائیداد ہتھیانا چاہتا ہے۔ اس نے ہی اس کے باپ سردار کو مروایا تھا۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

”الو کا پٹھا۔ مرتے مرتے بھی بکواس کرگیا۔“ نواب صاحب نے کہا پھر دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ میری نگاہیں بار بار دونوں کے چہروں کے تاثرات نوٹ کررہی تھیں۔

”آپ نے بتایا نہیں نواب صاحب، آپ جانتے ہیں کسی غضنفر کو اور ہاں انہیں پہلے سے ہی اس بات کا علم تھا کہ کوئی عمران سردار کی جان لینا چاہتا ہے اور آرہا ہے۔ اس لیے وہ پہلے سے ہی الرٹ تھے اور یہی وجہ تھی کہ وقتی طور پر ان لوگوں نے مجھ پر قابو پالیا اور قید کردیا لیکن میں زیادہ دیر تک ان کی قید میں رہا نہیں اور اپنا کام کر کے لوٹ آیا اور عمران سردار کے ساتھ ساتھ اس کے چار پانچ بندوں کا بھی صفایا کرڈالا۔“ میں نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں اس بات کا علم ہوچکا ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ ہمیں کیسے علم ہوا تو بھئی سارے نیوز چینل پر صبح سے یہ خبر آرہی ہے اس کے علاوہ ایک بہت اہم اور اچھی خبر یہ ہے کہ پولیس یہ سمجھ رہی ہے کہ عمران سردار کو اس کے اپنے گارڈ نے گولی ماردی ہے کیونکہ وہ پستول گارڈ کے ہاتھ میں ہی تھا جس کی گولی سے عمران کی موت واقع ہوئی ہے۔ تم نے یہ کام کر کے اپنی بہترین دماغی صلاحیت اور ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے۔“

نواب صاحب ایک بار پر غضنفر کا ذکر گول کرگئے مگر میں اپنی الجھن کا کیا کرتا اس لیے پھر سوال کرڈالا تب ایک بار پھر میرے منہ سے یہ سوال سن کر نواب صاحب کے چہرے پر خفگی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بولے۔

”تمہیں جو کام کرنے کے لیے دیا جائے صرف اس سے مطلب رکھو ادھر ادھر کی فضول سوچوں میں اپنا دماغ مت خرچ کرو۔“

”اگر آپ کے خیال میں میرا دماغ بہترین ہے تو اس طرح کے سوالات تو اس میں اٹھیں گے اور جب تک مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملے گا۔ میں الجھن کا شکار رہوں گا۔“ میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”گولی مارو اس کو، ہو گا کوئی، ہمیں اس سے کیا۔“ آغا قزلباش بولا تو وقتی طور پر خاموش ہو گیا۔ پھر نواب نے کہا۔

”شمروز آج رات اس کوٹھی میں ایک پارٹی ہے اس میں شہر کے بہت سے معززین شرکت کریں گے اور تم بھی اس پارٹی میں انوائٹڈ ہو اور اب آج سے تمہیں گلشن والے اس فلیٹ میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تم ہمارے ساتھ رہو گے۔“

”لیکن کہاں؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”ہمارے ساتھ اور کہاں۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”کیا آپ مجھے اپنا باڈی گارڈ بنانا چاہتے ہیں۔“ میں نے زیر لب مسکرا کے پوچھا۔

”اگر اس کی ضرورت پڑی تو ہم ایسا بھی کریں گے۔ لیکن فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تم سے اور بھی دوسرے کام لینے ہیں۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”مثلاً کچھ ارشاد فرمایئے۔“ میں نے کہا۔

”بھئی شمروز تم بولتے بہت ہو اور بولتے کیا ہو سوالات بہت کرتے ہو، میری ایک بات یاد رکھنا کہ بعض اوقات بہت سے سوالات انسان کو بہت سی مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ کہتے ہیں نا انجان آدمی بہت مطمئن رہتا ہے۔ لیکن آگہی انسان کو عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔“ نواب صاحب نے بڑی گہری بات کہہ کر مجھے خاموش کر دیا۔

پھر وہ دونوں آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ میں خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سننے لگا۔ ان کی باتوں سے مجھے انداز ہوا کہ وہ کوئی بہت اہم باتیں کر رہے ہیں۔ مگر بہت احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کر رہے تھے۔ وہ ایسی باتیں تھیں جنہیں وہی آپس میں ہی سمجھ سکتے تھے۔ وہ اشارتی زبان استعمال کر رہے تھے۔ بات کرتے کرتے نواب کا رخ ایک بار پھر میری جانب ہو گیا اور بولے۔

”یار آج رات پارٹی میں آنے سے پہلے تم ذرا اپنا یہ حلیہ درست کرا لو یہ جو تم نے جنگلیوں کی طرح اتنے بڑے بال رکھے ہوئے ہیں انہیں کٹواؤ اور اپنے چہرے سے یہ داڑھی مونچھیں صاف کرو۔ اچھی خاصی شکل کو تم نے بگاڑ رکھا ہے۔“

”لیکن جناب وہ سردار شیر افضل۔“ میں نے گھبرا کے آغا قزلباش کی جانب دیکھا۔

”تم اس سے ڈر رہے ہو۔“ نواب صاحب نے تحقیر زدہ لہجے میں کہا۔ ”اب تم نواب سطوت الاسلام کی پناہ میں ہو، اس کے آدمی ہو، کسی کی مجال ہے جو تمہاری جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ نواب اس کی آنکھیں نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔“ یہ بات کہتے ہوئے نواب صاحب کا لہجہ ایسا ہو گیا کہ میں لمحہ بھر کو سکتے میں آ گیا۔ یہ لہجہ کسی عام آدمی کا تو نہیں تھا۔

”بہت شکریہ نواب صاحب۔“ میں نے نیاز مندی سے کہا۔ ”لیکن مجھے اس کمینے اور ذلیل شخص سے اپنا حساب چکانا ہے اس نے میرے......!“

”ہم سب سن چکے ہیں...... آغا ہمیں تمہارے بارے میں ساری تفصیلات سے آگاہ کر چکا ہے۔“ نواب صاحب نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو اپنا بدلہ لینے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا اور تمہیں ایک اور بات بتاؤں آج رات کی پارٹی میں سردار شیر افضل بھی آنے والا ہے

اور میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی اصل شکل میں اس کے سامنے آؤ۔ تمہیں میرے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے۔“

”اگر اس نے مجھے پہچان لیا تو......!“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”بڑا مزا آئے گا تم دیکھتے تو جاؤ، مجھے سردار شیر افضل سے ایک دو کام نکلوانے ہیں وہ ہو جائیں تو تمہیں بھی موقع دیا جائے گا اپنے دل کی بھڑاس نکال لینا۔“ نواب صاحب نے ایک گہری اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ آغا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو آپ بہتر سمجھیں۔“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ فی الحال میرے لیے کیا حکم ہے۔“

”تم چاہو تو آرام کرو۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں اپنا مختصر سا سامان جا کر لے آتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اگر تمہارا کوئی ضروری سامان ہے تو وہ منگوایا جا سکتا ہے ورنہ تمہیں تمہاری ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ تم یہاں ایک کمرے میں جاؤ، ابھی ایک بندہ آ کر تمہارا حلیہ درست کر دے گا اور تمہارا نیا ڈریس بھی آ جائے گا۔“ نواب صاحب نے کہا اس دوران آغا قزلباش بیٹھا مسکراتا رہا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ نواب سطوت الاسلام مجھ پر اتنا زیادہ مہربان کس لیے ہو رہا ہے۔ آخر یہ مجھ سے ایسا کون سا کام نکلوانا چاہتا ہے اور حیرت تو مجھے آغا قزلباش پر ہو رہی تھی جس کا غیظ و غضب میں دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت نواب کے سامنے کیسا بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا۔ آخر یہ نواب ہے کیا شے۔

آغا قزلباش نے کسی کو آواز دی تو ایک بندہ اندر آیا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ایک کمرے کے دروازے پر جا کر رک گیا اور بتایا کہ میں اس روم میں آرام کر سکتا ہوں۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک کشادہ اور قیمتی سامان اور فرنیچر سے آراستہ کمرہ تھا۔ ایک جہازی بیڈ کے علاوہ سامنے ٹرالی پر ایک ٹی وی بھی موجود تھا۔

میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ تب ہی میری نگاہ سائڈ ٹیبل پر رکھے ٹی وی کے ریموٹ پر پڑی میں نے ریموٹ ہاتھ میں لے کر ٹی وی آن کر دیا۔

میں چینل بدل رہا تھا کہ خود بخود چینل بدلتے بدلتے میرا ہاتھ رک گیا۔ ایک چینل پر ایک ہوش ربا حسینہ بڑا ہیجان خیز رقص کر رہی تھی۔ جس نے لباس بھی مختصر پہن رکھا تھا

وہ شاید کوئی انڈین چینل تھا۔ میں اس لڑکی کو جس کے نام سے میں واقف نہیں تھا شاید اس لیے کہ پہلے مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی بہت حسین شکل اور جسم کی مالک تھی۔

رقص ختم ہوا تو میں نے چینل بدل دیا پھر ٹی وی بند کر کے دونوں ہاتھ سر کے نیچے تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ میں نواب کے بارے میں سوچنے لگا لیکن بہت سوچنے پر بھی میں اس کی شخصیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

شام تک کا وقت میرا بہت مصروف گزرا ایک شخص اپنے ساز و سامان کے ساتھ ایک بار پھر میرے سامنے تھا۔ اس نے میری بدلی ہوئی شخصیت کو میرا پرانا روپ دے دیا۔ بلکہ اس سے بہتر لک ہی دے دیا۔ مکمل تیار ہونے کے بعد میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ میں تو اپنی اصلی شکل بھولنے لگا تھا۔ پرانے والے حلیے میں ایک غنڈہ، بدمعاش دکھائی دیتا تھا لیکن اب میں پھر سے ایک ایجوکیٹڈ اور ڈیسنٹ بندہ دکھائی دے رہا تھا۔

آغا قزلباش اور نواب صاحب کو میں باتوں میں مصروف چھوڑ آیا تھا دوبارہ مجھے ان کی صورت دکھائی

نہیں دی تھی۔

میں تیار ہو کر اسی کمرے میں بیٹھا رہا کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ ایک ملازم سے پوچھا تو اس نے مودب لہجے میں کہا کہ آپ یہیں بیٹھ کر انتظار کریں نواب صاحب آپ کو خود بلوائیں گے۔ سو میں بیٹھا ٹی وی سے دل بہلا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اس طرح سجا سنوار کر پارٹی میں لے جانے کے پیچھے نواب صاحب کا کیا مقصد پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ نواب صاحب کے دل میں میرے لیے پدرانہ شفقت تو جاگ نہیں سکتی۔ یقیناً یہ مجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا تھا اور وہ کام کیا تھا یہ میں ابھی نہیں جانتا تھا۔

مجھے تیار ہونے کے بعد پورا ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تب وہی ملازم دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور مجھ سے کہا کہ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔ نواب صاحب نے مجھے بڑے ہال میں بلایا ہے۔

"یہ بڑا ہال کس طرف ہے۔" میں نے اس سے پوچھا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چل دیا۔

میں نے کوٹھی کا یہ حصہ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جو ایک گرینڈ پارٹی کے لحاظ سے سجایا گیا۔ ایک جانب میوزک بینڈ تھا بہترین لائٹنگ تھی ایک دوسری جانب بار بنایا گیا تھا۔ ٹیبل اور کرسیاں بھی تھیں لیکن زیادہ تر لوگ ہاتھوں میں اپنے پسندیدہ مشروبات لیے جو باوردی ویٹرز سرو کر رہے تھے ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے۔ اعلیٰ قسم کے صوفے سیٹ بھی تھے۔

ملازم مجھے ہال کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر سارے ہال پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ نواب صاحب مجھے ایک صوفے پر بیٹھے دکھائی دیے۔ وہی اپنے روایتی ڈریس سفید کلف دار کرتے اور پاجامے میں ملبوس۔ منہ میں پان تھا جسے وہ بڑی نفاست کے ساتھ کھا رہے تھے۔ پاس ہی اس کے پانوں کی ڈبیا اور کپڑے کا بٹوا رکھا تھا۔

میں کھڑا ابھی جائزہ ہی لے رہا تھا کہ نواب صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے نزدیک بلایا تو میں مسکراتا ہوا ان کی جانب بڑھ گیا۔ آج میری چال میں عجیب طرح کی خود اعتمادی تھی۔ مجھے وہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ بالکل ایسا جیسے میں اپنی پرانی جون میں لوٹ آیا ہوں۔

"ارے بھئی شمروز تم وہاں کیوں کھڑے ہو یہاں آ کر میرے پاس بیٹھو۔" نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں ان کے نزدیک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہیں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے جن سے نواب صاحب محو گفتگو تھے۔ میں گیا تو سب خاموش ہو کر میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میں ان کے لیے اجنبی تھا۔ اس لیے نواب صاحب کی جانب اٹھتی ہوئی نگاہوں میں میرے لیے سوال تھا۔

"آپ سب ان سے ملیں یہ شمروز ہیں ہمارے رشتہ دار ہی ہوتے ہیں حال ہی میں امریکہ سے آئے ہیں ڈاکٹر ہیں۔" حیرت انگیز طور پر نواب صاحب نے میرا تعارف ڈاکٹر کہہ کر کرایا۔ پھر نواب صاحب نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتایا کہ وہ کون کون ہیں۔ وہاں موجود ایک صاحبہ جن کا تعارف نواب صاحب نے بیگم درانی کہہ کر کرایا تھا مجھ سے بولیں۔

"آپ لگی ہیں کہ نواب صاحب سے آپ کی رشتہ داری ہے ہمیں تو نواب صاحب کا دیدار ہی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔"

میں دل ہی دل میں سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ نواب صاحب میں آخر ایسی کون سی خاص بات ہے کہ ان کے دیدار کو اپنی خوش نصیبی سمجھا جائے۔ یہ بات بھی نواب صاحب کے اگلے جملے سے میری سمجھ میں آ گئی۔

"بیگم درانی کا سارا خاندان ابا حضور کا مرید ہے ابا حضور کے بعد ہماری دستار بندی ہوئی تو یہ ہماری معتقد ہیں۔"

میں نے مسکرا کے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا پھر لوگ آتے گئے نواب صاحب اپنی جگہ پر بیٹھے رہے لوگ ان کے نزدیک آتے ان کے ہاتھوں کو چومتے آنکھوں سے لگاتے اور پیچھے ہٹ جاتے۔ پارٹی میں مجھے آغا قزلباش بھی دکھائی دیا۔ لیکن وہ میرے نزدیک نہیں آیا تھا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ میں نواب صاحب کے ساتھ صوفے پر ہی بیٹھا تھا۔ ایک ویٹر میری جانب بھی مشروبات سے بھری ٹرے لے کر آیا تو میں نے پائن ایپل کا گلاس اٹھا لیا اور ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔

لوگ اپنے اپنے شناسا چہرے دیکھتے تو باتوں میں مصروف ہو جاتے۔ میں اور نواب صاحب لمحہ بھر کو تنہا ہوئے تو نواب صاحب نے مجھے اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کیا وہ کچھ کہنا چاہتے تھے میں نے اپنا کان ان کے منہ کے قریب کر دیا تو وہ بولے۔

"ابھی یہاں ایک خاتون آنے والی ہیں۔ رشنا نام ہے اس کا وہ سیدھی میری جانب آئے گی۔ میں تمہارا اس سے تعارف اپنا بھتیجا کہہ کر کراؤں گا۔ تمہیں اس کے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہوگا اور ایسی کمپنی دینی ہوگی کہ وہ تم سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کرے فی الحال تم اس سے دوستی کرو اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے ہم تمہیں بعد میں بتائیں گے۔ تمہاری اس سے دوستی ہمارے لیے بہت ضروری اور فائدہ مند ہے کر سکو گے ایسا۔"

"کوشش کروں گا۔" میں یہ عجیب سا حکم سن کر بوکھلا گیا۔

"یہ کیا کہا تم نے۔" انہوں نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "تمہارے منہ سے ایسے جملے اچھے نہیں لگتے۔ تم تو پرفیکٹ کام کرنے والے بندے ہو۔ تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ "سمجھیں کام ہو گیا۔"

"بہتر نواب صاحب سمجھیں کام ہو گیا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ ہوئی ناں دل خوش کرنے والی بات۔" وہ خوش ہو کر بولے اور پھر ایسا لگا جیسے ہال میں جلنے والے برقی قمقموں کی روشنی مزید تیز ہو گئی ہو۔ ہر جانب قوس قزح بکھر گئی ہو۔ وہ بڑی سبک خرامی سے چلتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی تھی۔

"یہی ہے رشنا۔" نواب صاحب نے سرگوشی کی۔

ہر نگاہ اس ظالم حسینہ کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ مگر وہ ہر ایک کو یکسر نظر انداز کر کے سیدھی نواب صاحب کی جانب آ رہی تھی۔

وہ نزدیک آئی تو اس کے حسن بلا خیز سے نگاہیں چندھیا گئیں۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی مہین نازک سے کام والی ساڑھی زیب تن کی ہوئی تھی۔ گورے اور گداز بازو برہنہ تلوار کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ مختصر اور کشادہ گریبان کے بلاؤز میں اس کا جسم ہیجان خیز نظارے دے رہا تھا۔ وہ نواب صاحب کے نزدیک آئی اور جھک کر آداب بجا لائی۔ اس کے جھکتے ہی اس کے حسن نے اپنے رازوں سے آگاہ کر دیا اور میرے دل کی دھڑکن کئی گناہ بڑھ گئی۔ نواب صاحب کی آنکھوں میں بھی مے کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے مسکرا کر بل کھاتے ہوئے نواب صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"سفر کیسا رہا رشنا؟ ہم نے کہیں تمہیں مصروفیات

میں ڈسٹرب تو نہیں کیا۔" نواب صاحب نے پوچھا۔

"ارے نہیں نواب صاحب میرے پاس آغا قزلباش کا فون آیا تھا اور اسی نے مجھے آپ کا پیغام دیا تھا۔ اب بھلا آپ کی دعوت کے آگے میری مصروفیات کی کیا اوقات ہے۔ میری ہزاروں مصروفیات آپ کے ایک بلاوے پر قربان ہیں۔" اس نے مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔

اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے میں نے کہیں دیکھا ہے۔ اس کی صورت دیکھی ہوئی لگ رہی تھی۔ مگر کہاں دیکھی ہے یاد نہیں آ رہا تھا۔

نواب صاحب اس سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد چونک کر بولے۔ "ارے لو میں تمہارا شمروز سے تعارف کروانا تو بھول گیا۔" تو وہ میری جانب متوجہ ہوگئی۔

"یہ شمروز ہے میرا بھتیجا امریکہ سے ڈاکٹر بن کے لوٹا ہے بس یوں سمجھ لو کہ آج کی یہ گرینڈ پارٹی اسی کے آنے کی خوشی میں دی ہے اور شمروز یہ رشنا دیوی ہے۔ بھارتی فلم انڈسٹری کی بہترین ڈانسر ہے۔ جس فلم میں ان کا آئٹم سونگ ہوتا ہے سمجھو وہ فلم ہٹ تو ہو ہی گئی۔

تب ہی میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا ہوا اور مجھے یاد آیا کہ آج ہی ٹی وی پر میں نے اسے دیکھا تھا۔ جو بہت مختصر لباس میں ہیجان خیز رقص کر رہی تھی۔ دوران رقص اس کا ایک ایک عضو اپنا تعارف خود کروا رہا تھا۔

میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس کے رقص کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنی جانب اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کوئی نئی بات نہیں ہے جو بھی تمہیں پہلی مرتبہ اپنے سامنے دیکھتا ہے اس کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔" نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں جھینپ گیا اور اپنی جھینپ مٹانے کے لیے جلدی سے اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد نواب صاحب نے کہا۔ "بھئی آج کی پارٹی کے لیے رشنا کو ہم نے بطور خاص بلایا ہے۔ یہ بہت بہترین رقص کرتی ہیں۔

اور پھر رشنا کے رقص نے جیسے ہر شخص کو مسحور کر دیا رقص ختم ہوا تو سازندے خاموش ہو گئے۔ ہر جانب سناٹا چھا گیا۔ میں نے تالی بجا کر ماحول کو جگایا اور پھر سارا ہال تالیوں کی داد اور تحسین سے گونج اٹھا۔

پھر کھانا شروع ہوا تو میں ٹہلتا ہوا رشنا کے نزدیک چلا گیا اور اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

"آپ کی اور انکل کی شاید پرانی جان پہچان ہے۔" میں نے کہا۔

"زیادہ پرانی تو نہیں پچھلے دنوں نواب صاحب کا انڈیا آنا ہوا تھا وہیں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ بھئی میں تو نواب صاحب کی باکمال شخصیت کے سحر کا شکار ہوگئی۔ اب جب انہوں نے بلایا تو میں کیسے نہ آتی۔" اس نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ صرف نواب صاحب کے بلاوے پر آئی ہیں یا کوئی اور بات بھی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"آئی تو نواب صاحب کے بلاوے پر ہوں لیکن میڈیا والے کہاں خاموش بیٹھیں گے اس لیے میری پاکستان آمد چھپ نہیں سکی۔ اس لیے پاکستان فلم انڈسٹری کے ایک مایہ ناز پروڈیوسر ہیں رانا شوکت مسعود صاحب وہ مجھے کئی دفعہ دعوت دے چکے ہیں۔ میں یہی ظاہر کر دوں گی کہ ان ہی کے بلاوے پر آئی ہوں۔ نواب صاحب یہ نہیں چاہتے کہ یہ بات کسی کو بھی معلوم ہو کہ میں نے آج شام ان کی پارٹی میں شرکت کی ہے۔

"ویسے ائرپورٹ پر ہی یہاں میڈیا والوں کو میری آمد کی اطلاع مل چکی ہے اور اس وقت میں سب سے چھپ کر یہاں آئی ہوں۔"

میں سب کچھ سمجھ گیا تھا میرے سامنے موجود رشنا دیوی جو بھارتی فلم انڈسٹری کی مایہ ناز رقاصہ تھی۔ اتنی معصوم اور انجان نہیں تھی کہ میں اسے اپنی جھوٹی محبت کے جال میں آسانی سے پھانس لوں گا۔ اس کا تعلق جس شعبے سے تھا اسے دن رات ایسے ہی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے لیکن میں نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ خود بھی میری ذات میں بہت دلچسپی لے رہی تھی اور اس کی اس دلچسپی کو میں نے قطعی یہ نہیں سمجھا کہ وہ میرے اوپر مرمٹی ہے جہاں تک میرا اندازہ تھا جس طرح کی ہدایات مجھے دی گئی تھیں ویسی ہی ہدایات اسے بھی ملی تھیں اور یہ سارا چکر کس لیے چلایا جا رہا ہے۔ اس جانب سے میں اندھیرے میں تھا۔

خیر مختصراً یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک دوسرے سے اس طرح گھل مل گئے جیسے برسوں پرانی جان پہچان ہو اور اس نے وہ بات کہہ دی جو میں کہنا چاہتا تھا۔ وہ بولی۔

"آج کل آپ زیادہ مصروف تو نہیں ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی خاص مصروفیات تو نہیں ہیں اور ویسے بھی آپ آ گئی ہیں تو مجھے اپنی مصروفیات کا شیڈول یکسر تبدیل کرنا پڑے گا۔"

"واقعی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے موتیوں کی لڑی جیسے جگمگاتے ہوئے دانت نمایاں ہو کر اسے اور بھی حسین بنا گئے۔

"ایسا ہے کہ کل شام تو رانا صاحب کے ہاں میرا ڈنر ہے۔ ہاں ڈنر کے بعد میں فارغ ہوں۔ تو پھر کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔" اس نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وائے ناٹ، لیکن کہاں۔ آپ آئیں گی یا میں آ جاؤں۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"کل میں ہوٹل سے نواب صاحب کی کوٹھی میں شفٹ ہو جاؤں گی۔ یہ نواب صاحب کا ہی اصرار ہے دو دن کے قیام کے بعد میری واپسی ہے۔ پھر وہیں ملاقات ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی کامیابی پر خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

"اوکے ہینڈسم۔" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے سراہتے ہوئے کہا۔ "اب مجھے جانا چاہیے کل رات ملاقات ہوتی ہے میں ذرا نواب صاحب سے مل لوں۔" وہ مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر نواب صاحب کی جانب بڑھ گئی۔

پارٹی کے اختتام پر نواب صاحب نے بتایا کہ یہ کوٹھی ان ہی کی ہے اور آج سے مجھے اسی کوٹھی میں ہی رہنا ہے۔ میرا کمرہ وہی ہے یہاں میں نے دن میں قیام کیا تھا۔ نواب صاحب نے مجھ سے تفصیل سے ایک ایک بات بھی پوچھی تھی جو میرے اور رشنا دیوی کے درمیان ہوئی تھیں۔ جب میں نے نواب صاحب سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ شاید وہ بھی کسی کی ہدایات کے پیش نظر مجھ سے دوستی بڑھانا چاہ رہی تھی اور کل رات اس کوٹھی میں اس نے مجھے اپنے بیڈ روم میں ملنے کے لیے بلایا ہے تو نواب صاحب کے لبوں پر بڑی گہری اور معنی خیز مسکراہٹ آ گئی اور وہ بولے۔

"میاں ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی عیش کرو گے۔" وہ یہ کہہ کر چلے گئے اور میں نواب صاحب کے بارے میں سوچتا ہی رہ گیا کہ یہ کس طرز کے سجادہ نشین ہیں۔ لوگ انہیں اپنا پیر و مرشد مانتے ہیں۔ ان کی نگاہیں عقیدت و احترام سے ان کے سامنے جھکی

رہتی ہیں اور یہ ہیں کہ......!

دوسرے روز رات کو میری ڈنر پر رشنا دیوی سے ملاقات ہوئی کھانے سے فارغ ہوتے ہی نواب صاحب یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ مجھے جلدی سونے کی عادت ہے تم لوگ گپ شپ کرو۔ میں اور رشنا دیوی تھوڑی دیر تک تو بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر وہ کھڑی ہوگئی اور مسکراتے ہوئے اپنی آنکھ کے اشارے سے بولی۔

''میں بہت تھک گئی ہوں کیوں نہ بیڈروم میں چل کر باقی کی باتیں کریں۔''

تو میں بھی اسی کے ساتھ بیڈروم میں چلا۔

رشنا دیوی کے ساتھ گزاری ہوئی وہ رات میری زندگی کی پہلی انوکھی رات تھی۔ وہ میرے لیے کھلا ہوا گلاب کا پھول بن گئی اور میں بھنورا بن کر ساری رات اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرتا رہا۔

صبح کے قریب رخصت ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ ''تم میری زندگی میں آنے والے سب سے مختلف مرد ہو۔ تمہارا ہر ہر انداز پاگل کردینے والا تھا۔ تم رومانس کرنا بھی جانتے ہو اور کروانا بھی۔''

میں اپنے روم میں آیا تو بہت خوش تھا زندگی کے جس رخ سے مجھے رشنا دیوی نے روشناس کرایا تھا۔ اس سے میں ابھی تک ناواقف ہی تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی کسی کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح پیش کردوں گا۔ یہ میری زندگی کی پہلی لغزش تھی اور پھر میں برائیوں کے اس گڑھے میں اس طرح سے گرتا چلا گیا کہ نکلنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔

لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا کہ کل کی پارٹی میں سردار شیر افضل بھی آیا تھا اور مجھے دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا بھی لگا تھا۔ لیکن میں نے اس پر ایک انجان نگاہ ڈالی اور پھر رشنا کی جانب متوجہ ہوگیا۔ جیسے اسے جانتا ہی نہیں مجھے دیکھنے کے بعد وہ نواب صاحب کے پاس بھی گیا تھا۔ شاید اس نے میرے بارے میں نواب صاحب سے کچھ پوچھا تھا یا نواب صاحب نے اسے خود ہی اپنا بھتیجا کہہ کر تعارف کروایا تھا لیکن وہ مطمئن نہیں تھے۔ مجھے اس کے چہرے پر مسلسل الجھن کے آثار دکھائی دیے۔ وہ بار بار الجھن آمیز نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ رشنا سردار شیر افضل سے بات کرنے کے لیے بڑھی تو میں اپنی کھانے کی پلیٹ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس وقت مجھے نواب صاحب کا ساتھ نہ ملا ہوتا تو اس وقت سردار شیر افضل میرے ساتھ کس طرح سے پیش آتا لیکن اب اس کی جرأت نہیں ہے کہ وہ میرے بارے میں کسی غلط انداز سے سوچے بھی۔

بہر حال سردار شیر افضل سے یوں آمنا سامنا مجھے بہت دلچسپ لگا اور میرے لہو میں پھر انتقام جوش مارنے لگا لیکن میں مطمئن تھا کہ اب میں اپنا مقصد حاصل کرہی لوں گا اور ان شاء اللہ وہ دن بھی جلد ہی آئے گا جب ایک رات میں بھی اپنے سینے پر کوئی بوجھ لیے بغیر سکون کی نیند سوسکوں گا اور وہ رات میری زندگی کی پہلی رات تھی۔ جب میں نے وضو نہیں کیا اور نہ ہی سوتے وقت کی رات کی دعائیں پڑھیں۔ رشنا دیوی کے حسین جسم کے لطف و کرم کو محسوس کرتے کرتے میں گہری نیند سوگیا۔

سوتے ہوئے عشاء پھر میرے خواب میں آئی میں ایک جھیل کے کنارے کھڑا تھا۔ چاندنی رات تھی اور جھیل کے پانی میں چاند کا عکس جھلملا رہا تھا اچانک ہی عشاء کا چہرہ چاند کے عکس میں نمودار ہوا۔ میں نے سوچا کہ عشاء کو میں جھیل کے پانی میں غوطہ لگا کر پکڑ لوں مگر وہ میری دسترس سے بہت دور تھا بلندیوں پر

چمک رہا تھا۔ جہاں تک میری پرواز ناممکن تھی۔ اس کا حصول بھی احمقانہ تصور تھا۔

''تم مجھے چھونا چاہتے ہو، پکڑنا چاہتے ہو۔ احمق ہو تم میرے نزدیک بھی نہیں آسکتے نفرت ہے مجھے تم جیسے انسان سے۔'' اس نے زہر خند لہجے میں کہا اور چاند کے حلقے میں جگمگاتا ہوا اس کا عکس ہولے ہولے ماند پڑنے لگا۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ زبان خشک ہوگئی میں نے اس کا نام پکارنا چاہا۔ لیکن میری آواز جیسے بند ہوگئی مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرا گلا زور سے دبا رہا ہے۔ میری سانس رکنے لگی دم گھٹنے لگا اور میں اپنے گلے پر دونوں ہاتھوں کو رکھے ایک ہلکی سی چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔

میری حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ سارا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ حالانکہ کمرے میں اے سی کی خوش گوار ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر میں، میں نے اپنے اوپر قابو پالیا۔ میں سوچنے لگا کہ عشاء بار بار مجھے خواب میں کیوں دکھائی دیتی ہے۔ کیا لاشعوری طور پر میں اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ لیکن وہ مجھے اچھا انسان نہیں سمجھتی۔ وہ کبھی بھی مجھ سے محبت نہیں کرسکتی۔ میں نے بھی تو اسے صرف ایک بار ہی دیکھا ہے کیا صرف ایک بار دیکھ لینے سے کسی سے محبت ہوسکتی ہے۔

میرے دل نے کہا ''ہاں'' لیکن دماغ نے سرزنش کی اور مجھے ڈانٹ دیا اور دل سے کہا کہ میں عشاء کے بارے میں آئندہ کبھی کچھ نہ سوچوں۔ دل نے کہا میں کیا کرتا میں کیا سوچتا ہوں۔ لیکن رات کے اندھیرے میں تمام دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپ کر وہ خود ہی میرے خوابوں میں چلی آتی ہے۔ میں دل و دماغ کی اس جنگ میں مبتلا تھا کہ آہستگی سے میرے روم کا دروازہ کھلا اور ملازم نے اندر جھانکا۔

''کون ہے؟ آجاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ اندر آگیا اور بولا۔

''آپ کو حضور نواب صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ اگر آپ بیدار ہوگئے ہوں تو تیار ہو کر آجائیں۔ وہ ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے اچھا کہہ کر اسے لوٹا دیا اور گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ مجھے سوتے ہوئے تین چار گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے سر بہت زیادہ بھاری ہو رہا تھا۔ لیکن نواب صاحب نے بلایا تھا تو مجھے جانا ہی تھا۔ اس لیے میں شاور لینے کے لیے اٹھ گیا۔

ناشتے کی میز پر نواب صاحب کے ساتھ رشنا دیوی بھی موجود تھی۔ میں نے ادب سے نواب صاحب کو سلام کیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رشنا دیوی مجھے دیکھ کر کھل کر مسکرائی۔ رات کا خمار ابھی تک اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

''ہاں بھئی رشنا رات نیند تو ٹھیک طرح سے آئی دراصل نئی جگہ پر نیند کم ہی آتی ہے۔'' نواب صاحب نے میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں نواب صاحب مجھے تو رات بہت ہی اچھی نیند آئی بڑے مزے سے سوتی رہی۔'' رشنا نے میری جانب دیکھ کر اپنی بائیں آنکھ کو ذرا سا میچ کر کہا۔

''چلو اچھی بات ہے پھر تو تم خاصی فریش ہوگی اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔'' نواب صاحب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہوں یہ بات تو ہے۔'' رشنا نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے جھٹ سلائس کا پیس اٹھا کر منہ میں رکھ لیا پھر بولی۔ ''آج شام صحافی برادری کے سامنے حاضری ہے۔ ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس ہے سب باری باری مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ اس لیے میں نے ایک بار ہی ٹائم دے دیا سب پاکستان کے

دورے کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔"

"میں ایک بات صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس مرتبہ تو تمہاری آمد کے بارے میں میڈیا والوں کو پتا چل گیا لیکن آئندہ جب تم آؤ تو یہ چاہوں گا کہ تمہاری آمد کی اطلاع کسی اور کو نہ ہو' تم میڈیا کو بھی یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم میرے گھر ٹھہری ہو۔" نواب صاحب نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ بالکل بے فکر رہیں نواب صاحب! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" رشنا نے سنبھل کر کہا۔

"لیکن ایسا ہونا کیسے ممکن ہے آپ کوئی عام شخصیت نہیں کہ ائر پورٹ پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکے۔" میں نے کہا تو نواب صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا شاید انہیں اپنی اور رشنا کی گفتگو کے درمیان میرا بولنا پسند نہیں آیا۔

"آج کل کے دور میں ہر بات ممکن ہے شمروز اور میں یہ کر کے دکھاؤں گی۔ پاکستان اور بھارت آنے جانے کے لیے قانونی طور پر بارڈر کراس کرنا ضروری تو نہیں۔" رشنا نے نواب صاحب کی جانب نہیں دیکھا ورنہ وہ میری بات کا جواب نہیں دیتی۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ غیر قانونی طور پر......!"

"شمروز تمہارا ناشتا مکمل ہو گیا تو اپنے روم میں جاؤ' ابھی تمہارے پاس آغا کی ضروری کال آنے والی ہے۔" نواب صاحب نے میری بات درمیان سے کاٹ کر تیز لہجے میں کہا تو میں "بہتر نواب صاحب" کہہ کر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

میرے بعد ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں وہ میں نہیں جان سکا۔ البتہ اس بات کا اچھی طرح سے احساس ہو گیا کہ نواب صاحب نے جان بوجھ کر مجھے اپنے درمیان سے اٹھایا ہے۔

لیکن تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی مجھے اپنے روم میں آئے ہوئے کہ آغا قزلباش کا فون آ گیا۔ میں نے فون ریسیو کیا تو اس نے نہایت خوش دلی سے مجھے ہیلو کہا پھر خیریت دریافت کرنے کے بعد کہا۔

"بھئی نواب صاحب کے پاس جا کر تو تمہاری پانچوں انگلیاں گھی میں ہو گئیں۔" میں بھلا اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ جھینپ کر رہ گیا۔ گویا یہ بات آغا کے علم میں بھی آ گئی کہ میں نے رات رشنا کے ساتھ گزاری ہے۔ میری جانب سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بولا۔ "تمہیں میرا مذاق برا تو نہیں لگا۔" تو میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں باس ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بھئی تمہارے باس تو نواب صاحب ہیں۔ میں نہیں رہا۔ اور ہاں تم لکی ہو کہ نواب صاحب کی قربت بنا مانگے ہی تمہیں مل رہی ہے۔ ورنہ تو لوگوں کو صرف ایک ملاقات کرنے کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"ذرہ نوازی ہے ان کی ورنہ میں کس قابل ہوں۔" میں نے اپنے لہجے میں انکساری پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تم کس قابل ہو' نواب صاحب نے اس بات کو تو جان کر تمہیں منتخب کیا ہے اب تمہارے لیے میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ تم ان کی دل سے تابعداری کرو۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا لیکن زبان بند رہے۔ ان کے ساتھ وفا کرو گے تو بہت اوپر تک جاؤ گے اور تمہارے وہ دشمن جن کے آگے تم نے اپنے آپ کو پستی میں بے بس محسوس کیا تھا اب وہ تمہیں پستی میں دکھائی دیں گے۔ تمہیں پہچان جانے کے باوجود وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔ بلکہ ایک بہت اہم بات بتا دوں اس ملک کا وزیر اعظم بھی ان کے آگے چوں بھی نہیں کر سکتا۔ ان کے مریدان کی تعداد لاکھوں میں ہے۔"

جتنی دیر آغا بولتا رہا میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے آغا نے پوچھا۔ "کیا بات ہے تم خاموش ہو' تم سن رہے ہو ناں میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"جی ہاں میں پوری توجہ سے آپ کی بات سن رہا ہوں با......!" میں باس کہتے کہتے رک گیا تو آغا قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔

"بھئی نواب صاحب نے تمہیں منتخب کر کے مجھے اور تمہیں ایک ساتھ کھڑا کر دیا ہے۔ اب ہم ساتھی ہیں۔"

"یہ اعزاز دینے کا شکریہ۔" میں نے کہا۔

"اب تم فارمل ہو رہے ہو۔ اینی وے اپنا خیال رکھنا ہم پھر ملیں گے گڈ لک اینڈ گڈ بائے۔"

آغا نے فون بند کر دیا تو میں سوچنے لگا کہ آخر میرے اندر نواب صاحب کو ایسی کیا خوبی نظر آئی کہ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور میں ایک ہی جست میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کہاں میں آغا قزلباش کا ایک معمولی سا کارندہ تھا اور آج......!

ابھی میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ ہلکا سا ناک ہوا۔ "یس" میں نے کہا تو رشنا دیوی مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔ حسب معمول اس نے مہین ساڑھی زیب تن کی ہوئی تھی۔

"یہ تنہائی میں بیٹھ کر کسے یاد کیا جا رہا تھا۔" اس نے بیڈ پر خود کو گراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنی کا سہارا لے کر ذرا سا اٹھ گئی۔ ٹانگیں اس نے بیڈ سے لٹا رکھی تھیں۔

"تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور کی مجال ہے کہ میری یادوں یا سوچوں میں آئے۔" میں نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے ریشمی گالوں کو سہلاتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"ایسی بات ہے۔"

"چاہو تو آزما لو۔" میں نے اس کے نرم و گداز ہونٹوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"یہ ہماری زندگی بھی عجیب چیز ہے اور شخصیت اس سے بھی زیادہ عجیب کتنی مشکل زندگی ہے کہ ہم کھلے عام دوسرے لوگوں کی طرح آزادی سے پارکوں اور شاپنگ سینٹروں میں گھوم پھر نہیں سکتے۔ پتا ہے میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہر جگہ آزادی سے گھوموں پھروں۔ لائف کو انجوائے کروں۔ میرے لیے تو آزادی کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔" اس نے بیڈ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں بھی بیڈ سے اٹھ کر اس کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔

"میرے اور تمہارے درمیان بڑا فرق ہے۔ جب کہ کام کے لیے......!" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"چلو چھوڑو' اس بات کو رہنے دو' ایک بات بتاؤ شمروز۔" اس نے کہا۔

"ضرور پوچھو۔" میں نے کہا۔

"تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں۔"

"تو کب کرو گے شادی' یا پھر یوں ہی چلے گا۔"

"ابھی تو ارادہ نہیں آگے کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے بے تکلف لہجے میں کہا۔

"کسی کا خیال ہے ذہن میں؟"
"ہوں!" میرے تصور کے پردے پر پہلے مشی اور پھر عشا کا ہیولہ لہرایا۔ "لیکن میں خود کو دیکھ کر چلنے کا عادی ہوں"
"یہ تو اچھی بات ہے لیکن ذہن کا بھی ایک معیار ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔
"بلندیوں کو دور سے دیکھتا ہوں اور خود کو وہاں تک پہنچنے کے لیے نا اہل سمجھتا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنیٰ خیز لہجے میں کہا۔
"تو پھر جدوجہد کرو' جدوجہد کرنے کا ارادہ ہے۔" اس نے مسکرا کر معنیٰ خیز لہجے میں کہا۔
"ہے لیکن آفاقی جدوجہد کا نہیں۔"
"مطلب۔"
"میں ہمیشہ حالات کی سیڑھیاں گن لیتا ہوں۔ تاکہ گرنے کا اندیشہ نہ رہے۔"
"بہت محتاط ہو۔" وہ پھر مسکرائی۔
"ہوں! کیونکہ میں زندہ رہتا ہوں۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔
"اچھا اپنی مرکزِ نگاہ کے بارے میں تو بتا دو۔" اس نے اچانک پوچھا۔
"خیالی منصوبوں سے آگے نہیں بڑھا۔" میں نے کہا۔
میرا جواب سن کر رشنا کے چہرے پر عجیب تاثرات پھیل گئے۔ اس کے بعد وہ کسی قدر خاموش ہوگئی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک گہری سانس لے کر میری جانب دیکھنے لگی۔
"کیا ہوا تمہیں میرا جواب پسند نہیں آیا۔ شاید تمہیں برا لگا ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
"نہیں۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی اور بولی۔ "چھوڑو ان باتوں کو اب ہمیں کام کی بات کر لینی چاہیے۔"
"فرمایئے بندہ ہمہ تن گوش ہے۔" میں نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
"ہماری دوستی کی ابتدا تو ہو چکی ہے لیکن ہمیں اپنی اس دوستی کو مزید آگے بڑھانا ہے اور آئندہ ملتے جلتے رہنا ہے۔ اس مرتبہ تو میں آئی ہوں' اب تم آؤ گے لیکن یاد رہے کہ تم پاسپورٹ کے ساتھ پلین سے نہیں آؤ گے۔ بلکہ غیر قانونی طور پر اسی راستے سے انڈیا آؤ گے جہاں سے میں تمہیں بتاؤں گی اور میں تمہیں ایک سم دوں گی۔ جسے تم اپنے الگ فون میں لگاؤ گے۔ اس کے ذریعے تم یہاں پاکستان میں میرے رابطے میں رہو گے۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
میں رشنا کی بات سن کر بری طرح چونک پڑا اور کہا۔ "میں سمجھا نہیں کہ تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔"
"سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ اب تم ایسے چکر میں پھنس چکے ہو جس سے باہر نکلنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ سوائے موت کے باہر نکلنے کا کوئی اور راستا نہیں ہے۔ غضنفر ایک ایسا عفریت ہے' جس کے پنجوں سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔" اس نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔
اس کی باتیں سن کر مجھے زور کا چکر آ گیا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ غضنفر کا ذکر یہاں کہاں سے آ گیا۔ آخر یہ غضنفر ہے کون۔ میں نے ابھی تک صرف اس کا نام ہی سنا ہے۔ مگر اس کی شکل سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے جب رشنا سے غضنفر کے بارے میں سنا تو اس کے لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ آ گئی اور وہ مجھے ان نگاہوں سے دیکھنے لگی جن میں میرے لیے بہت رحم تھا......!

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)

قاتل کی تلاش

انجم فاروق ساحلی

ان لمحوں کی روداد' جب انسان انتقام کی آگ میں اندھا ہو کر اپنے سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ نفرت کی آگ اس کی روح کو کچھ اس طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی ہے کہ وہ چاہنے کے باوجود اس سے باہر نہیں نکل پاتا۔
ایک آشفتہ سر کی روداد' وہ ہر حال میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا تھا۔

میں تین سال بعد برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک کی سیر کے بعد لاہور واپس آیا تو ایک المناک خبر نے میرا استقبال کیا' میری آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے' بچپن کے وہ سارے پرشفقت منظر میری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگے جن میں میرے بڑے بھائی شیر علی نے مجھ پر محبت اور الفت نچھاور کی تھی۔ ایک مرتبہ چوتھی کلاس کے زمانے میں آدھی چھٹی کے وقت میری ایک ذرا بڑے لڑکے سے لڑائی ہوئی اور میرے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی جسے دیکھ کر بھائی شیر علی جو ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا کیسا بے چین ہوا تھا اور غضب کے عالم میں اس لڑکے کو بری طرح پیٹ کر رکھ دیا تھا۔
اور آج اس کا لہو مجھے پکار رہا تھا۔ کسی نے اپنے گندے ہاتھ میرے بھائی کے خون سے آلودہ کیے تھے لیکن اسے خودکشی کا رنگ دے دیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے میری بااثر فیملی بھی اس پر پورا یقین رکھتی تھی۔ مجھے ان کے رویئے اور بے حسی پر افسوس اور ملال تھا۔ میں اس وقت شیر علی کے گھر میں رہائش پذیر تھا اور اپنے گھر کے گرد آلود تالے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔
میں اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مون مارکیٹ کے بالمقابل مکڈونلڈ برگر کی عمارت کے ساتھ حال ہی میں تعمیر ہونے والے امراء کے خوب صورت گولڈن کلب کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں معمولی آدمی داخلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو کلب کا ریسٹورنٹ بہت مہنگا تھا پھر منیجر سے ممبر شپ لیے بغیر کلب میں گھومنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے صدر دروازے کے محافظوں کو ممبر شپ کارڈ دکھایا تلاشی دی اور پھر اندر داخل ہو گیا۔
اس کلب کو عیش و عشرت کے لوازمات سے مزین کیا گیا تھا۔ میں جب شام کے آٹھ بجے اندر داخل ہوا تو کلب کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ ڈانسنگ فلور پر رنگین روشنیوں میں مختلف رومانوی جوڑے ناچ رہے تھے۔ شراب بندی کے باوجود اس کلب کی میزوں پر پانی کی طرح سرو کی جا رہی تھی۔ سبز، سرخ، زرد اور نیلے رنگوں کے پیمانے بڑے خوشنما دکھائی دے رہے تھے۔ ڈانسنگ ہال کی سجاوٹ اور خوب صورتی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں کسی سونے کے گھر میں داخل ہو چکا ہوں۔ سنہری دیواریں' سنہری میز کرسیاں' ڈانسنگ فلور کا گھومتا ہوا سنہرا فرش بڑا پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔
میں بیرے کی رہنمائی میں ایک خالی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ چند نشستوں کے علاوہ باقی تمام میزوں پر حسن و شباب کی پریاں اور بھونرے دکھائی دے رہے تھے۔ نئے نئے فیشن کے لباس نئی نئی طرز کی داڑھیاں رکھے نوجوان اچھے خاصے مضحکہ خیز معلوم ہو رہے تھے لیکن ان کے لیے یہ فیشن تھا جو سنجیدہ طبقے

کی نگاہ میں بے ہودگی معلوم ہوتی تھی۔ یہ نئے پرانے تتے ضبوں کا چکر بھی عجیب ہے۔

میں نے میز پر بیٹھ کر مینو کا جائزہ لیا اور انار کے جوس کا آرڈر دے دیا۔ بیرے نے مجھے بڑی حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر تعمیل کے لیے چلا گیا۔

اس وقت اچانک نظریں چار ہوئیں اور اس علاقے کے ایم این اے جلال چوہدری کی بیوی اور میری بہن فوزیہ شیر جلال مجھے دیکھ کر چونک پڑیں اور سب کو متوجہ کرنے لگیں کہ نادر شیر علی سامنے آ کر بیٹھ چکا ہے۔ آئی جی پولیس ایڈووکیٹ وقار علی اور محکمہ خفیہ کا انسپکٹر کامران رانا شوکت لاشاری بھی مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

میری بہن نے فوراً ایک بیرے کو میری طرف دوڑایا۔ میرے والد اس ملک کے ایک اہم سیاستدان تھے اور صاحب جائیداد بھی تھے۔ اپنی وفات سے قبل وہ فوزیہ کی شادی جلال چوہدری سے کر چکے تھے جو خود بھی سیاستدان بن چکا تھا اور میرے والد کے مریدوں میں سے تھا۔ اس وقت یہ سب لوگ جو سامنے موجود تھے برسراقتدار پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ پورے شہر پر میرے بہنوئی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا اثر رسوخ اپنے عروج پر تھا۔ رانا شوکت علی اس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ ایڈووکیٹ وقار علی بڑے وقار سے ان کے خلاف ہونے والے کیسوں کی دھجیاں اڑا دیا کرتا تھا۔ انسپکٹر کامران کی کارروائیاں بھی دیدہ دلیری سے جاری تھیں۔ اتنی قوت کے باوجود بھی سب آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ اب تو مجھے پورا شبہ ہو چکا تھا کہ شیر علی کی موت ضرور ان کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ بیرا قریب آ کر مؤدب لہجے میں مخاطب ہوا۔

"صاحب آپ کو بڑی میم صاحبہ بلا رہی ہیں۔"

میں نے کن انکھیوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا وہ پراشتیاق نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "میم صاحبہ سے کہہ دو میں ان سے ملنا نہیں چاہتا جب تک شیر علی کے قاتل پکڑے نہ جائیں۔" بیرا کچھ نہ بولا اور الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

میری بہن کچھ ناراضگی اور غصے کے عالم میں اپنی میز سے اٹھی اور تیر کی طرح میری طرف آئی۔ پھر میرے سامنے آ کر اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔ اس کے ہاتھ کولہوں پر تھے یہ وہی انداز تھا جس سے وہ مجھے بچپن میں گھورا کرتی تھی تو میں ادب سے سر جھکا لیتا تھا اب بھی بے اختیار میرا سر جھک سا گیا۔

"ناصر اتنی بے رخی اچھی نہیں۔ ہم تمہارے اپنے ہیں تم جب سے واپس لوٹے ہو ایک مرتبہ بھی اپنے بہنوئی سے نہیں ملے وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں اٹھو فوراً۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمام وسائل کے باوجود کیوں شیر علی کے قتل کو خودکشی قرار دیا جا رہا ہے؟"

"وہ واقعی خودکشی کر چکا ہے قتل کا کوئی سراغ نہیں ملا ناصر میرے بھائی تم خواہ مخواہ کی ضد میں کیوں پڑ گئے ہو۔"

"باجی خواہ مخواہ کی ضد نہیں میں جہاں بھی جاتا تھا بھائی مجھے فون پر اور میرے خط کے جواب میں یہاں کے حالات سے باخبر کرتا رہتا تھا اس نے موبائل پر آخری گفتگو میں مجھے مطلع کیا تھا کہ اس نے سیاسی طور پر خرد برد ہونے والے ترقیاتی فنڈ اور دوسری کئی بدعنوانیوں کا سراغ لگا لیا ہے جس میں کئی افسوس ناک رشتے بھی ملوث معلوم ہوتے ہیں۔ تم واپس آ جاؤ پھر ہم مل کر انکشاف کریں گے اور......" میں نے دردناک لہجے میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"چلو اٹھو اور یہ فضول باتیں کسی اور وقت پر اٹھا رکھو جو بے بنیاد ہیں۔ ہو سکتا ہے شیر علی کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو ورنہ تمہارے بہنوئی تو بڑے اچھے طریقے سے سارے فرائض انجام دے رہے ہیں۔" فوزیہ نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا میں مجبوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں بادل نخواستہ اپنے بہنوئی اور اس کی مشینری کے سامنے بیٹھ گیا۔

"آخر تم مجھ سے کنی کیوں کترا رہے ہو؟" جلال خان نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں اٹھائیں اور سختی سے اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "مجھے عیار اور بددیانت لوگ پسند نہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" میرا بہنوئی بھنا کر بولا۔ "ناصر تمہیں اپنے بہنوئی سے ادب کے ساتھ گفتگو کرنا چاہیے کیا تمہیں اپنی بہن کی عزت کی بھی کوئی پروا نہیں۔" فوزیہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"میرے بہنوئی کی قوت کی بنیادیں استحصال پر استوار ہیں۔" میں نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جو بھی بات ہے کھل کر کرو تمہیں ضرور مخالف پارٹی کے کسی اخبار نویس نے بھڑکایا ہے ایسے لوگ اس شہر میں موجود ہیں جو من گھڑت باتیں الزامات میرے متعلق پھیلاتے رہتے ہیں۔" میرے بہنوئی نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"میں اپنے بھائی کے قتل کی شفاف تحقیق چاہتا ہوں لیکن میرے اپنے ہی ایسا نہیں چاہتے۔" میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"شیر علی نے خودکشی کی ہے۔" میرے بہنوئی نے میز پر مکا جمایا۔

"اس کی دلیل کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"دلیل ابھی تمہارے سامنے آ جائے گی۔" "شیر علی نے نادیہ علی کی بے وفائی کے سبب سر میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔ یہ واقعہ رات کے وقت پیش آیا اس کے گھر کسی کو جاتے یا نکلتے نہیں دیکھا گیا۔ کوئی گواہ ایسا نہیں جو یہ بتائے کہ اس نے کسی کو اس کی رہائش گاہ سے بھاگتے یا نکلتے دیکھا ہو۔ اعشاریہ اڑتیس بور کے اس کے ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔"

میرے بہنوئی نے اپنے سیاسی انداز میں واقعہ پر روشنی ڈالی اور میں نے غور سے آئی جی پولیس اور انسپکٹر کامران کی طرف دیکھا وہ بھی اثبات میں سر ہلا رہے تھے گویا سب لوگ آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اور بدعنوانیوں میں ملوث تھے۔

♥♥♥

"نادیہ علی سے تو تم مل ہی چکے ہو کیا اس نے تمہیں کچھ بتایا۔" فوزیہ نے اچانک استفسار کیا۔

"نہیں ابھی تو کچھ نہیں بتایا وہ بھی گول مول باتیں کر رہی ہے۔ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔"

"آخر تم گڑے مردے کیوں اکھاڑنا چاہتے ہو اس سے ہمارا بھائی زندہ تو نہیں ہو جائے گا ناصر۔" میری بہن نے جھنجلا کر کہا۔

"لیکن اس کے قاتل ضرور دفن ہو جائیں گے۔" میں نے اب کی بار میز پر مکا جمایا جس سے جام چھلک اٹھے۔

"خواہ مخواہ طیش میں نہ آؤ ناصر تمہیں اندازہ نہیں کہ مشکل وقت میں ہمیشہ اپنے ہی کام آتے ہیں گھڑی بھر کی آشنائی دم نہیں بھرتی رتی بھر کانا تا ہی کام آتا ہے۔"

"ضرور، ضرور ایسا ہوتا ہے اگر خونی رشتے خون آلودنہ ہوں۔"

"ناصر!" فوزیہ زور سے چیخی۔ "تم حد سے آگے بڑھ رہے ہو آج کل کے اخبار نویس بھی کالے ناگ ہیں الٹا سیدھا چھاپتے رہتے ہیں اگر کارروائی کی جائے

تو مظلوم بن جاتے ہیں کہ مخالف پارٹی نے انتقامی حملہ کیا ہے۔" فوزیہ مٹھیاں دباتے ہوئے بولی۔

"برخوردار ناصر! میں نے خود اس معاملے کو ہاتھ میں لے کر تحقیق کی تھی اور قتل کے کوئی شواہد یا سراغ نہیں ملا تھا ورنہ۔" انسپکٹر کامران نے اپنے مخصوص مستحکم لہجے میں کہا۔

"اگر قانون کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں تو وہ قاتل کا گریبان کیا خاک پکڑیں گے۔" میں اپنی ضد پر قائم تھا۔

انسپکٹر کامران کچھ بولا نہیں لیکن خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

"ناصر صاحب آپ خود تفتیش کرلیں لیکن نتیجہ یہی نکلے گا۔" اب کی بار آئی جی پولیس نے ٹھوس لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

اسی وقت ڈانسنگ فلور روشنیوں سے جگمگا اٹھا سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ میوزک بجنا شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی کلب ڈانسر نادیہ علی جس سے میرے بھائی شیر علی کو محبت تھی اپنا والہانہ رقص پیش کرنے لگی اس کا نیم عریاں جسم بڑا ہیجان انگیز تھا جلتی بجھتی روشنیوں میں اس کی ادائیں اور جسمانی نشیب فراز بڑے دلفریب تھے۔ کچھ لڑکوں کے تو منہ ہی کھل گئے۔ کچھ ہونٹوں پر دبی دبی آہیں مچلنے لگیں۔ وہ مجسم شراب کا جام تھی۔ جو آنکھوں کے راستے روح میں اتر کر اپنا سرور بخش رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں اس کے سنہری بال لوگوں کے دل کھینچ رہے تھے۔ میں بھی کچھ دیر تک کھو کر رہ گیا لیکن پھر میرا وجود انتقام کے لاوے سے کھولنے لگا۔

ہر فرد جو شیر علی سے وابستہ رہ چکا تھا اسے اس طرح بھول چکا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ڈانس کرتے کرتے نادیہ علی اسٹیج سے اتر کر میزوں کے درمیان سے گزرنے لگی، لوگ لہک لہک کر اور لپک لپک کر اس کے جلوؤں کو دیکھنے لگے۔ نادیہ علی میرے پاس آ کر رکی اور ادائے محبوبانہ سے میرا ہاتھ تھام لیا لیکن میں نے اٹھنے سے انکار کردیا۔ میں رقص کے موڈ میں نہیں تھا۔ میرے چہرے اور شیر علی کے چہرے مہرے اور وجود میں مردانہ وجاہت کی مطابقت تھی اس لیے نادیہ فوراً میری طرف مائل ہوگئی تھی۔

نادیہ علی کا رقص ختم ہوا تو میں میز سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت میری بہن فوزیہ مجھ سے مخاطب ہوئی جو خود بھی کافی تیز سیاسی رجحان اور سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔

"ناصر! اس شہر میں زندگی اب بہت سستی ہو چکی ہے اپنا خیال رکھنا۔ قانون ہر شخص کے پیچھے تو نہیں لگا رہتا۔"

"میں ضرور اپنا خیال رکھوں گا تاکہ......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اٹھ کر تیز تیز قدموں سے خارجی راستے کی طرف بڑھنے لگا۔

میں روڈ کراس کرکے میں المشہور قادر برگر پوائنٹ پر آ کر ایک میز پر بیٹھا اور بیرے کو برگر کا آرڈر دے دیا۔ بیرا برگر اور کوک لے آیا۔ میں نے نادیہ کو دو مس کالیں دیں پھر اس کی کال نہ آنے پر خود اس سے رابطہ قائم کیا۔

"بس تھوڑی دیر میں باہر آ رہی ہوں تم میری گاڑی کے پاس ہی آ جاؤ۔" نادیہ کی مترنم آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے باہر آ جاؤ، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ابھی باقی ہے۔" میں نے بے تابی کا اظہار کیا۔

جلد از جلد برگر اور بوتل سے فارغ ہو کر میں نے بل پلیٹ میں ہی رکھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مارکیٹ سے ملحقہ پارکنگ پر چلا آیا جو نیشنل بینک کے سامنے واقع تھی۔

چند منٹ کے انتظار کے بعد ہی نادیہ اپنے دلکش سراپا کے ساتھ حسن کی بجلیاں گراتی اونچی ایڑھی کی کھٹ کھٹ کے ساتھ اپنی شاندار کرولا کی طرف آنے لگی۔ جس سے میں ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"ہیلو مسٹر ناصر کیا حال ہے؟" نادیہ نے پاس آ کے دروازے کے لاک میں چابی داخل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن ماحول ٹھیک نہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"ماحول کو کیا ہوا ہے؟" نادیہ نے چونک کر پوچھا۔

"ماحول میں انسانی رشتوں کی تڑپ گم ہوگئی ہے۔" میں نے متفکر لہجے میں کہا۔

"اوہ...... سمجھی...... تم ابھی تک اپنے بھائی کے غم میں مبتلا ہو۔" وہ چونک کر بولی۔

"ہاں یہی غم مجھے کھائے جا رہا ہے کہ اس کے قاتل آزاد ہیں۔" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا تم اپنی گاڑی میں آئے ہو؟" نادیہ نے استفسار کیا۔

"نہیں گاڑی آج صبح خراب ہوگئی تھی مکینک کو بلوایا ہے وہ مرمت کر رہا ہے

شیر علی کی گاڑی میں بیٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اس لیے ٹیکسی میں کلب تک آیا ہوں۔"

"چلو بیٹھو گھر تک چلتے ہیں۔" نادیہ نے مجھے فرنٹ سیٹ پر دھکیلا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں نئی شاندار کرولا گاڑیوں کے سیلاب میں بہتی ہوئی جوہر ٹاؤن کی طرف سفر کرنے لگی۔ سڑکوں پر رونق اور آمد و رفت اب بڑھ گئی تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی بھی کافی تعداد دکھائی دے رہی تھی لیکن میں رومانوی موڈ میں نہیں تھا اس لیے سوچ میں ڈوب گیا۔

"میں ایک بار پھر سمجھاتی ہوں، خواہ مخواہ اپنے ذہن میں شک کے کانٹے بو کر اپنا سکون برباد نہ کرو۔" نادیہ نے مجھے پر تفکر دیکھ کر ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے بھی شیر علی کی موت کا دکھ ہے لیکن اب ماتمی انداز اپنانے سے زندگی بالکل دوبھر ہوجائے گی۔ تمہارے اندر شیر علی والی ساری خوبیاں موجود ہیں ہم زندگی کو انجوائے کرسکتے ہیں لیکن تم خواہ مخواہ خودکشی کو قتل قرار دینے پر تلے ہوئے ہو۔" نادیہ نے لیکچر دیا۔

"مجھے بتایا جا رہا ہے کہ اس نے تمہاری وجہ سے خودکشی کی تم اس کے ساتھ مخلص نہیں تھیں حالانکہ میں سمجھتا ہوں جیسا کہ اس نے مجھے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ اس شہر میں بدعنوانیاں کرنے والوں سے واقف ہو چکا ہے اور جلد ہی تمہارے آنے کے بعد انہیں اپنی بدعنوانیوں اور کرپشن کے سلسلے میں قانون کو جواب دینا پڑے گا۔ اس لیے اسے راستے سے ہٹا دیا گیا۔"

"لیکن پولیس اپنا اطمینان کر چکی ہے۔ یہ قتل کا نہیں خودکشی کا کیس ہی تھا۔" نادیہ نے زور دے کر کہا۔

"شیر علی کو تمہاری محبت حاصل تھی تم دونوں شادی بھی کرنے والے تھے پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟ وہ ایک امیر خاندان کا فرد تھا جسے دنیا کی ہر سہولت میسر تھی پھر اس نے ایسا کیوں کیا جواب دو۔"

"میں نہیں جانتی اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے اسے ہرگز دھوکا نہیں دیا۔"

"بس تو پھر یہ بات طے ہے کہ اسے ٹھکانے لگایا گیا۔" میں نے ڈیش بورڈ پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

"اتنا جذباتی پن اچھا نہیں زندگی کو انجوائے کرنا سیکھو آخر تم مجھ سے اتنا دور کیوں رہتے ہو۔" نادیہ نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اپنی بھابی سمجھتا ہوں۔"

”تمہارا بھائی زندہ ہوتا تو میں ضرور تمہاری بھابی ہوتی لیکن جب وہ شادی سے قبل مر گیا تو پھر تم مجھے بھابی کیوں سمجھتے ہو؟“

”میں تمہیں اپنے بھائی کی امانت ہی سمجھتا ہوں، کیا تمہیں اس سے محبت نہیں تھی؟“

”ہاں محبت تھی۔“ نادیہ نے اقرار کیا۔

”پھر تم اس کے متعلق کھل کے بات کرنے سے کیوں گریزاں ہو۔“

”اس طرح اسے دوبارہ زندگی تو نہیں مل جائے گی۔“

”لیکن اس طرح وہ حقائق تو سامنے آجائیں گے جنہوں نے شیر علی کو ہم سے چھین لیا۔“

وہ کچھ پریشان اور مضمحل سی دکھائی دینے لگی۔ خوف کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر چھا گئی۔ اس وقت میں چونک کر بیک مرر میں دیکھنے لگا۔ انسپکٹر کامران تیزی سے گاڑیاں پیچھے چھوڑتا ہوا ہمارے تعاقب میں آرہا تھا۔ میں نے ہی نادیہ کو باخبر کیا اس نے رفتار بڑھادی اور راستہ بھی بدل دیا۔ انسپکٹر کامران کی کار برابر ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ میں نے فوزیہ سے فون پر رابطہ قائم کیا۔

”باجی! انسپکٹر کامران کیوں میرے پیچھے آرہا ہے؟“

”پیارے بھائی اس شہر میں ہمارے مخالف اور دشمن موجود ہیں۔ انسپکٹر کامران تمہاری حفاظت کے لیے تمہارے گرد موجود رہے گا۔“

”میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“ میں نے جھلا کر جواب دیا۔

”لیکن ہمیں اس کی ضرورت ہے اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔“ فوزیہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

نادیہ نے اپنے گیراج میں گاڑی داخل کی۔ انسپکٹر کامران کی کار دور سڑک کے سرے پر ایک زیر تعمیر عمارت کے سائے میں رک چکی تھی۔

میں نادیہ کے اصرار پر اندر چلا آیا۔ اندر ڈائننگ ہال میں میرے بھائی اور نادیہ کی تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ میری آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ سچ کو سلا دیا گیا تھا اور جھوٹ کے انگارے دہک رہے تھے۔ میں کافی پی کر جلد ہی باہر نکل آیا اور جوہر ٹاؤن کے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چلنے لگا جو یہاں سے نزدیک ہی تھا یہاں رات کے ہر پہر ٹیکسیاں اور رکشے موجود رہتے تھے۔ میں نے ایک ٹیکسی لی اور رائے ونڈ روڈ پر واقع ایک سرسبز و شاداب باغ میں گھری شیر علی کی کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا۔ کوٹھی میں داخل ہو کر میں خواب گاہ میں چلا آیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن خیالات کی یلغار نے مجھے سونے نہ دیا۔ میں کروٹیں بدلتا رہا یہاں تک کہ کافی رات گزر گئی۔ اچانک بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ میں نے چونک کر ہاتھ بڑھایا اور کال اٹینڈ کرنے لگا۔ دوسری طرف فوزیہ کی کچھ گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ناصر تم فوراً گھر سے نکلو اور ہماری کوٹھی کی طرف چلے آؤ‘ نادیہ کے متعلق کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ بڑا غضب ہوگیا۔“

”آخر کیا ہوگیا میں بھی جانوں۔“

”بس تم چلے آؤ اور سوال مت کرو۔“ فوزیہ نے تحکمانہ لہجے میں حکم دیا۔

میں نے جلدی جلدی نائٹ ڈریس اتارا اور پینٹ شرٹ پہن کر گیراج کی طرف لپکا کچھ ہی دیر بعد شیر علی کی کار تیزی سے جوہر ٹاؤن فیروزن کی ایک شاندار محل نما عمارت کی طرف دوڑ رہی تھی۔ میری کار ابھی

تک مکینک لے کر نہیں آیا تھا۔ میرا ذہن مختلف اندیشوں اور وسوسوں سے سلگنے لگا۔ جب میں گاڑی اپنے بہنوئی کی محل نما عمارت کے ڈرائیو وے پر کھڑی کر کے بڑے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو میرا بہنوئی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ فوزیہ بھی کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اور آئی جی پولیس رانا شوکت اور ایڈووکیٹ وقار علی بھی موجود تھے۔

”آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو مجھے اتنی رات گئے بلوالیا گیا؟“ میں نے فوزیہ سے تیز لہجے میں کہا۔ فوزیہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”رات نادیہ سے ملنے والے تم آخری آدمی تھے۔ انسپکٹر کامران تمہارے پیچھے حفاظت کی غرض سے لگا ہوا تھا۔ تم نادیہ کے ساتھ اس کی کوٹھی میں گئے پھر جلد ہی باہر نکل آئے‘ باہر انسپکٹر کامران موجود تھا اس نے کسی کو بھی اندر جاتے یا باہر نکلتے نہیں دیکھا صرف تم ہی وہاں گئے تھے۔“

”تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟“ میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”نادیہ علی کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا ہے اور اس کی لاش ملازمہ نے تمہارے جانے کے کچھ دیر بعد دودھ کا گلاس لے کے جاتے وقت دریافت کی ہے۔“

”اوہ۔“ میرے ہونٹ نصف دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

”تو اس کا مطلب ہے نادیہ ضرور شیر علی کے قتل کے متعلق کچھ نہ کچھ جانتی تھی اس لیے اسے موت کی نیند سلادیا گیا۔“

”لیکن تمہاری بات پر یقین کون کرے گا۔ حالات تمہارے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ اگر ہم بیچ میں نہ آئیں تو پولیس تمہیں گرفتار کرلے گی اور تمہارا بچنا بہت مشکل ہوجائے گا۔“ اب کی بار میرے بہنوئی نے تیز لہجے میں کہا۔

”لیکن ہمیں تم سے پدری ہمدردی ہے۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ تمہیں بچانے کا پورا انتظام کرلیا گیا ہے۔“ فوزیہ نے ذرا بائیں لہجے میں کہا۔

”لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا اس کے اصرار پر کافی پینے اندر چلا گیا تھا۔ میری گاڑی خراب تھی اس لیے میں باتیں کرتا اس کے ساتھ گھر تک چلا گیا تھا۔“ میں نے ان سب کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”پولیس اور عدالت اس جواز کو تسلیم نہیں کرے گی۔“ نادیہ کی والدہ کا وکیل عدالت میں کہہ سکتا ہے کہ تم نادیہ کو شیر علی کے قتل کا مجرم و سبب سمجھتے تھے اس لیے تم نے گفتگو میں مشتعل ہو کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم اپنے خدشوں کا اظہار مختلف صحافیوں کے سامنے کرچکے ہو۔“ اس مرتبہ ایڈووکیٹ نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”گھبراؤ نہیں۔“ میرا بہنوئی میرے نزدیک چلا آیا۔ ”تمہیں بچانے کا بندوبست کرلیا گیا ہے۔ تمہارا بیان یہ ہوگا کہ تم نادیہ کے ساتھ شام کے وقت کلب سے نکل کے گاڑی میں روانہ ہوئے نادیہ نے تمہیں کریم بلاک چیس (شطرنج) کلب میں اتار دیا۔ اس کے بعد وہ گھر چلی گئی۔ چیس کلب کے مالک پر ہمارے کافی احسانات ہیں وہاں تمہاری موجودگی کی شہادتیں مہیا کردی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ انسپکٹر کامران بھی اپنی زبان بند رکھے گا وہ بھی تو ہمارا ماتحت ہی ہے۔ اسے بھی روپے اور مفاد کی ضرورت لاحق رہتی ہے۔“ میرے بہنوئی نے میرے گرد گھومتے ہوئے کہا۔

میں اس وقت اپنے جسم میں کمزوری اور نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں ان کی آفر قبول نہ کروں تو جیل میں بند کردیا جاؤں گا اور پھر

شیر علی کا کیس بالکل دب جائے گا۔

چنانچہ میں نے مجبوراً اثبات میں سر ہلا دیا کہ ''میں آپ لوگوں کی بات ماننے پر مجبور ہوں لیکن جلد ہی حقائق سامنے آجائیں گے ان دونوں قتل کی وارداتوں کی پشت پر اس شہر کے برسر اقتدار لوگوں کی بدعنوانیاں ہیں۔''

''ان حماقت آمیز باتوں کو دفن کردو ورنہ خود دفن ہوجاؤ گے۔'' فوزیہ نے اپنی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورا۔ میں نے بادل نخواستہ سر جھکا لیا۔

♥♥♥

انسپکٹر کامران نے جو خبر پریس کو دی وہ صرف اتنی تھی کہ نادیہ علی کو اس کے کسی ناکام عاشق نے اعشاریہ اڑتیس بور کے ریوالور سے گولی مار کر ہلاک کردیا ہے۔ قاتل رات کے وقت اس کی کوٹھی میں چھپ کر اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی تو وہ بیڈروم کی کھڑکی سے لگا کھڑا تھا۔ اس نے نادیہ کے دل کے مقام پر دو گولیاں سائیلنسر لگے ریوالور سے ماریں اور عقبی دیوار پھلانگ کر غائب ہوگیا۔

♥♥♥

چونکہ مجھے نادیہ نے کریم بلاک میں واقع شطرنج سینٹر میں اتار دیا تھا اس لیے مون مارکیٹ پارکنگ کے سیکیورٹی گارڈ جس نے مجھے نادیہ کی گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا اور اس نے نادیہ کو سلام بھی کیا تھا۔ اس کا بیان بھی بے وقعت ہوکر رہ گیا تھا۔

میرے بہنوئی اور شاطر ذہن بہن نے مجھے بڑی صفائی سے قتل کے الزام سے بچا کر الگ کردیا تھا۔ ارباب اقتدار لوگ بہرحال بہت کچھ بدلنے کی قوت اور قدرت رکھتے ہیں۔

♥♥♥

میں اپنے والد کے گلبرگ حفیظ سینٹر میں واقع امپورٹ ایکسپورٹ کے آفس میں چلا آیا۔ جہاں شیر علی ہی کنٹرول سنبھالتا تھا۔ یہاں روزا جو شیر علی کی سیکریٹری تھی جسے اب فوزیہ نے انچارج بنادیا تھا مختلف فائلوں اور کاغذات کا جائزہ لے رہی تھی۔ روزا واقعی کھلے ہوئے گلاب کی مانند خوب صورت اور تروتازہ تھی لیکن میرا ذہن شیر علی کے قتل کی گتھی میں الجھا ہوا تھا۔

''میں کچھ تلاش کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ملازم اشارہ پاکر جوس لینے چلا گیا۔

''شوق سے ناصر صاحب آپ بھی مالک ہیں۔'' روزا نے دلکش مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھی پرکشش تھی اور جسمانی نشیب و فراز میں بڑی سیکس اپیل تھی۔ میں نے جوس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور سارے دفتر کی فائلوں اور کاغذوں کا جائزہ لیا لیکن برسر اقتدار لوگوں کی بدعنوانیوں سے متعلق کوائف دستیاب نہ ہوئے۔ آخر تھک کر روزا کے اصرار پر میں نے جوس کا بڑا گلاس اٹھا لیا۔ روزا نے کیک بھی منگوایا۔

''کیا ہم کسی وقت سیر کا پروگرام بناسکتے ہیں جناب ناصر صاحب۔'' روزا کی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

''نہیں روزا فی الحال میں شیر علی کے قتل کی تحقیق کر رہا ہوں' سیر کا لطف پھر کسی وقت سہی۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ناصر صاحب! وہ خودکشی کا کیس تھا' آپ نے کیوں خواہ مخواہ خون سر پر سوار کر رکھا ہے؟'' روزا کی آواز میں اس مرتبہ تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

''خون ہی تو ہوا ہے۔ انسان کا' صداقت کا' میرے ارمانوں کا' میرا بھائی میرے لیے سب کچھ تھا۔ جب تک اس کا قاتل آزاد ہے' مجھے چین نہیں آسکتا۔'' میں نے پرملال لہجے میں کہا۔

''وہم کا کوئی علاج نہیں آپ خواہ مخواہ دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جائیں گے۔''

''کسی نہ کسی دیوار پر تو خون کے دھبے مل ہی جائیں گے۔'' میں نے مفکرانہ لہجے میں کہا اور اٹھ کر باہر کی طرف چلنے لگا۔

♥♥♥

گلبرگ سے نکل کر میں باغ جناح کے پاس واقع سب سے بڑی لائبریری میں چلا آیا اور مختلف اخبارات اور سیاسی رسائل کا جائزہ لینے لگا۔ آخر میں نے کچھ خبروں کو انڈر لائن کرلیا پھر حاشیہ دیا۔

شیر علی کی موت سے کچھ دن قبل میرے بچپن کے دوست صحافی محمد علی کی دو رپورٹیں قابل توجہ تھیں۔ ایک میں شہر کی بڑی تعمیراتی کمپنی کی دھاندلیوں کو بے نقاب کیا گیا تھا' دوسری میں پولیس اسٹیشن سے سٹی ہال اور اسمبلی تک ان رشوت خوروں کو ہدف ملامت بنایا گیا تھا جو شہر میں جوئے اور منشیات کے اڈے چلانے والوں کو تحفظ فراہم کرتے تھے۔ پھر محمد علی نے انکشاف کیا تھا کہ پولیس کے کچھ افسر بھاری نذرانے کے عوض جرائم میں ملوث تھے اور پولیس کی ہونے والی کارروائیوں سے جرائم پیشہ افراد کو باخبر کردیا کرتے تھے۔ جس سے وہ لوگ صاف بچ نکلتے تھے بلکہ کچھ لوگوں کی ضمانتیں قبل از گرفتاری بھی منظور کروادی جاتی تھیں اور ان کی ضمانتیں بھی جائیداد کے جعلی کاغذوں پر منظور کی جاتی تھیں۔ پھر آخر میں محمد علی نے انکشاف کیا تھا کہ شیر علی اب بدعنوانیوں کی تحقیق کرتا ہوا حقائق بے نقاب کرنے ہی والا ہے۔

''اور ان خبروں کے چند روز بعد شیر علی نے خودکشی کرلی' یہ بھلا کس طرح ممکن ہے۔'' میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ ''ضرور بدعنوان لوگ شیر علی کے قتل میں ملوث ہیں۔ میں انہیں گھسیٹ کر سامنے لاؤں گا۔'' میرا ہاتھ پھیل کر قوت سے سمٹنے لگا۔

شام ہو رہی تھی میں لائبریری سے نکل کے گاڑی میں سوار ہوا اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مکینک میری گاڑی لائبریری کے باہر لے آیا تھا۔

میں کپڑے بدل کر لیٹنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ملازم نے اطلاع دی کہ ایک نوجوان لڑکی آپ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے وہ کوئی اہم خبر آپ کو سنانا چاہتی ہے۔ میں جلدی جلدی ننگے پاؤں ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

لڑکی خوب صورت اور جاذب نظر تھی نیلے لباس' نیلے سینڈل اور نیلگوں لپ اسٹک اور ناخن پالش کے استعمال سے وہ کوئی نیلم پری ہی دکھائی دیتی تھی۔ ''ناصر صاحب! میرا نام نیلم ہے۔'' لڑکی نے تعارف کرایا اور اپنی بات ختم کرکے میرے سامنے صوفے میں اشارہ پاکر دھنس گئی۔

''فرمائیے آپ کس سلسلے میں تشریف لائی ہیں۔'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ناصر صاحب! آپ سے اخبار کی خبروں کے ذریعے تعارف ہوچکا ہے' آپ اپنے بھائی کی موت کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ ایک اخبار نویس کے ذریعے ہی آپ کی رہائش گاہ کا ایڈریس ملا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

''آگے فرمائیے۔'' میں نے دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے بہنوئی جلال خان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز میں نفرت سی امڈ آئی۔

"کہیے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ اب مٹھیاں دبا رہی تھی۔

"آپ کے بہنوئی غاصب ہیں' میرے والد نے ورثے میں میری والدہ اور میرے لیے رائیونڈ روڈ پر سیٹھ عابد کی اسکیم کے پاس ایک بڑا زرعی فارم ہاؤس چھوڑا تھا' پچھلے دنوں میں اپنی والدہ کے ساتھ خالہ کے ہاں کراچی گئی ہوئی تھی۔ آپ کے بہنوئی نے کسی اپنی واقف کار عورت کو جعلی کاغذات کے ساتھ کھڑا کرکے ہمارے زرعی فارم کو فرضی طور پر خرید لیا ہے۔ ان کے کارندے ہمیں فارم ہاؤس پر داخل نہیں ہونے دے رہے۔ ہماری کوئی نہیں سن رہا۔ حالانکہ ہمارے پاس اس فارم کے کاغذات موجود ہیں' لیکن انہیں جعلی قرار دیا جارہا ہے۔"

"آپ عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹائیں۔ میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"اس ملک کی عدالتیں تو برسر اقتدار لوگوں کا ہی ساتھ دیتی ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں دھمکایا جارہا ہے کہ عدالت یا میڈیا سے دور رہیں ورنہ کسی بھی سنسان سڑک پر کسی حادثے کا پیش آجانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میری والدہ خوف زدہ ہوگئی ہیں۔ ایک ٹرک نے انہیں کچلنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن قسمت اچھی تھی وہ بروقت بچ گئیں۔ ٹرک کا پہیہ کچھ انچ کے فاصلے سے گزر گیا ہوسکتا ہے' یہ دھمکی کا عملی نمونہ ہی ہو۔"

لڑکی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"پھر میں اس سلسلے میں کیا کروں؟" میں نے سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

"آپ حق کی جستجو کررہے ہیں' آپ ہمارا ساتھ دیں اور میڈیا اور قانون سے ہمارے حق کے لیے بات کریں۔"

"ٹھیک ہے میں کاغذات دیکھنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرسکتا ہوں۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟"

"اسی روڈ پر تین میل آگے جاکر آبادی سے تھوڑا الگ تھلگ جگہ پر ہے۔ دراصل ہمارے پاپا کو شور و غل اور شہر کی ہاؤ ہو سے نفرت تھی وہ پرسکون ماحول میں رہنا پسند کرتے تھے۔"

"ٹھیک ہے چلیے۔" میں نے بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ہم رائیونڈ روڈ پر تین میل دور اس لڑکی کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ ایک پرانی کار میں سوار تھی اور میں اپنی نئی کرولا چلا رہا تھا۔

دونوں گاڑیاں گیٹ سے گزر کے ایک احاطے میں داخل ہوگئیں۔ پختہ روش کے دونوں جانب سرسبز و شاداب درختوں جھاڑیوں اور پھولدار پودوں کے تختے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ گیراج نما جگہ پر ہم گاڑیوں سے نیچے اترے۔ پھر میں اس کے ساتھ چلتا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اس کی والدہ ڈرائنگ روم میں ہی موجود تھیں۔ وہ خاصی کمزور اور نڈھال سی تھیں سر کے بال سفید تھے اور چال میں کچھ لنگڑاہٹ بھی تھی۔ وہ مضطرب اور پریشان دکھائی دیتی تھیں۔

"کیا ناصر صاحب آگئے؟" اس کی والدہ نے استفسار کیا۔

"ہاں اماں! یہ ناصر صاحب ہی ہیں۔"

"بیٹھو بیٹا بیٹھو۔" نیلم کی ماں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا پھر ملازم کو آواز دے کر چائے لانے کا کہنے لگی۔

رسمی خیر خیریت کی گفتگو کے بعد نیلم کی والدہ نے بھی بہنوئی صاحب پر قبضے کا الزام عائد کیا اور پھر دوسرے کمرے میں جاکر الماری سے زرعی فارم کی رجسٹری اور کچھ دوسرے کاغذات لے آئی۔ میں نے کاغذات چیک کیے وہ درست معلوم ہوتے تھے۔ میں نے سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اماں جی! میں بہنوئی صاحب اور متعلقہ افراد سے بات کرنے کے بعد دوبارہ آپ سے رابطہ قائم کروں گا۔ میری پوری کوشش ہوگی میں آپ کو آپ کا حق دلا دوں۔"

"بہت بہت شکریہ بیٹا! تم ایک اچھے انسان اور سچے مسلمان ہو۔ تم اپنے بھائی کی موت کے بارے میں بھی فکرمند ہو' اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب و کامران کرے۔" بوڑھی اماں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ انکار کے باوجود بوڑھی عورت مجھے گیراج تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ساتھ چلی آئی۔ گیراج لوہے کی ترچھی چھت والا ایک کھلا مقام تھا۔ جسے چھوٹے چھوٹے پودوں سے گھیر دیا گیا تھا۔ عین اس لمحے ہم سب فائروں اور پھر کتوں کی خوفناک چیخوں سے لرز اٹھے۔ صدر دروازے کے پاس چوکیدار زخمی پڑا تھا اور تین نقاب پوش اپنے ریوالوروں سے نیلم کے حفاظتی کتوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ خون ان کے جسموں سے ابل رہا تھا۔ وہ بدمعاش تیزی سے بھاگتے ہوئے ہمارے قریب آگئے۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔" ایک لمبے قد والے غنڈے نے غراتے ہوئے کہا۔ ہم نے ہاتھ اوپر اٹھادیے۔ پھر وہ لمبا غنڈہ بڑھیا سے مخاطب ہوا۔ "بوڑھی تمہیں جلال خان صاحب نے منع کیا تھا کہ کسی قسم کا شور مچانے سے گریز کرنا اور تم نے اپنی لڑکی کو جلال صاحب کے سالے کے پیچھے لگادیا۔ جاؤ اس کے ساتھ جاکر فارم کے کاغذات لے آؤ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری' ہمارا ایک ساتھی اندر گھس کر تمہاری ہونے والی گفتگو سن چکا ہے۔" غنڈے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

دونوں غنڈے نیلم کی ماں کو گھسیٹ کر لے گئے اور کاغذات سمیت واپس آئے' نیلم کی ماں بے ہوش سی ہوکر گر پڑی تھیں میں خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ غنڈے کا پستول پوری طرح میری طرف تنا ہوا تھا۔ "کیا اس غنڈہ گردی کے بعد تم لوگ بچ سکو گے۔" میں نے پھنکارتے ہوئے بدمعاش سے کہا۔

"ہاں اس کے بعد ان ماں بیٹیوں کے پاس کیا ثبوت رہ جائے گا۔" بدمعاش غرا کر بولا۔

"میں جلال خان اور تمہاری غنڈہ گردی کے خلاف پولیس کو بیان دوں گا۔" میں نے پراشتعال لہجے میں کہا۔

"اس کا بھی بندوبست کرلیا جائے گا' فی الحال آپ کے لیے بہنوئی صاحب کا یہ پیغام ہے کہ فالتو معاملات میں ٹانگ مت اڑائیں۔"

دراز قد غنڈے نے مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا پھر غنڈوں نے ہم تینوں کے ہاتھ رسیوں سے جکڑ دیے اور کاغذات لے کر بیرونی دروازے سے نکل کے زوردار آواز سے دروازے کو بند کرتے ہوئے غائب ہوگئے۔ جتنی دیر میں میں نے اور نیلم نے کھڑکی کے ایک ٹوٹے شیشے سے ہاتھوں کی رسیاں کاٹیں غنڈے بہت دور نکل گئے تھے' پولیس کو اطلاع کی لیکن کچھ پتا نہ چلا۔

♥♥♥

میں غصے میں بھرا ہوا جلال محل میں جلال خان اور فوزیہ کے سامنے کھڑا تھا۔ "غنڈہ گردی کی انتہا کردی آپ کے غنڈوں نے' بہنوئی صاحب' میری آنکھوں کے سامنے بوڑھی عورت کے کاغذات چھین کے ہمیں رسیوں سے باندھ کے دھمکاتے ہوئے نکل گئے۔" میں نے غصے سے سلگتے ہوئے کہا۔

"ڈیئر بھائی جان یہ ضرور تمہارے بہنوئی کے خلاف مخالفین کی کوئی سازش ہے' وہ فارم میرے سامنے خریدا گیا تھا۔" فوزیہ نے مستحکم لہجے میں مکا

ہتھیلی پر جمایا۔

''یہ مجھے بدنام کرنے کا اسٹنٹ ہے۔'' بہنوئی صاحب نے پریقین لہجے میں کہا۔''اب ان کے کاغذات چھین لیے گئے ہیں اب کاغذات کا تقابل کس طرح ہوسکتا ہے۔ وہ بضد ہوں گی کہ ان کے کاغذات اصلی ہیں حالانکہ جو کاغذات ہمارے پاس ہیں انہیں حکومتی مشینری چیک کرچکی ہے۔''

''آپ کی حکومتی مشینری بھی تو آپ کے اشاروں پرناچتی ہے۔'' میں نے زہرخند کے ساتھ کہا اور باہر نکل آیا۔

میں گھر واپس آیا تو ملازم نے ایک نئی جیکٹ کا پیکٹ میرے حوالے کردیا جو میرے ایک دوست نے میری فرمائش پر بھیجا تھا۔ یہ نئی جیکٹ میں نے خاص طور پر اپنے لیے بنوائی تھی۔ میں نے جیکٹ پہن کر اس کا جائزہ لیا وہ خوب صورت جاذب نظر اور مضبوط تھی۔ میں ایسی ہی جیکٹ پہننے کا عادی تھا۔ میں کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے بیڈ روم میں چلا گیا۔ لیکن مجھے نیند نہ آسکی۔ میں بے چینی کے عالم میں اٹھ کر شیر علی کے اسٹڈی روم کی طرف چلنے لگا۔ میں ایک بار پھر کسی خفیہ دستاویز کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی میں موڑ مڑ کر اسٹڈی روم کے سامنے پہنچا۔ اسٹڈی روم کی کھڑکی سے میں نے اندر اندھیرے میں روشنی مختلف مقامات پر گردش کرتی دیکھی۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے منگوایا جانے والا حفاظتی ریوالور نکال لیا اور آگے بڑھا۔

اسٹڈی کے دروازے کو دھکیلا دروازہ کھلا تھا۔ میں پستول تانے ہوئے اچانک اندر داخل ہوگیا۔ میں نے پستول سے منسلک ٹارچ روشن کرلی۔ روشنی کا دائرہ شیر علی کی رائٹنگ ٹیبل پر موجود ایک سیاہ وجود پر پڑا اسے دیکھتے ہی میں چونک اٹھا۔

''میرے دوست ناصر گولی مت چلانا۔'' محمد علی نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''تم......تم اس جگہ چوروں کی طرح کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ناصر......ناصر ہم خفیہ دستاویز تک پہنچ گئے۔'' محمد علی نے میز سے بھاری ڈکشنری کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر اسے کھول کر اس نے دو جڑے ہوئے صفحوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ناصر! میرے دوست اور تمہارے بھائی شیر علی نے مرنے سے کچھ دیر قبل مجھے فون کیا تھا کہ میں بدعنوانیوں کا ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ یہ کاغذات اس نے ایک خوب صورت لڑکی کے ذریعے اس شہر کے ایک بدنام ہوٹل کے منیجر کے کمرے سے غائب کرواکے حاصل کیے ہیں۔ ان کاغذات کے ساتھ اس نے نوٹ لکھ کر رکھ دیا تھا۔ جسے میں نے ابھی ابھی پڑھا ہے اور بدعنوانیوں اور شیر علی کے قاتل کو بھی پہچان چکا ہوں۔''

محمد علی کے منہ سے الفاظ گولی جیسی رفتار سے نکلے لیکن اس وقت کمرہ گولی کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا جو باغ کی سمت کھلتی تھی۔ گولی اس طرف سے آئی تھی۔ محمد علی دل کے مقام پر ہاتھ رکھے کرسی سے نیچے گر گیا۔ اس کا سینہ خون کے آنسو رونے لگا۔ میں نے پستول کا رخ کھڑکی کی طرف کیا اور آگے بڑھ کر ٹارچ کی روشنی باہر پھینک کر جائزہ لینے لگا اس وقت کھڑکی کے باہر سمٹے قاتل نے ہاتھ بڑھا کر میرا ریوالور چھین لیا پھر وہ اچھل کر اندر آکودا اور میں اسے دیکھ کر حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ انسپکٹر کامران تھا۔

''اوہ تو وہ قاتل تم ہو جس نے شیر علی کو موت کے گھاٹ اتار کے خودکشی کا ڈرامہ ظاہر کیا۔ اس طرح تم نے میرے پیچھے پیچھے جاکر نادیہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا کہ وہ کہیں مجھے سچ کے راستے پر نہ ڈال دے۔'' میں نے درشت لہجے میں گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں ناصر صاحب اور اب آپ کو بھی موت کے گھاٹ اتار کے میں اپنا پرائیویٹ ریوالور بریٹا 93 تمہارے دوست کے ہاتھ میں تھمادوں گا۔ جس ریوالور سے محمد علی کو گولی ماری ہے وہ تمہارے ہاتھ میں تھمادوں گا۔ اس طرح تم دونوں ایک دوسرے کے قاتل کے طور پر مردہ شناخت کیے جاؤ گے۔''

انسپکٹر کامران نے میرا ٹارچ والا ریوالور جیب میں ٹھونس کر ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا پستول نکال لیا۔ جس کی نال کے اوپر چھوٹا سا ناگ بنا ہوا تھا۔

''میں خواہ مخواہ اپنے بہنوئی اور بہن پر شک کرتا رہا اور قاتل آستین کا سانپ نکلا۔'' میں کسی سانپ کی مانند ہی پھنکارا۔

''ہاں۔ میں ہی وہ بدعنوان پولیس افسر ہوں، جس کے اشاروں پر جرائم کے اڈے چلتے ہیں اور وہ اطلاع کر غائب ہوجاتے ہیں۔ تمہیں مار کر تمہارے بھائی کا حاصل کردہ ثبوت لے کر میں محفوظ ہوجاؤں گا۔'' انسپکٹر کامران نے خوفناک لہجے میں کہا۔

میں انجام کی پروا کیے بغیر تیزی سے انسپکٹر کامران کی طرف بڑھا، اس نے چونک کر سرخ پستول سے پے در پے دو فائر کیے، گولیاں میرے سینے پر لگیں لیکن میں مسکراتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ میں اپنے دوست کی روانہ کی گئی نئی بلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسے میں نے اتارا نہیں تھا۔ انسپکٹر کامران حیرت وخوف کے عالم میں مجھے اور پستول کو دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنا ریوالور اٹھا کر دستہ میرے سر پر مارنا چاہتا تھا میرے آہنی مکے نے اس کا سر چکرا دیا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر زور سے گھونسا مارا تھا۔ میں کسی زمانے میں باکسنگ بھی کرتا رہا تھا۔ وہ میرے مکے کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگیا۔

میں نے ڈکشنری سے جڑے ہوئے صفحوں سے خفیہ دستاویزی کاغذات نکالے۔ یہ ان رقوم کی تفصیلات تھیں اور ساتھ ہی انسپکٹر کامران کی جرائم پیشہ گروہ کے سرغنہ کو فراہم کردہ تفصیلات تھیں۔ ان کاغذات میں جرائم کے اڈوں اور رقومات کی تفصیلات بھی درج تھیں۔

کچھ دیر بعد میرا بہنوئی، فوزیہ اور پولیس کے آفیسر صحافی کمرے میں موجود تھے۔ دستاویزات پر سب کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ سب نے مجھے پر تحسین نگاہوں سے دیکھا۔ فوزیہ نے میری نئی بلٹ پروف جیکٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا لیکن میں بہن اور بہنوئی سے شرمندہ اور خجل ہوکر کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ اگلے روز یہ بھی ثابت ہوگیا کہ میرے بہنوئی نے اصلی کاغذات خرید کر زرعی فارم لیا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں مخالف سیاسی پارٹی کے اشارے پر ڈرامہ کررہی تھیں۔

♥

بھرعشق

ریاض بٹ

مکرمی عمران احمد!
اللہ بزرگ و برتر آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے آمین۔ آپ کی ہمت اور کاوشوں کے باعث ہم لکھنے والوں میں کئی نئے نام دیکھ رہے ہیں۔ وگرنہ کئی با صلاحیت لوگ بس لکھنے یا پھر لکھ کر اپنی تحریر کسی جریدے کو بھیجنے کا سوچ کر ہی رہ جاتے ہیں۔ بہر حال ایک اور تفتیشی کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ اور قارئین کے مزاج پر پورا اترے گی۔

والسلام
ریاض بٹ
حسن ابدال

یہ وہ دور تھا جب جوانوں کے مشغلے صحت مند ہوتے تھے۔ کبڈی، پتھر اٹھانا، نیزہ بازی، کشتی اور ان جیسے دوسرے کھیل، عشق، محبت بھی ہوتی تھی لیکن سلیقے سے۔ ساتھ نبھائے جاتے تھے۔ وعدے وفا کیے جاتے تھے۔ اب میں کہانی کی طرف آتا ہوں۔ میں ابھی تھانے میں آیا ہی تھا کہ اطلاع آئی کہ قریبی گاؤں کے میدان میں ایک جوان کی لاش پڑی ہے۔ جسے شناخت کرلیا گیا ہے۔

میں نے ضروری تیاری کے بعد دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور جائے واردات پر پہنچ گیا۔

یہ ایک بہت بڑا میدان تھا۔ یہاں تقریباً ہر قسم کے کھیل ہوتے تھے۔ مقتول کا نام افتخار بتایا گیا۔ اس کے والدین ایک طرف کھڑے رو رہے تھے خاص کر ماں (جس کا نام بعد میں بھاگ بھری معلوم ہوا) سینہ کوبی کرتے ہوئے اونچی آواز میں بین کر رہی تھی۔ ہم نے اپنا کام کرنا تھا۔ وہ ہم نے شروع کردیا۔

لاش پیٹ کے بل پڑی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ گلے میں ایک رسی لپٹی ہوئی تھی اور اس کی گانٹھ بہت سخت اور تنگ تھی۔ میں نے گانٹھ کھول کر رسی کو گردن سے علیحدہ کیا۔

مقتول کو اسی رسی سے قتل کیا گیا تھا۔

زمین ظاہر ہے کچی تھی۔ اس لیے کھروں کے نشان بڑے واضح تھے۔ لگتا تھا بے خبری میں مقتول کو قتل کیا گیا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئی تھیں۔ گردن سوج گئی تھی۔ ایک بات بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ مقتول کے کپڑے پاس ہی پڑے تھے اور اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا۔

ضروری کارروائی کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی۔ ایک سپاہی کو ساتھ بھیج دیا۔

دوسرا سپاہی میرے ساتھ تھا۔ گاؤں کا نمبر دار میرے آگے پیچھے بچھا جا رہا تھا۔

ہم اس کی بیٹھک میں جا کر بیٹھ گئے۔ میدان میں تین درجن مرد و زن تھے جو تتر بتر ہوگئے تھے۔ اس دوران مقتول کی ماں بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسے گاؤں کی عورتیں لے گئی تھیں۔

ہم نے مقتول کے باپ کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اس کا بڑا خوب صورت اور اچھا نام تھا۔ لیکن بگاڑ دیا گیا تھا۔ نام غلام مصطفیٰ تھا لیکن اسے گاما کہتے تھے اسے چاہے کم علمی، جہالت اور بے وقوفی کہہ لیں لیکن بات غلط ہے۔ بہر کیف اس بات کو آپ کی سوچوں کی نذر کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

غلام مصطفیٰ کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ آنکھوں

سے آنسو رواں دواں تھے۔ شانے ڈھلک گئے تھے۔ سر ڈول رہا تھا۔ مختصراً یہ کہ ہر اعضاء سے اضطراب مترشح تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے چند سوالوں کے جواب دیے اور ہم نے اسے گھر بھجوادیا۔

"کچھ باتیں نمبر دار نے بتائیں۔

کہانی کچھ یوں بنی کہ افتخار ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی ایک بہن تھی۔ جو ذہنی مریضہ تھی۔ جس کی وجہ سے ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

افتخار باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ اسے کبڈی اور نیزہ بازی کا بھی شوق تھا۔

صبح صبح یعنی ابھی اندھیرا ہی ہوتا تھا۔ وہ میدان میں آ کر ورزش کرتا تھا۔ یہ جون کے آخری دن تھے۔ میدانی علاقوں میں تو بلا کی گرمی پڑتی تھی۔ مگر جیسا کہ آپ کے علم میں ہے میرا موجودہ تھانہ جہاں واقع تھا وہاں سردیوں میں سخت سردی اور گرمیوں میں موسم خوش گوار ہوتا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی دن تھے۔

باپ نے بتایا تھا افتخار آج بھی معمول کے مطابق گھر سے نکل گیا تھا۔ نمبر دار نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ افتخار کردار کا پکا تھا۔ اس کی کبھی ایسی ویسی بات نہیں سنی گئی تھی۔ اس کا قریبی دوست کلیم تھا۔ جس کی عمر مقتول کے تقریباً برابر ہی تھی۔ مقتول کا گھر میدان کے قریب ہی تھا۔ وہ سب سے پہلے آتا تھا۔

اس کے بعد کلیم آتا تھا۔ باقی دوست شام کو آتے تھے۔ صرف چھٹی کے دن یعنی اتوار کو صبح آتے تھے۔ یہ کبڈی کی ٹیم کے کھلاڑی تھے۔ کپتان افتخار تھا۔ کلیم کے باپ کی گاؤں میں کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔

آج کلیم نہیں آیا تھا۔ اس کے متعلق پتا چلا کہ وہ صبح صبح شہر چلا گیا تھا۔ مہینے میں ایک دن وہ دکان کے لیے سودا سلف لینے شہر جاتا تھا اور اس کی واپسی شام ڈھلے ہوتی تھی۔

اب ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ ہم واپس تھانے آ گئے۔

یہاں اے ایس آئی رانا تنویر میرے کمرے میں میرا منتظر تھا۔

میں نے اب تک کی تفتیش سے اسے آگاہ کیا۔

افتخار کے متعلق اس نے بتایا کہ کسی کے دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے لیکن اس کے خیالات بھی وہی ہیں۔ جو گاؤں والوں کے یا نمبر دار کے ہیں۔

کلیم کے متعلق میں نمبر دار کو کہہ آیا تھا کہ جونہی واپس آئے تھانے بھیج دینا۔ موبائل کا دور تو تھا نہیں کہ فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کرلیا جاتا۔

اس کے خلاف میرے ذہن میں کوئی شک نہیں تھا۔ صرف چند باتیں پوچھنا تھیں۔ مگر دوسری صبح تک جب وہ تھانے نہیں آیا تو مجھے اس کی ذات شک کے دبیز پردے میں لپٹی نظر آئی۔ ابھی میں کسی سپاہی کو اس کے گھر بھیجنے ہی والا تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی۔ افتخار کا باپ اور کلیم کا باپ آئے ہیں اس وقت میں کمرے میں اکیلا تھا۔ میں نے فوراً دونوں کو بلالیا۔

غلام مصطفیٰ تو خیر پریشان تھا ہی میں نے کلیم کے باپ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑتے دیکھیں۔ اس نے بتایا کہ کلیم ابھی تک واپس نہیں آیا۔ یہ ایک اور دھماکہ خیز اطلاع تھی۔

بہر حال میں نے دونوں کو بٹھایا۔ تسلی دلاسہ دیا اور کلیم کے باپ سے پوچھا۔

"عموماً کلیم کتنے بجے تک گھر واپس آجاتا تھا۔"

"تھانے دار صاحب وہ اگر بہت دیر سے بھی آتا تھا تو نو بجے تک آجاتا تھا۔"

"اوہ......!" میں نے ہنکارا بھرا۔

"کتنے پیسے لے کر وہ گیا تھا۔" اچانک میں نے سوالات کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا۔

"دس ہزار روپے۔" کلیم کے باپ نے آنکھ میں آئے ہوئے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"دس ہزار روپے۔" میں نے اچھلتے ہوئے کہا۔ اس دور کے حساب سے یہ رقم بہت زیادہ تھی۔

"کیا اس سے پہلے بھی اتنی بڑی رقم لے کر وہ شہر جاتا تھا؟"

"نہیں تھانیدار صاحب دراصل پچھلے ماہ میں رقم دے نہیں سکا تھا اس لیے۔" کلیم کے باپ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

بہر حال بات اس نے یہ بتائی کہ وہ ہر ماہ پانچ ہزار روپے لے کر جاتا تھا۔ قارئین آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ پانچ ہزار میں کریانے کی دکان کا سودا؟ وہ ایسا ہی دور تھا۔ دوسرے دکان بھی چھوٹی سی تھی۔ میں نے کلیم کے باپ سے کہا وہ شام تک انتظار کرے۔ اگر وہ شام تک آ جائے تو اسے لے کر تھانے آ جائے۔ اس کے بعد میں نے دونوں کو رخصت کر دیا غلام مصطفیٰ نے رندھی ہوئی آواز میں مجھ سے صرف ایک سوال پوچھا تھا کہ تھانے دار صاحب مجھے بیٹے کی لاش کب تک ملے گی......؟ میں نے اسے کہا تھا کہ دوپہر کے بعد آ جانا۔

وہ تو چلے گئے لیکن میرے لیے ان گنت سوال چھوڑ گئے۔ کلیم کدھر چلا گیا۔ وہ واپس کیوں نہیں آیا؟ کیا اس واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے؟ اس کے ساتھ کیا بیتی؟ میں نے کلیم کے باپ سے اس کے جانے کا وقت پوچھ لیا تھا۔ اس نے صبح کے پانچ کا وقت بتایا تھا۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اے ایس آئی رانا تنویر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں سوچوں کے سمندر سے باہر نکل آیا۔

"سر کیا سوچ رہے ہیں؟"

"بھئی سوچنا کیا ہے۔ وہی پرانی روٹین ہے۔ جب کوئی واردات ہو جاتی ہے تو ہمارے لیے سوچوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔"

"سر یہ بات تو ہے۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوتے کہا اور اس کے جلتے ہوئے سرے کو یوں دیکھنے لگا جیسے اس میں سے کسی ہاتھی کے نکلنے کی توقع کر رہا ہو۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد چائے آ گئی۔ اس موسم میں چائے ہی چلتی تھی۔ چائے کی پیالی کے ساتھ ساتھ اس کا سگریٹ بھی ختم ہو گیا۔ اس دوران ہم اس کیس پر بحث کرتے رہے۔

میں نے اسے بتا دیا تھا کہ کلیم کتنے بجے گھر سے نکلا تھا۔ یہ بات بھی ہمارے علم میں آئی تھی کہ افتخار ساڑھے چار بجے گھر سے میدان میں چلا جاتا تھا۔

"سر ہو سکتا ہے افتخار کو کلیم نے قتل کیا ہو۔" اے ایس آئی نے خیال ظاہر کیا۔

"بڑی دور کی کوڑی لائے ہو۔ لیکن وجہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر وجہ معلوم ہو ہی جائے گی۔" اس نے اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"پھر وہ چلا گیا۔ جاتے جاتے مجھے بتا گیا کہ وہ سلطان محمود کو ساتھ لے جا رہا ہے۔ رانا تنویر ایک ذہین اے ایس آئی تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔

تقریباً دن دو بجے لاش آ گئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ساتھ تھی۔ رپورٹ میں باقی تو سب کچھ وہی تھا جس کا ذکر آ چکا ہے یعنی رسی سے گلا گھونٹا گیا تھا۔ مگر......!

ایک بات چونکا دینے والی تھی۔ مقتول کو قتل کرنے سے پہلے چائے پلائی گئی تھی۔ وقت پانچ اور چھ کے درمیان لکھا تھا۔

یہی بات مجھے بھی کھٹک رہی تھی کہ اتنا ہٹا کٹا جوان قابو کیسے آ گیا تھا قاتل کے۔

تھوڑی دیر بعد غلام مصطفیٰ چار بندوں کے ساتھ آ گیا تھا۔

وہ لاش لے کر چلا گیا اور میں ضروری کاغذات نمٹانے میں لگ گیا۔ اس دوران میں نے دوپہر کا کھانا کھا لیا تھا۔ کیونکہ پیٹ پوجا بھی ضروری ہے۔ شام ڈھلے اے ایس آئی واپس آ گیا۔

"ہاں بھئی رانا صاحب کیا رہی۔ بس اسٹینڈ سے کیا معلومات حاصل ہوئیں؟" میں نے کرسی پر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سر آپ واقعی بہت جاگتا ہوا ذہن رکھتے ہیں۔" اس نے مجھے مکھن لگاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں......!

"بالکل بھئی میں تمہارے تیور پہچان گیا تھا۔"

پھر اس نے مجھے اپنی تفتیش سے آگاہ کیا۔ لیجیے اسی کی زبانی سنیے۔

"سر ہم لاری اڈے پر گئے اس بات کا تو مجھے پتا تھا کہ یہاں چھ بجے کے قریب لاری بڑے شہر کی طرف روانہ ہوتی تھی۔ کلیم کو بس کے کنڈیکٹر نے دیکھا تھا لیکن بقول اس کے وہ پہلی بس میں سوار نہیں ہوا تھا۔ وہ اس وقت شیدے کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی رہا تھا۔ وہ اس بس میں گیا تھا جو ساڑھے چھ بجے روانہ ہوتی ہے۔"

"اچھا یہ تو حیرانی والی بات ہے۔" میں نے اپنی اسٹک کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"اور سر سب سے حیرانی والی بات تو یہ ہے کہ شیدے کو بھی اس کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔"

"یہ شیدا کون ذات شریف ہے۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"شیدا چوہدری احسان علی کا منہ چڑھا نوکر ہے۔"

"اب ذرا چوہدری احسان علی کے جغرافیے سے بھی آگاہ کر دو۔"

"سر آدھی سے زیادہ زمینیں چوہدری احسان علی کی ہیں۔ انتہائی مغرور اور خود غرض شخص ہے۔ شیدے جیسے کئی اور سور ما اس کے دست و بازو ہیں۔ دو بیٹیاں ہیں۔ ایک کا نام بانو اور دوسری کا نینا ہے۔" اے ایس آئی نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تم نے بڑے غور سے دونوں کو دیکھا ہے۔"

"سر بس اس قسم کی معلومات رکھنا ہماری مجبوری ہے۔" وہ نیا سگریٹ سلگانے کے لیے ذرا خاموش ہوا پھر بولا۔

"مقتول کا باپ جس زمین پر کاشت کاری کرتا ہے وہ بھی چوہدری احسان علی کی ہے۔"

"ہو سکتا ہے چوہدری سے ملاقات کی ضرورت محسوس ہو۔" میں نے کہا۔

"سر جب آپ حکم کریں۔"

پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔

قارئین ہم نے جائے واردات پر پائے جانے والے کھروں کے فوٹوز بنا لیے تھے ان کا ذکر فی الحال مناسب نہیں۔

اگلی صبح تھانے پہنچ کر میں نے تھانے کا انتظام اے ایس آئی کے سپرد کیا اور ایک سپاہی کو لے کر کلیم کے گھر پہنچ گیا۔ ایک بات بتانا اس گورکھ دھندے میں بھول گیا ہوں کہ رات جب میں تھانے سے اٹھ رہا تھا تو کلیم کا باپ آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کلیم ابھی تک واپس نہیں آیا آپ اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھ لیں۔ وہ رو رہا تھا۔ میں نے ہمدردی سے اس کا کاندھا تھپکتے ہوئے اسے محرر کے پاس بھیج دیا تھا۔ کلیم کے باپ نے آج دکان نہیں کھولی تھی۔

اس نے ہمیں عزت سے بٹھایا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود چائے اور دوسرے لوازمات لے آیا۔ میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"دیکھیں بزرگوار آپ کا بیٹا لاپتا ہو گیا ہے۔ ہمیں کوئی اشارہ، کوئی شک کی بات بتائیں گے تو بات بنے

گی۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”تھانے دار صاحب ہماری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے اور نہ میں کسی پر شک ظاہر کرسکتا ہوں۔“

”آپ نے بڑے شہر کے اس آڑھتی سے کوئی رابطہ کیا ہے۔ میرا مطلب ہے ٹیلی فون پر۔“ میں نے اچانک ایک خیال کے تحت پوچھا۔

”میری تو مت ہی ماری گئی ہے۔ تھانے دار صاحب۔“ اس نے اپنے سر پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے جواب دیا۔ ”چوہدری صاحب کے گھر میں فون ہے۔ میں رابطہ کروں گا۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ خود ہی شہر چلا جاؤں۔“

”اب آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں گیند اب ہماری کورٹ میں ہے اور چوہدری کی حویلی کی طرف بھولے سے بھی نہ جائیں۔“ میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”بس ذرا آڑھتی کا ٹیلیفون نمبر دے دیں اور پتا بھی۔“

”آپ بادشاہ ہیں تھانے دار صاحب! لیکن اگر مناسب سمجھیں تو وجہ بھی بتادیں۔“

”ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ تسلی رکھیں۔ جو بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا۔“

اس نے ہمیں ٹیلیفون نمبر اور پتا دیا اور ہم تھانے میں واپس آگئے۔ ہم کلیم کے باپ کو تسلی تو دے آئے تھے لیکن ہمیں سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس مسئلے میں شیدے جیسے بدمعاش کا پایا جانا نیک شگون نہیں تھا۔ وہ چوہدری جیسے خودسر شخص کا چہیتا تھا ایسے لوگ قانون کو گھر کی باندی اور جرائم کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

فی الحال میں چوہدری کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ میں نے سلطان محمود کی ڈیوٹی لگادی کہ وہ شیدے کی سن گن رکھے اور وہ جونہی نظر آئے اسے پکڑ کر تھانے لے آئے اسے سفید کپڑوں میں رہنا تھا دوپہر کا کھانا کھا کر میں اے ایس آئی کا انتظار کرنے لگا۔ میں جونہی تھانے میں داخل ہوا تھا وہ مجھے بتا کر کہیں چلا گیا تھا۔ اس نے دو گھنٹے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔

اپنے وعدے کے مطابق وہ آگیا۔ میں نے اسے ساری بات سمجھائی اور دو سپاہیوں کو لے کر بڑے شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہم سفید کپڑوں میں تھے اور ایک ایسی گاڑی میں تھے جسے کوئی بھی پولیس کی گاڑی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

گاڑی ہم نے ایک تھانے میں کھڑی کی اور تھانے دار کو ساری صورتِ حال بتائی۔ اس نے ہماری خوب آؤ بھگت کی اور مجھے کہا۔

”خالد بھائی آپ اپنے دونوں سپاہی یہیں رہنے دیں اور میں آپ کو اپنے دو اہلکار دے دیتا ہوں۔“ مجھے اس کی تجویز معقول لگی اور میں اس تھانے کے دو اہلکاروں کے ساتھ منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اہلکار باقاعدہ وردی میں تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ اسی تھانے کی حدود میں ہماری منزل آتی تھی۔

شہر کا نام میں نہیں لکھوں گا البتہ اتنا بتا دیتا ہوں کہ وہاں مختلف اجناس کی بہت بڑی منڈی تھی اہلکار مجھے سیدھا دکان پر لے گئے۔ جب دکان کے مالک سے میں نے اپنے آنے کا مقصد بمع تعارف بیان کیا تو وہ مرعوب ہوگیا اور ہمیں اپنے دفتر میں لے گیا۔ دکان کے دو حصے تھے۔ پیچھے گودام تھا اور آگے ایک کونے میں دفتر بنا ہوا تھا ہمارے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی اس نے گرما گرم جلیبی اور دودھ کا آرڈر دے دیا۔

اس نے بتایا کہ کلیم واقعی ہر مہینے آتا تھا لیکن اس بار نہیں آیا تھا اس نے اس کی بھی تصدیق کی کہ کلیم کا دس ہزار روپیہ ہوگیا تھا ہم نے باتوں باتوں میں اندازہ لگالیا تھا کہ کلیم کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ نہیں ہے ہم وہاں سے اٹھ آئے۔

اے ایس آئی نے مجھے شیدے کا حلیہ بتا دیا تھا اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اس بڑے شہر میں بازار حسن بھی ہے۔ تھانے سے منڈی کا فاصلہ پیدل بامشکل دس منٹ کا تھا۔ میں نے دونوں اہلکاروں کو واپس کردیا انہیں کہہ دیا کہ میں آتا ہوں کلیم کا حلیہ بھی مجھے اس کے باپ نے بتا دیا تھا۔ اب میرے قدم بازارِ حسن کی طرف بڑھنے لگے اس وقت بازار ویران پڑا تھا۔ یہاں پر زیادہ تر رونق رات کو ہوتی تھی۔ البتہ عصمت فروشی دن کو بھی ہوتی تھی لیکن چوری چھپے۔

کہتے ہیں جب کوئی کام یا مقصد حاصل ہونا ہوتا ہے۔ تو سبب خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔ میں ایک پان سگریٹ کی دکان پر جا کھڑا ہوا اور اس سے وہ سگریٹ مانگے جو اے ایس آئی پیتا تھا۔

میں نے اسے شیدے کا اور کلیم کا حلیہ بتا کر کہا کہ یہ دونوں میرے بھائی ہیں اور گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ ”یہ یہاں کبھی نظر آئے ہیں۔“ پان سگریٹ فروش نے کہا کہ ایک کل نظر آیا تھا۔ یہ شیدا تھا۔

کڑیاں ملنی شروع ہوگئی تھیں لیکن کلیم کی گمشدگی ہنوز سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کلیم اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کسی کو چاہے کسی وجہ سے قتل کیا جائے قاتل مضطرب اور بوکھلایا بوکھلایا رہتا ہے اور اگر اس کے پاس پیسا آجائے تو وہ بازارِ حسن خاص کر عصمت فروشی کے اڈے پر ضرور جاتا ہے۔ میرے جیسے دوسرے تھانے داروں کی تفتیشی کہانیوں میں آپ یہ سب کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی اس کیس نے تو میرے دماغ کی چولیں تک ہلا دی تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری کھوپڑی میں جتنا بھیجا ہے اسے یہ کیس کھا گیا ہے۔ شہر کے تھانے میں واپس آکر میں نے اپنی تفتیش سے اپنے بھائی بند کو آگاہ کیا اور شیدے اور کلیم کے حلیے بتا کر اسے دونوں کی تلاش کی ذمہ داری سونپی ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ایک کل بازار حسن میں دیکھا گیا ہے اس نے ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

جب ہماری گاڑی اپنے تھانے میں داخل ہورہی تھی تو اجالا آہستہ آہستہ اندھیرے میں مدغم ہورہا تھا۔

میں بہت تھک گیا تھا اس لیے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تاکہ صبح تازہ دم ہوکر تفتیش کی گاڑی کو ڈرائیو کرسکوں۔ اگلی صبح واقعی میں تازہ دم ہوچکا تھا۔

ابھی مجھے اپنی کرسی پر بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ رانا آگیا اس نے مجھے بتایا۔

”سر کلیم اور شیدا تو ایسے غائب ہوگئے ہیں جیسے کبھی گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوئے تھے۔“

”بھئی ذرا حوصلہ رکھو۔ بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنا کون سا آسان کام ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہاری بات تو معقول ہے۔ ہم شیدے کے سلسلے میں اسے ٹٹول سکتے ہیں۔“

لیکن چوہدری احسان کی حویلی میں جانے کی نوبت نہیں آئی وہ خود ہی تھانے میں آگیا۔

چوہدری کی عمر کا اندازہ ہم نے پچاس کے اریب قریب لگایا۔ رنگ اس کا سفید تھا چہرا لمبا اور ماتھا تنگ تھا۔ آنکھیں چیخ چیخ کر اعلان کررہی تھیں کہ بندہ انتہائی درجے کا خود غرض ہے اس نے دوگھوڑا بوسکی کی قمیص اور اعلیٰ کوالٹی کے لٹھے کی شلوار زیب تن کی ہوئی تھی۔ مونچھوں اور سر کے بالوں کو خوب رنگا ہوا تھا۔ ہم نے اسے بٹھایا اور آنے کا مقصد پوچھا۔

”جناب آپ کے ہوتے ہوئے کیا اندھیر نگری مچی ہوئی ہے۔“ اس نے فرعونیت بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا ہوا چوہدری صاحب!“ میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے میں اس سے مرعوب ہوگیا ہوں۔

”پہلے افتخار قتل ہوا پھر کلیم لاپتا ہوگیا اب میرا خاص آدمی شیدا بھی گم ہے۔“ وہ ایسے بات کررہا تھا جیسے ہم سرکار کے نہیں اس کے ملازم ہوں۔

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں غصے کو پی گیا۔ جیسے خون کے گھونٹ پیئے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے چوہدری کی نظر بچا رانا کو اشارہ کردیا کہ وہ خاموش ہی رہے اور نرم لہجے میں چوہدری سے مخاطب ہوا۔ ”ہم

افتخار اور کلیم کے معاملے کی تفتیش کر رہے ہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ شیدا کب سے غائب ہے؟" ابھی میں اس کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہمیں خود شیدے کی تلاش ہے۔

وہ بولا۔

"جس دن افتخار قتل ہوا تھا۔" اس کے بعد چوہدری نے ایک ایسی حرکت کی کہ اے ایس آئی اسے حوالات کی ہوا کھلانے کے درپے ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کو ٹھنڈا کیا اور چوہدری کو رخصت کر دیا۔

دراصل چوہدری نے میری میز پر نوٹوں کی ایک بڑی گڈی پھینکتے ہوئے کہا تھا۔

"اسے رکھ لیں مجھے اپنا بندہ چاہیے۔ میں کسی کا احسان نہیں لیتا۔"

قارئین میں آپ کو اصل بات بتا دیتا ہوں۔ مجھے یہ سارے معاملات چوہدری کی حویلی اور اس کے اردگرد چکر لگاتے محسوس ہو رہے تھے اس لیے میں نے مصلحت کے تحت یہ سب کچھ کیا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے میں نہ پہلے کسی وڈیرے اور چوہدری سے مرعوب ہوا اور نہ اب ہوا تھا۔ البتہ رقم میں نے رکھ لی تھی۔ یہ بھی اسکیم کا حصہ تھا۔ اس تھانے میں آتے ہی اے ایس آئی نے مجھے تمام مخبروں کے متعلق بتا دیا تھا۔

ان میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ میں نے شالی کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے فیصلے سے اے ایس آئی کو آگاہ کر دیا۔

وہ چلا گیا......!

مجھے چوہدری کا رویہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

شالی نے اگلے دن ہمیں کافی حوصلہ افزا رپورٹ دی۔ جس سے کلیم کا معاملہ ذرا روشنی میں آ گیا لیکن افتخار کا قتل فی الحال دلی دور است والا معاملہ لگ رہا تھا۔

ہم پکا ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ ہمیں یہ بھی توقع تھی کہ شیدا اگر بڑے شہر میں روپوش ہوا ہے تو بازارِ حسن کا چکر ضرور لگائے گا۔ ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میری میز پر رکھے ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف شہر کے تھانے کا انچارج بول رہا تھا۔

"خالد بھائی کیا حال چال ہیں؟"

"اوہ طاہر بھائی، بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں کہو خیریت ہے۔"

"ادھر تو خیریت ہی ہے آپ کا بندہ مل گیا ہے لیکن وہ آپ کو نہیں مل سکتا۔" طاہر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیوں بھئی!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اپنا کوئی بندہ بھیج دیں اس کو ساری بات بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں سپاہی دلاور کو بھیج دیتا ہوں۔" پھر میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل کر دیا۔

سپاہی دلاور نے واپس آ کر مجھے رپورٹ دی تو میرے بیشتر اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔

کلیم قتل ہو چکا تھا اور قاتل شیدا تھا۔ قتل کی وجہ وہ نہیں تھی جو بظاہر نظر آ رہی تھی۔ یعنی دولت...... بے شک دس ہزار روپیہ بہت بڑی رقم تھی اور یہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام والی بات تھی۔ مقصد بھی حاصل ہو گیا تھا اور رقم مفت میں ہاتھ آ گئی تھی۔

قتل جس تھانے کی حدود میں ہوا تھا شیدا اب اس تھانے کا مجرم تھا البتہ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش یہیں آئی تھی۔

وجہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ جب انسان ہوس کا بندہ بن جائے تو وہ اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے اور جب معاملہ چوہدری احسان علی جیسے شخص کا ہو تو جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ گاؤں کی آدھی سے زیادہ زمینیں چوہدری کی تھیں۔ لیکن اس کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ گاؤں کی ساری زمینیں اس کی ہو جائیں کلیم کے باپ کے نام بھی پانچ کنال زمین تھی۔ جس پر چوہدری کی نظریں تھیں۔ وہ کئی بار کلیم کے باپ سے کہہ چکا تھا کہ زمین مجھے دے دو۔ میں تمہیں اتنے پیسے دوں گا جس سے تمہاری دکان بڑی ہو جائے گی کلیم کا باپ چوہدری کے رعب اور دبدبے میں آ کر زمین بیچنے کو تیار ہو گیا تھا لیکن کلیم نے انکار کر دیا تھا اور ایک بار چوہدری کو کچھ تلخ ترش جملے بھی کہہ دیے تھے اس دن سے چوہدری کلیم کو دنیا کے تختے سے اٹھانے کے منصوبے بنانے لگا۔ بڑے شہر میں بھی چوہدری کے چند گرگے رہتے تھے۔ شیدے کو پتا تھا کہ کلیم ہر ماہ بڑے شہر جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ شیدا کلیم کو ان گرگوں کے گھر لے گیا۔ پھر انہوں نے مل کر کلیم کا گلا گھونٹ دیا، پیسے آپس میں تقسیم کر لیے اور کلیم کی لاش ایک ویرانے میں جا کر دبا دی۔ شیدے نے یہ سب کچھ آسانی سے نہیں بتایا تھا بلکہ جب اس کی ہڈیاں مزید ٹھوک بجانے کے قابل نہیں رہی تھیں تب اس کی زبان رواں ہوئی تھی۔ چوہدری کو بھی میرے توسط سے بڑے شہر کے تھانے میں جانا پڑا تھا۔

چوہدری نے صاف انکار کر دیا تھا اس نے بیان دیا تھا کہ شیدا جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے پیسوں کی خاطر کلیم کو قتل کیا ہوگا اور اس کے ساتھیوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

گواہ کوئی نہیں تھا اس بات کا جس کے سامنے چوہدری نے قتل کیا ہو چوہدری نے اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کروالی تھی۔ ایف آئی آر میں اس کا نام ضرور تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وکیل چوہدری کو بچا لے گا۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا تھا لیکن افتخار کے قتل کا معمہ حل ہونا باقی تھا۔

اس کے قتل کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ عورتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔ کلیم قتل ہو چکا تھا کبھی کبھی مجھے شک ہوتا تھا کہ ہو سکتا ہے کلیم نے ہی افتخار کو قتل کیا ہو۔

لیکن وجہ......!

کوئی بلا وجہ کسی کا خون نہیں بہاتا۔ یہ کیس تو میرے حلق کی ہڈی بن گیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کلیم اور

افتخار کا کیس ساتھ ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ کلیم کا کیس تو حل ہو گیا تھا۔ لیکن افتخار.....؟

اس کے علاوہ ایک بات مجھے بری طرح الجھا رہی تھی کہ آخر افتخار کو قتل کرنے سے پہلے خواب آور چائے کیوں پلائی گئی تھی؟ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ورزش کرنے والے درمیان میں کچھ کھاتے پیتے نہیں۔

یہ میری سروس کا طویل ترین کیس تھا۔ تین ماہ کا عرصہ ہو گیا اور یقین کریں اس دوران میں نے ایک کیس کی کامیاب تفتیش بھی کر لی تھی۔ اس کیس کی تفتیش ان شاء اللہ انہیں صفحات پر آئندہ بیان کروں گا۔

چوہدری احسان کا ایک احسان میری میز کی دراز میں پڑا تھا۔ میں موقع کی تلاش میں تھا۔ نہ جانے کیوں میرے من میں یہ احساس سما گیا تھا کہ موقع ضرور آئے گا۔ مخبر اپنا کام کر رہے تھے ہمت ہارنے والا میں نہیں تھا۔ افتخار کا باپ اور ماں کئی بار آ چکے تھے۔ ان کے آنسو اور التجائیں۔ میرے دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام کیے ہوئے تھیں۔

اس وقت دن کے گیارہ بج چکے تھے اے ایس آئی بھی میری طرح پریشان تھا اور کام میں لگا ہوا تھا۔

اچانک سپاہی دلاور اندر داخل ہوا اور مجھے سلوٹ کر کے بولا۔

"سر! رانا صاحب نے آپ کو اسپتال میں بلایا ہے۔"

"اسپتال میں کیوں، بھئی خیر ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"سر نینا" نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے اور وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔"

پھر میں سپاہی کے ساتھ بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا تھا۔ میں نے نینا کو دیکھا۔ واقعی بہت خوب صورت تھی لیکن اس وقت موت کی زردی نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔

وہاں اے ایس آئی موجود تھا۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "سر ڈاکٹر نے کہا ہے اس کے بچنے کی امید صرف دس فیصد ہے۔ اس کا بیان ضروری ہے۔"

ہم دونوں اس کے قریب چلے گئے۔ ڈاکٹر ہمارے ساتھ تھا۔ پوسٹ مارٹم بھی یہی ڈاکٹر کرتا تھا۔ کافی ذہین اور اپنے پیشے میں کہنہ مشق تھا۔ چوہدری احسان بھی ایک طرف پریشان کھڑا تھا اور اس کی گردن جھک گئی تھی۔ بہرحال نینا کی حالت بہت خراب تھی۔ تقریباً بیس پچیس منٹ میں اس نے رک رک کر اور بڑی مشکل سے اپنا بیان لکھوایا۔ بیان اے ایس آئی لکھ رہا تھا اور میرے کان اس کے منہ کے بالکل قریب تھے۔ کیونکہ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ وہ چند گھنٹوں کی مہمان ہے؟ ہم نے اس کے بیان پر ڈاکٹر کے اور دو گواہوں کے دستخط کروا لیے۔ پھر ہم تھانے میں واپس آ گئے۔

شام کو ہمیں اطلاع ملی کہ نینا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔

اب میں آپ کو نینا کے بیان سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ انسان کی نفسیات کیسے کیسے گل کھلاتی ہے ملاحظہ کیجیے۔

نینا نے لکھوایا تھا۔

میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ کہہ رہی ہوں کہ میں نے خود خواب آور گولیاں کھائی ہیں اور یہ بھی اقرار کرتی ہوں کہ افتخار کو میں نے رسی سے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا ہے۔ وہ بے گناہ تھا۔ غلطی میری تھی لیکن میں کیا کرتی؟ اس سے مجھے پیار ہو گیا تھا۔ وہ میرے من میں اتر گیا تھا۔ اسے نکالنا میرے بس سے باہر تھا۔ وہ صبح میدان میں ورزش کرنے آتا تھا۔ میں اکیلی سیر کے بہانے نکل جاتی تھی اور دور دور سے اس کو دیکھتی۔ اس طرح کئی ماہ گزر گئے۔ مجھے کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ میں مضطرب رہتی۔ دن رات ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھی میرا وقت قریب آ گیا ہے، مجھ سے بولا نہیں جا رہا۔ اس لیے بات کو مختصر کرتی ہوں آخر ایک دن میں نے

موقع دیکھ کر اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ وہ حیران نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا آخر میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا کچھ بات کرو.....افو۔

کیا بات کروں بی بی جی آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے، ہم تو آپ کے نوکر ہیں مزارعے ہیں میں نے آپ کے متعلق کبھی بھی اس طرح نہیں سوچا میں غصے میں بھری گھر واپس آ گئی۔ اس کے بعد کئی دفعہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس پر واضح کیا کہ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی لیکن وہ پتھر ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر اس نے یہ کہا کہ میں چوہدری صاحب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ میں نمک حرامی نہیں کروں گا۔

میں نے نیند کے لیے خواب آور گولیاں کھانی شروع کر دیں۔ میری انا کو ٹھیس لگی تھی۔ جذبے بھی اتنے شدید ہوتے ہیں کہ انسان ان کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر افتخار میرا نہیں ہو سکتا تو میں اسے کسی کا بھی نہیں ہونے دوں گی۔ ایک صبح جب سب گھر والے ابھی سو رہے تھے۔ (میں جب جاتی تھی تو وہ سوئے ہوئے ہوتے تھے) میں نے چائے بنا کر تھرماس میں ڈالی اس میں پانچ چھ گولیاں خواب آور ڈالیں اور رسی کا ایک ٹکڑا لے کر میدان کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ مجھے ورزش کرتا ہوا ملا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ تو اس نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے انتہائی کھردرے لہجے میں کہا۔

آپ یہاں نہ آیا کریں۔ اگر آپ آئندہ یہاں آئیں تو......!

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ میں آئندہ نہیں آؤں گی۔ آج آخری بار آئی ہوں۔ چند باتیں کروں گی۔ یہ آخری باتیں ہوں گی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ آخری بار میرے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پی لو۔ میں نے باتوں میں لگا کر اسے چائے پلا دی۔ پانچ چھ گولیوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونی شروع ہو گئیں۔

میرے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ گرنے لگا تو میں نے اس کی گردن میں رسی ڈال دی۔ پھر.....!

قارئین آپ نے دیکھا کہ زہر عشق اس کے تن بدن پر اثر کر چکا تھا۔ جس نے ایک کمزور سی لڑکی سے یہ واردات کروا دی تھی۔

جب نینا کو دفن ہوئے تین چار دن گزر گئے تو میں اور اے ایس آئی چوہدری احسان علی سے ملنے اس کی حویلی پہنچ گئے۔

وہ اپنی خواب گاہ میں بستر پر لیٹا ہوا ملا۔ اس کی حالت دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی فرعون صفت چوہدری ہے۔ جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

ہم نے چند رسمی سی باتیں کیں اور اس کی امانت (نوٹوں کی گڈی) اس کی چارپائی پر رکھ کر واپس آ گئے پہلے نوٹوں کی گڈی میں نے اسے مٹھی میں کرنے کے لیے پاس رکھی تھی۔ ہم اسے بہت کچھ یاد دلانا چاہتے تھے۔ کافی باتیں کرنا چاہتے تھے مگر اس کی حالت دیکھ کر ہماری زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔

کچھ دنوں بعد ہمیں پتا چلا کہ چوہدری احسان علی جو بڑے فخر اور رعونت سے کہتا تھا کہ میں کسی کا احسان نہیں لیتا۔ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ اب وہ ہر کسی سے کہتا تھا۔ میری ساری زمینیں لے لو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے کچھ نہیں چاہیے۔ یہ بات بھی بتا دوں کہ چوہدری کو بذریعہ فون شیدے نے کلیم کے قتل کے متعلق آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ہم سے ڈراما کرنے تھانے میں آیا تھا۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں۔ کہ کھرے میرے ذہن سے نکل ہی گئے تھے۔ لیکن ایک بات سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ جس کام کو جس وقت ہونا ہوتا ہے اسی وقت ہوتا ہے اور جس طرح اس باری تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے اسی طرح ہوتا ہے۔

بزمِ سخن

روبینہ احمد

عبدالمالک کیف......ڈھرکی
تم جو آئے تو راہ گزر سجاؤں گا
ہاں اپنی گلیاں اپنا گھر سجاؤں گا
اک بار یقین ہو جائے ترے آنے کا کیف
دیکھنا پھولوں سے شام و سحر سجاؤں گا

مجاہد ناز عباسی......رحیم یار خان
پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے مجاہد
دل خود کہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

ریاض بٹ......حسن ابدال
میرے آنگن کا تحفہ ہے کچی مٹی کی خوشبو
یہ تحفہ وہ پائے گا جو ساون بن کے آئے گا

انیلا شاہین......حجرہ شاہ مقیم
محبت روح میں اترا ہوا موسم ہے سو جانِ جاں
تعلق ختم کرنے سے محبت کم نہیں ہوتی
بہت کچھ تجھ سے بڑھ کر بھی میسر تھا، میسر ہے
نہ جانے پھر بھی کیوں تیری ضرورت کم نہیں ہوتی

حق نواز......میر پور خاص
امبر نے دھرتی پہ صبح کی چھینٹی چھینٹ اداس اداس
آج کی شب تو اندھی شب تھی آج کدھر سے نکلا چاند
انشاء جی یہ اور نگر ہے اس بستی کی ریت یہی ہے
سب کی اپنی اپنی آنکھیں سب کے اپنے اپنے چاند

ایمن......جہلم
عمر بھی ہم نے گنوا دی محبت کے لیے
زندگی ہار چکی ہے تیری چاہت کے لیے
ہاتھ تیرا نہیں آیا میرے ہاتھوں میں کبھی
ہم ترستے ہی رہے تیری رفاقت کے لیے

قیصر شاہ......لاہور
چاند نکلا تھا مگر رات نہ تھی پہلی سی
یہ ملاقات، ملاقات نہ تھی پہلی سی
رنج کچھ تو کم ہوا آج تیرے ملنے سے
یہ الگ بات کہ وہ بات نہ تھی پہلی سی

شاہدہ سندس......کمالیہ
کبھی یہ زعم کہ تو میرا ہے فقط میرا ہے
کبھی یہ ڈر کہ تو مجھ سے سرگراں تو نہیں
کبھی یہ دعا کہ تجھے جہاں کی خوشیاں ملیں
کبھی یہ خوف کہ تو میرے بغیر خوش تو نہیں

کاشف......ملتان
یہ چار سو کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے
کچھ اس طرح تیری آواز جگمگاتی ہے
میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں رات ڈھلنے تک
جو چاندنی تیری گلیوں سے ہو کے آتی ہے

سعید احمد......گوجرانوالہ
ہر شب ابھرتا تھا اسی طور سے ماہتاب
پہلے تو دل بے قرار کی یہ حالت نہ ہوتی تھی
جب تک خوابوں کی ہوا راس تھی محسن
یوں جاگتے رہنا تو اپنی عادت نہ ہوتی تھی

کنول......لاہور
وہ میرا مسئلہ حل کر گیا ہے
طبیعت اور بوجھل کر گیا ہے
میں جیسے اور ادھورا ہو گیا ہوں
مجھے وہ یوں مکمل کر گیا ہے

ابراہیم......چیچہ وطنی
سنوار نوک پلک ابروؤں میں خم کر دے
گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کر دے
کسی نے چوم کے آنکھوں کو یہ دعا دی تھی
زمین تیری خدا موتیوں سے نم کر دے

تبسم ناز......چشتیاں
اپنے آپ میں سمٹے رہنا اچھا لگتا ہے
چپ رہنا کچھ بھی نہ کہنا اچھا لگتا ہے
ہم نہیں قابل میری جان تیری چاہت کے
پھر بھی تیری چاہ میں رہنا اچھا لگتا ہے

صائم......پشاور
میں کس ہوا میں اڑوں کس فضا میں لہراؤں
دکھوں کے جال ہر اک سو بچھا گیا اک شخص
پلٹ سکوں نہ آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے پر لگا گیا اک شخص

نادیہ نور......ترگ شریف
محبتوں میں خسارے بھی تو ہوتے ہیں
کچھ لوگ جان سے پیارے بھی تو ہوتے ہیں
محبت چاند بن کے اتر آ کرتی ہے آنکھوں میں
پھر اس کی نم پلکوں پہ ستارے بھی تو ہوتے ہیں

فوزیہ بتول......سرگودھا
میری شاعری میں تیرا ذکر ضروری سہی مگر
اس میں کچھ حال ہمارے بھی تو ہوتے ہیں
لوگ محبت کو سمندر جان کے ڈرتے کیوں ہیں
نوران سمندروں کے کنارے بھی تو ہوتے ہیں

کائنات چوہدری......چوٹالہ
اگر ہو سکے تو کرو خود میں کشش پیدا
ہر کسی کو حسرت سے دیکھا نہیں کرتے
ہر شخص نہیں ہوتا ہر شخص کے قابل
ہر شخص کو اپنے لیے پرکھا نہیں کرتے

رضیہ قریشی......خانیوال
مصائب یہ کرتی ہے جس درجہ پیدا
خوشی اس قدر یہ دکھاتی نہیں ہے
زباں ہو اگر اپنے قابو میں ہمدم
مصیبت کوئی پاس آتی نہیں ہے

اقبال......کورنگی کراچی
لوگ کیوں بس کے اجڑ جاتے ہیں کبھی سوچا ہے
کس لیے جاں سے گزر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے
جو نظر آتے ہیں آئینہ سی پوشاکوں میں
وہ بھی مٹی میں اتر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے

امبر ریحان......کالا گوجراں جہلم
کہا اس نے دسمبر میں تیری یادیں ستاتی ہیں
کہا میں نے مری جاناں محبت کب بچھڑتی ہے
کہا اس نے تیری یادیں جلاتی ہیں میرا آنچل
کہا میں نے دسمبر کو چلو پھر سے بلاتے ہیں

مہوش......جھنگ
کس کو خبر تھی زندگی ہنس نہ سکے گی پھر کبھی
بیتے ہوئے خوشی کے دن اشکوں میں ڈوب جائیں گے
تم بھی بنو گے اجنبی ہم بھی نظر چرائیں گے
تیرے لیے او جانِ جاں لاکھوں ستم اٹھائیں گے

صبا پرویز......سرگودھا
رگوں میں تو جیسے کوئی برف پارہ سا رکا ہے
تعلق میں اپنے جو بے مہری ہے سمجھ نہیں آتی
جب چھوڑ ہی دیا تھا تم نے بے وفا کہہ کر ہمیں
پھر یہ ہر خوشی غم پہ رسم و راہ سمجھ نہیں آتی

انیل......گاؤں بدر مرجان
آہٹ پہ میرے پاؤں کی دھیرے سے چونک کر
دیکھا ہے اس نے مڑ کے مجھے اس ادا کے ساتھ
پھیلی ہے جسم و جاں میں عجب سی ایک سرخوشی
خوشبو سی کوئی اڑنے لگی ہے، ہوا کے ساتھ

مہک......سیالکوٹ
بہت کچھ لکھنے کو سوچتی ہوں
جب کاغذ قلم ہاتھ میں لیتی ہوں
تیرا چہرہ آنکھوں میں دکھائی دیتا ہے
پکڑ کر کاغذ قلم لکھنا بھول جاتی ہوں

صفیہ.....کراچی

یہ عجیب ہے محبت' زمانہ جانتا ہے
نہ میں اس کی مانتا ہوں' نہ وہ میری مانتا ہے
کوئی جا کے اس سے پوچھے' اسے کیا ملا بچھڑ کے؟
میں بھی خاک چھانتا ہوں' وہ بھی خاک چھانتا ہے

بشریٰ گل.....کراچی

تیری چاہ میں' تیری راہ میں' میرے حوصلوں کا ہنر گیا
تھیں وہ آندھیاں تیرے شہر کی' میرا گھر گیا میرا در گیا
تیرے شہر میں اے بے مہر' تیرے دوستوں کا یہ حال ہے
کوئی چپکے چپکے سے جی اٹھا' کوئی چپکے چپکے سے مر گیا

فوزیہ.....کراچی

میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ کچھ پیش کروں
جس میں تابندہ ستاروں کی چمک شامل ہو
جس میں گزرے ہوئے لمحات کی تصویریں ہوں
جس میں ان جانے جزیروں کی مہک شامل ہو

دیوداسہ سنگھ.....جہلم

ذکر میرا لبوں پہ' میری بات ہے
کتنی بدنام یارو' میری ذات ہے
دن نکلنے پر احساس ہوتا ہے یہ
کتنی بھاری تیرے ہجر کی رات ہے

اسلم خان.....ڈگری سندھ

میری خوشبو تمہیں کھودے گی گلابوں کی طرح
تم اگر خود سے نہ بولو گے تو یاد آؤں گا
شال پہنائے گا اب کون دسمبر میں تمہیں
بارشوں میں کبھی بھیگو گے تو یاد آؤں گا

صبا.....کورنگی' کراچی

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا
حادثات جو مجھ پہ گزرے میرے حالات میں تھے
اس سبب سے بھی تو میں قابلِ نفرت ٹھہرا!
جتنے جوہر تھے محبت کے سب میری ذات میں تھے

سدیہ.....کراچی

جب یاد آپ کی آتی ہے ہم یادوں میں کھو جاتے ہیں
کوئی ٹھیس سی دل پر لگتی ہے' ہم رو رو کے سو جاتے ہیں
خوابوں میں اچانک آ کر آغوش میں آپ لے لیتے ہیں
بانہوں کا سہارا ملتے ہی مدہوش سے ہم ہو جاتے ہیں

احمد.....سرگودھا

میری آنکھوں میں یہ جو آنسو ہیں
یہ تیرے پیار کی نشانی ہے
تو نے پوچھا ہے مجھ سے کیسی ہوں
ابھی زندہ ہوں مہربانی ہے

تنزیلہ.....چنیوٹ

جو آنسو دل پہ گرتے ہیں آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے
کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دنیا بھر کے افسانے
مگر جن میں حقیقت ہو کتابوں میں نہیں رہتے

انجم.....بنڈی بھٹیاں

میں کبھی اپنے ہاتھ کی لکیروں سے نہیں الجھی
مجھے معلوم ہے قسمت کا لکھا بھی بدلتا ہے
پھر اس کے بعد تنہائی پرکھتی ہے مسافر کو
جہاں تک روشنی ہے اپنا سایہ ساتھ دیتا ہے

صائمہ عزیز.....جہلم

عمر بھر کی ہیں مسافتیں یہ دوریاں یہ فاصلے
تم چاہو تو کچھ عجب نہیں یہ پل بھر میں سر ہو جائیں
میں کاٹ سکوں گا تنہا نہ تم کاٹ سکو گے
یہ زیست کے کٹھن راستے آؤ ہمسفر ہو جائیں

خوشبوسخن

سیما بنت عاصم

غزل

ہم ان سے بچھڑ کے دور ہوئے تو محبتوں کا پتا چلا ہے
رہا کچھ بھی نہ پاس اپنے تو محبتوں کا پتا چلا ہے
تھے کشکول میں اپنے وفاؤں کے سکے محبتیں بھی بے پناہ تھیں
اب ہوئے پرانے جب سے یہ قصے تو محبتوں کا پتا چلا ہے
نہ اپنے دامن میں رہا کچھ باقی نہ دل میں کوئی حسرتیں رہیں
ہوئے ہیں ویراں صحراؤں سے تو محبتوں کا پتا چلا ہے
ہیں دل کے آنگن پہ ان کی یادیں' ان کی باتیں' ان کے جھگڑے
امر یہ کھلا بچھڑ کے ان سے تو محبتوں کا پتا چلا ہے
نہ دہراؤ ذشے پرانی باتیں پرانے قصے پرانی یادیں
کہو کہ مل کے زندگی سے تو محبتوں کا پتا چلا ہے

ناز سلوش ذشے.....میر پور

غزل

یقیناً آج کل میرا وطن اک ایسی بستی ہے
جہاں ہر چیز مہنگی ہے فقط اک موت سستی ہے
ہوئی ہیں خواب اب مہر و وفا' اخلاص کی باتیں
ہے سب کچھ دولتِ دنیا یہ دورِ زر پرستی ہے
کچھ ایسے لوگ ہیں جو فرش پر بے فکر سوتے ہیں
ہمیں تو نرم بستر پر بھی آ کے نیند ڈستی ہے
ہوئے بے جان فاقوں سے مگر خاموش ہیں پھر بھی
ہماری قوم کا یہ بھی طریقِ فاقہ مستی ہے
یقینی طور پر اشراف کی وہ دسترس میں ہیں
کہ پوری قوم جن چیزوں کی صورت کو ترستی ہے
زبردستی نوالہ چھین لیتے ہیں غریبوں سے
منافع خور لوگوں کی یہی تو چیرہ دستی ہے
قمر سیلاب نے کچھ صورتِ حال یہ کر دی
جہاں اک گاؤں تھا پہلے وہاں اب خیمہ بستی ہے

ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم

گوہرِ نایاب

میں اب تمہیں
کیسے بتاؤں
جب بھی تیری یاد کا
کوئی جھونکا
مجھ سے آ ٹکراتا ہے تو
میری آنکھوں میں
خود ہی
نمی اتر آتی ہے
لیکن
میں اسے چھلکنے نہیں دیتا
کیونکہ
تیری یاد کا
ایک اشک بھی
میرے لیے
گوہرِ نایاب ہے

عبدالحکیم ساجد.....منچن آباد

غزل

کس سے میں پوچھوں کہ کل حال میرا کیا ہوگا
آج ہے جتنا برا اس سے برا کیا ہوگا
گھر میں آسیب کا سایہ ہے تو اے گھر والو
گھر کو ہی آگ لگانے سے بھلا کیا ہوگا
آسماں روتا رہا جس طرح تارے ٹوٹے
صبح تک رات کے دامن میں بچا کیا ہوگا
زخم کھلتے رہے یونہی جو ہر اک شاخ پہ آج
حال کل پھولوں کی بستی کا صبا کیا ہوگا
ہاتھ دیکھا میرے قاتل نے جو اپنا تو کہا
ایسا خوش رنگ بھلا رنگِ حنا کیا ہوگا

قرض کی پیتے ہوئے مے کبھی یہ بھی سوچا
جب اُتر جائے گا یہ سارا نشہ کیا ہوگا
آہ کو چاہیے دستک دے فلک پہ جا کر
بن اٹھائے لینے سے یوں دستِ دعا کیا ہوگا
گھر کی ہر اینٹ اگر بیچ دی فرہاد تو کل
تجھ کو ڈھونڈوں گا کہاں تیرا پتا کیا ہوگا
حسن انتخاب: محمد ارشاد قریشی...... اسلام آباد

غزل

کبھی اب اعتبار نہیں اپنا
کوئی شخص اب معتبر نہیں لگتا
چاروں طرف کھڑی کر دیں دیواریں
اپنا گھر اب گھر نہیں لگتا
فاصلے سمٹ گئے کچھ ایسے
کٹھن سفر بھی سفر نہیں لگتا
چپ رہنے کی عادت ہوگئی ہے
اب کسی آہٹ پہ ڈر نہیں لگتا
نا معلوم کیا ہوگیا ہے اب
مرے صحن میں کوئی بھی شجر نہیں لگتا
وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

حقیقت تلخ ہوتی ہے گہرائی میں اتر جاتی ہے
جھوٹ وہ شیرینی ہے جو صرف دل کو برماتی ہے
اگر بات میں وزن ہو تو پھر اثر لاتی ہے
جیسے ہر رات کے بعد ایک نئی سحر آتی ہے
خود بڑھ کے تھام لیتی ہے منزل ان کو
پائے استقامت میں لرزش جن کے نظر آتی ہے
پھر کوئی یاد ماضی سے ہم رکاب نظر آتی ہے
چاندنی سی جب کوئی دہلیز پہ اتر آتی ہے
اکثر اس دل پہ قیامت سی گزر جاتی ہے
جب وہ چہرے سے آنچل کو سرکاتی ہے

تیرہ شبوں کی جب کبھی بات ہوتی ہے
ہر دل میں ایک قندیل سی جلتی نظر آتی ہے
شیریں فرہاد و لیلیٰ مجنوں کے زمانے تو لد گئے
اب تو عاشقی گلیوں میں در بدر نظر آتی ہے
کاغذی پیرہن سے اعضاء کی نمائش جاری ہے
بے حیائی سڑکوں پر ہر سو بال کھولے نظر آتی ہے
اس نازنین و دلربا کی تو کیا بات ہے قمر
قدم پھولوں پہ پڑتا ہے نظر تاروں پر جاتی ہے
قمر جہاں...... لطیف آباد

غزل

آؤ دوست مل کر ذرا مقال کرتے ہیں
گزرے ہوئے روز و شب کا احوال کرتے ہیں
صنم آپ ہم سے بھلا کتنا پیار کرتے ہیں
اک سادہ سا آپ سے یہ سوال کرتے ہیں
مل گئے اگر آپ تو کیا نہ رہیں گے غم میرے؟
تیرے بچھڑنے کا جو ہم اس قدر ملال کرتے ہیں
ذرا فرصت تو ملنے دو غمِ روزگار سے جاناں!
جی بھر کے پھر آپ سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں
مانا آپ حسن و بے وفائی میں کمال رکھتے ہیں
تو ہم وفا شعار بھی چاہت لازوال کرتے ہیں
محمد عبداللہ عاطر...... منگلا کینٹ

غزل

یہ دل تیرے ملنے کے بہانے ڈھونڈے
رہ گزر ہے پُر خار میں جاؤں کہاں
وہی منظر، وہی ہے فضا تم نہیں ہو مگر
نہ تمنا ہو پوری دل پھر جلاؤں کہاں
چاند چھپ کے کسی کو دیکھے گا
میں اپنی بے بسی کا ماتم کروں کہاں
جو ڈر گئے ذرا سی ہوا کے جھونکوں سے
میں جا کے پھر فسانۂ غم سناؤں کہاں

خفا ہو گئے گزرے دنوں کی طرح تم بھی
لوٹ آؤ اک بار پھر میں جشن مناؤں کہاں
زندگی میں خوشی ایک بار ملتی ہے جاوید
کیسے تیرے ناز میں جاناں اٹھاؤں کہاں
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

کرن

میری زندگی کی ویران رہ گزر میں
صحرا سی تپتی زندگی میں
شبنم کے قطروں کی طرح
خوشبو کے جھونکے جیسی
نسیم سحر کی مانند
سُر کی راگنی جیسے
تم محبت کے آسمان پر
کھلتے ہوئے روشن چاند ہو
اور میں......!
تمہاری چاہت کے نور سے
پھوٹتی ایک کرن!
شہناز بانو...... کراچی

چند اشعار

دل پریشان نظر آئے تو مجھے خط لکھنا
تم کو تنہائی ستائے تو مجھے خط لکھنا
کھلتے گل کی طرف اٹھتی ہیں نگاہیں اپنی
خشک گل گر نظر آئے تو مجھے خط لکھنا
پڑھ کے تحریر میری دل کی جو دھڑکن ٹھہرے
حوصلہ خط جو بڑھائے تو مجھے خط لکھنا
دل کے دروازے پر جو دستک سی کوئی ہو جائے
اور تمہیں نیند نہ آئے تو مجھے خط لکھنا
عبدالرحمان ساغر...... آزاد کشمیر

غزل

یہ کب کہا کہ دیا جائے تاج و تخت مجھے
جنوں مزاج ہوں کافی ہے ایک دشت مجھے
مرا قصور ہے میں نے بھی روشنی بانٹی
مری سزا ہے کیا جائے لخت لخت مجھے
میں زخم زخم لڑوں گا تمام عمر یونہی!
تمہارے بس میں اگر ہے تو دو شکست مجھے
میں چپ رہا تو سقیفے میں قتل کر دیں گے
مرے حضور تمہارے وفا پرست مجھے
تم اپنی مٹھی میں رکھنا ذرا سی دیر ہوا!
بس اک چراغ کا کرنا ہے بندوبست مجھے
میں جی رہا ہوں نہ مر ہی رہا ہوں اب میثم
یہ کس مقام پر لایا ہے میرا بخت مجھے
میثم علی آغا...... سیالکوٹ

غزل

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا؟
شاعر: مرزا غالب
حسن انتخاب: حسن اختر...... کراچی

غزل

فصلِ گل میں نکھر کے دیکھتے ہیں
پھول بن کے بکھر کے دیکھتے ہیں
لوگ طوفان۔ باد و باراں میں
در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں
ان کے دل میں ہے کتنی گہرائی
دھیرے دھیرے اتر کے دیکھتے ہیں
تابِ دیدارِ حسن ہے کتنی
حوصلے اب نظر کے دیکھتے ہیں
نہ سنیں گے وہ التجائے کرم
پھر بھی اک بار کر کے دیکھتے ہیں
اے جمال ان نئی بہاروں میں
خشک پتے شجر کے دیکھتے ہیں
سمیع جمال......کراچی

غزل

آج روٹھے ہوئے ساجن کو بہت یاد کیا
اپنے اجڑے ہوئے گلشن کو بہت یاد کیا
جب کبھی گردشِ تقدیر نے گھیرا ہے ہمیں
گیسوئے یار کی الجھن کو بہت یاد کیا
شمع کی جوت پہ جلتے ہوئے پروانوں نے
اک ترے شعلۂ دامن کو بہت یاد کیا
جس کے ماتھے پہ نئی صبح کا جھومر ہوگا
ہم نے اس وقت کی دلہن کو بہت یاد کیا
آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی
آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا
ہم بر طور بھی مایوس تجلی ہی رہے
اس دریار کی چلمن کو بہت یاد کیا
مطمئن ہو ہی گئے دام وقفس میں ساغر
ہم اسیروں نے نشیمن کو بہت یاد کیا
حسن انتخاب: فقیر محمد بخش صابر لنگاہ......خانیوال

غزل

طے کروں گا یہ اندھیرا میں اکیلا کیسے
میرے ہمراہ چلے گا میرا سایہ کیسے
میری آنکھوں کی چکا چوند بتا سکتی ہے
جس کو دیکھا ہی نہ جائے اسے دیکھا کیسے
چاندنی اس سے لپٹ جائے ہوائیں چھیڑیں
کوئی رہ سکتا ہے دنیا میں اچھوتا کیسے
میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے
اس لیے صرف خدا سے ہے تخاطب میرا
میرے جذبات کو سمجھے گا فرشتہ کیسے
گر سمندر ہی سے دریاؤں کا رزق آتا ہے
اس کے سینے میں اترے جاتے ہیں دریا کیسے
ٹوٹتی رات نے سورج سے یہ سرگوشی کی
میں نہ ہوتی تو تیرا نور برستا کیسے
حسن انتخاب: محمد آشان......خانیوال

کھو دیا ہے

تیری آہٹ پہ دل کا دھڑکنا میرا
تیرے انتظار میں گزرتا ہر لمحہ میرا
جدائی کے زخم سہہ کر بھی مسکرانا میرا
وہ تیری محبت پہ......
کامل یقین میرا
وہ پل جس میں صرف تیرا احساس رہا
وہ تیرا درد دیکھ کر......
تڑپنا میرا
میری آنکھ میں جھلکتا میرے صبر کا آنسو
تیری بے رخی کو سہتا
کانچ سے بھی نازک دل میرا
پورے دل سے دیا ساتھ میرا
کھو دیا ہے......
کھو دیا ہے......
کھو دیا ہے......
کھو دیا ہے......

ذوقِ آگہی

عفان احمد

قرآن مجید کی برکت

حضرت انس و جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانو!
اپنے گھروں میں اکثر قرآن مجید پڑھتے رہا کرو کیوں کہ جس گھر میں قرآن مجید نہیں پڑھا جاتا اس میں خیر و برکت نہیں ہوتی۔
مرسلہ: ریاض حسین......میاں چنوں

فضیلت درود شریف

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔
۱:۔ جو چاہتے ہیں کہ ان کے اعمال بڑے ترازو میں تلیں تو انہیں چاہیے کہ مجھ پر کثرت سے درود بھیجیں۔
۲:۔ کثرت سے درود شریف پڑھنے والا قیامت کے دن مجھ سے سب سے قریب ہوگا۔
۳:۔ جس کے سامنے میرا تذکرہ ہو اس کو چاہیے کہ وہ مجھ پر درود ضرور بھیجے۔
۴:۔ جو مجھ پر کثرت سے درود بھیجے گا وہ عرش کے سائے میں ہوگا۔
۵:۔ مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھنا ایسا ہے جیسے راہ خدا میں غلام کو آزاد کیا۔
۶:۔ مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو کہ تمہارے لیے موجب پاکی ہے۔
۷:۔ مجھ پر زیادہ درود بھیجو اس لیے کہ تمہارے لیے فلاح کا ذریعہ ہے۔
۸:۔ جو شخص میرے اوپر میری قبر کے قریب درود بھیجتا ہے میں اس کو خود سنتا ہوں۔
۹:۔ مجھ پر درود بھیجنا تمہارے لیے دعاؤں کو محفوظ کرنے والا ہے۔
۱۰:۔ مجھ پر درود شریف بھیجنا تمہارے ربّ کی رضا کا سبب ہے۔
۱۱:۔ مجھ پر درود بھیجا کرو یہ تمہارے لیے گناہوں کا کفارہ ہے۔
۱۲:۔ جو کوئی مجھ پر درود پڑھتا ہے میں اس کے لیے دعا کرتا ہوں۔
۱۳:۔ جو شخص مجھ پر سو مرتبہ درود پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ مقام عطا فرمائے گا۔
۱۴:۔ جمعہ کے روز مجھ پر کثرت سے درود پڑھو کیونکہ جمعے کے دن درود شریف مجھ کو پیش کیا جاتا ہے۔
۱۵:۔ جو شخص مجھ پر ایک ہزار مرتبہ درود پڑھے گا تا وقتیکہ وہ جنت میں اپنا مقام نہ دیکھ لے اس وقت تک انتقال نہیں کرے گا۔
۱۶:۔ جب کوئی مشکل آئے تو اس کو چاہیے کہ مجھ پر کثرت سے درود پڑھے۔
۱۷:۔ تم جہاں کہیں ہو مجھ پر درود شریف پڑھتے رہو بے شک تمہارا درود مجھے پہنچتا ہے۔
ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

معلومات کا خزانہ

☆ شیر میسور ٹیپو سلطان ولد حکمران میسور حیدر علی 1782ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔
☆ گندھک کے تیزاب کا موجد عرب کیمیادان جابر بن حیان ہے۔
☆ تاریخ میں ایک جنگ جسے سو سالہ جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے 1337ء سے 1453ء تک انگلستان اور فرانس کے درمیان لڑی گئی تھی۔
☆ مادرِ ملت فاطمہ جناح دانتوں کی مایۂ ناز ماہر

اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔

☆ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے مولانا حسرت موہانی تحریک آزادی کے عظیم لیڈر اور شاعر نے رسالہ "اردوئے معلیٰ" اپنی ادارت سے شائع کیا تھا۔

☆ انسانی گروپ کا خون پازیٹو "O" ہر انسان کے لیے مفید ہے۔

☆ دشمنِ اسلام ابوجہل کا اصل نام عمرو بن ہشام ہے۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آذر تھا۔

☆ سام، حام اور یافت حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......بلیز کراچی

اپنا قانون

دنیا کے سب ممالک میں قانون ہے اور ہمارے ملک میں قوانین ہیں۔ یعنی ہر فرد کا اپنا الگ قانون ہے۔ یہاں قانون کو اس طرح مسخ کیا گیا ہے کہ اب تو قانونی شق کو قانونی شک بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں پر خاص و عام کی نظر میں قوانین کی اتنی ہی وقعت ہے جتنی اداکاراؤں کی نظر میں شادی کی۔ شاید اس وجہ سے ہم نیشن نہیں بلکہ صرف پاپولیشن ہیں۔ قانون کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض اساتذہ کا پیریڈ اٹینڈ بھی ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اٹینڈ نہیں کیا ہو۔ شاید یہ اس لیے عموماً! ایسے اساتذہ کا ادب بھی ادب برائے ادب کے تحت ہی ہوتا ہے۔ ان قوانین کا ادب بھی ادب برائے ادب کے تحت ہی ہوتا ہے۔ ان قوانین کو اگر کونین بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ کوئی بھی اسے نگلنے پر آمادہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ لاقانونیت کی وبا فرد در فرد بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ابھی کل ہی ایک ٹریفک کے اشارے کی لال بتی پر میں کھڑا ہو گیا لیکن میرے ساتھ والا ایک موٹر سائیکل سوار اشارہ توڑ کر ایسے تیزی سے گزر گیا جیسے جہنم سے نکال کر اسے جنت کی نوید سنا دی گئی ہو۔ میں نے وہاں موجود پولیس والے سے پوچھا کہ اس نے اشارہ توڑا آپ نے روکا نہیں۔ اس نے کہا جی شکر کریں اس نے کہیں ویسے ہی اشارہ نہیں توڑ دیا اور ساتھ میں مسکرا کر اس نے کہا۔ کوئی بات نہیں اس نے اشارہ ہی توڑا ہے کسی کا دل تو نہیں توڑا۔

اس پر ہمیں گھبرانے یا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ "ہم زندہ قوم ہیں۔"

انتخاب: ریاض بٹ......حسن ابدال

چند نصیحتیں

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات چیزوں کے کرنے کا ہم کو حکم دیا ہے اور چند چیزوں سے ہم کو منع کیا ہے، ہم کو حکم کیا ہے۔

۱۔ مریض کی عیادت کرنے کا
۲۔ جنازے کے ساتھ جانے کا
۳۔ چھینکنے والے کے لیے یرحمک اللہ کہنے کا
۴۔ قسم کے پورا کرنے کا
۵۔ مظلوم کی مدد کرنے کا
۶۔ سلام کو رواج دینے کا
۷۔ دعوت کرنے والے کی دعوت قبول کرنا

اور ہم کو منع فرمایا ہے:

۱۔ سونے کی انگوٹھی رکھنے سے
۲۔ چاندی کے برتنوں کے استعمال سے
۳۔ سرخ کپڑے پہننے اور زین پوش بنانے سے
۴۔ ادرقسی اور تافتہ اور دیبا اور حریر پہننے سے

(متفق علیہ)

انتخاب: فاطمہ ظہیر......کراچی

خوفِ خدا

ایک دفعہ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔ اچانک انہیں ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ تلاش کرنے پر دیکھا کہ ایک چھوٹا بچہ سجدے کی حالت میں رو رہا ہے۔ تب آپؒ نے پوچھا تو کون ہے؟ وہ بچہ بولا تم کون ہو، میری عبادت میں خلل ڈالنے والے۔ آپؒ نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر پوچھا، تیرا استاد کون ہے، جس نے تیری اتنی اچھی تربیت کی ہے؟ بچے نے جواب دیا، میری ماں ہے۔ وہ چولہے میں لکڑیاں جلا رہی تھی مگر جب میری ماں نے چھوٹی لکڑیاں لگائیں تو ان کو جلدی آگ لگ گئی جس کی وجہ سے بڑی لکڑیاں بھی جلنے لگیں جسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ قیامت کے دن فرعون و نمرود جیسے بڑے بڑے گنہگاروں کو جہنم کی آگ ہم جیسے چھوٹوں سے لگائی جائے گی۔ بس تب سے میں خدائے بزرگ و برتر سے معافی مانگ رہا ہوں۔

(مراسلہ: علی رضا......میاں چنوں)

اصل حیا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا۔ "اللہ سے ایسے حیا کرو جیسا اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔" ہم نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اللہ سے حیا تو کرتے ہیں۔" آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا۔ "یہ اصل حیا نہیں بلکہ اصل حیا یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے شرماتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے سر کی اور اس میں آنے والے خیالات کی حفاظت کرے، اسے چاہیے کہ اپنے پیٹ اور اس میں جانے والی اشیا کی حفاظت کرے اور موت اور اس کے بعد مصائب و بلا کو پیش نظر رکھے، جو آخرت کا ارادہ کرے اسے لازم ہے کہ دنیا کی زینت چھوڑ دے۔ جس نے یہ سب مراحل طے کر لیے سمجھو کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے شرمانے کا حق ادا کر دیا۔"

(ترمذی)

انتخاب: زرین خان......راولپنڈی

ایک بادشاہ کی حکایت

ایک بادشاہ گھوڑے سے گر گیا، اس کی گردن کے جوڑ اپنی جگہ سے ہل گئے، ہاتھی کی طرح اس کی گردن بدن میں گھس گئی اس کا سر جب تک بدن گھمایا نہ جاتا نہ گھومتا تھا۔ یونانی طبیب کے علاوہ سارے طبیب اس کے معاملے میں حیران ہو گئے۔ اس نے (علاج کر کے) اس کا سر موڑ دیا اور بدن ٹھیک ہو گیا اور اگر وہ طبیب نہیں ہوتا تو یہ اپاہج ہو جاتا۔ جب بادشاہ تندرست ہو گیا تو وہ طبیب پھر دوبارہ کسی ضرورت سے اس کے پاس آیا۔ اس کم ظرف بادشاہ نے اس کی طرف نظر بھی نہ کی، عقل مند طبیب شرمندہ ہو گیا۔ چپکے سے یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ اگر میں کل اس کی گردن (علاج کر کے) صحیح نہ کرتا تو یہ منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس نے غلام کے ہاتھ ایک بیج بھیجا اور کہا اس کو بادشاہ کی گردن پر رکھ دینا۔ بادشاہ کو اس بیج کی بو سے ایک چھینک آئی، اس کا سر اور گردن جیسی تھی ویسی ہی ہو گئی۔ طبیب کو بہت ڈھونڈا تا کہ اس سے معافی چاہے اور وہ دوبارہ علاج کرے مگر وہ نہیں ملا۔

فائدہ: احسان کرنے والے کے شکر سے گردن نہ موڑو ورنہ تکلیف اور شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔

(مراسلہ: ظفر سعید......جھنگ صدر)

⌘

خطروں کا کھلاڑی

اے حمید

محترم اے حمید کا نام نئے افق کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ وہ نئے افق' نیا رخ اور آنچل کے لیے متعدد سلسلے وار ناول' افسانے اور سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ایک منفرد انداز ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو لفظ بولتے ہیں۔ جب قاری انہیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو خود بخود اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے بلکہ خود اس کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ منظر کشی میں اے حمید کا کوئی ثانی نہیں۔ جب وہ بارش کے بارے میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کمرے سے باہر بوندیں برس رہی ہیں۔ جب وہ خوش بو کا تذکرہ کرتے ہیں تو قاری خود کو اس خوش بو کے ہالے میں محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر تحریر ماضی کے برما حال کے میان مار کا سفر نامہ ہے۔ آج اے حمید ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں انہیں ہمیشہ قارئین کے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ آئیے خطروں کا کھلاڑی پڑھیے بلکہ محسوس کیجیے۔

ایک ایسا سفر نامہ جو آپ کو دن میں خواب دیکھنے پر مجبور کردے گا

بھلوا کی باتیں میرے ذوق تجسس کو مہمیز لگا رہی تھیں۔ میں اسی قسم کی داستانیں سننا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''بھلوا! کیا تم نے کبھی کسی ایسی عورت کو دیکھا ہے جو دن کے وقت سانپ اور رات کے وقت عورت بن جاتی ہے؟''

بھلوا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ جسم پر سوائے ایک پرانی سی صدری اور دھوتی کے اور کچھ نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

''ایک بار مجھے ایسی ناگن عورت ملی تھی مگر میں نے اسے پہچان لیا تھا اور موقع پاتے ہی بھاگ گیا تھا۔''

میں نے سوال کیا۔

''تمہیں بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ سانپ کی شکل میں تھی؟''

''نہیں۔'' بھلوا بولا۔

''وہ عورت کی شکل میں تھی مگر میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت اصل میں ناگن ہے' بھاگا اس لیے تھا کہ یہ ناگن عورتیں رات کے وقت اپنے شکار کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ ان کا شکار جنگل میں بھولے بھٹکے مرد ہوتے ہیں۔ یہ پہلے انہیں اپنی باتوں میں الجھاتی ہیں جب مرد کو ایک خاص نشہ ہو جاتا ہے تو یہ ناگن سانپ بن کر اسے ڈس لیتی ہے اور جہاں ڈستی ہے وہاں سے آدمی کا جی بھر کر خون پیتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔''

بھلوا نے جو داستان سنائی تھی اس سے میں بڑا متاثر ہوا تھا اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ میں بھی کسی ایسی عورت سے ملوں جو اصل میں سانپ ہو مگر لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے روح کی صورت میں چل پھر رہی ہو۔ میں نے بھلوا سے کہا۔

''بھلوا۔ کیا تم مجھے کسی ایسے سپیرے سے ملا سکتے ہو جس کے قبضے میں اس قسم کی ناگن ہو؟''

ہم جنگل کی ایک پگڈنڈی پر جا رہے تھے۔ ہمارے دونوں جانب اونچی اونچی جھاڑیوں میں سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ بھلوا نے کہا۔

''میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا۔ ایک سپیرے کو میں جانتا ہوں۔ اس کے پاس ناگن

عورت کو سانپ اور سانپ سے عورت بنانے کا منتر آتا ہے۔ میں آج اس سے بات کروں گا۔ پھر تمہیں اس سے ملوادوں گا۔“

میری ساری توجہ اب اسی سپیرے کی طرف ہوگئی تھی جسے بھلوا نے مجھے ملوانا تھا اور جس کے قبضے میں ایک ایسی ناگن تھی جو رات کو عورت کی شکل اختیار کرلیتی تھی۔ میں نے جنگل کی تھوڑی سی سیر کی اور بھلوا سے کہا۔

”بس اب واپس چلتے ہیں۔“

ویسے بھی سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس وقت جنگل خطرناک ہوجاتا ہے۔ ہم بشن سنگھ کے ڈیرے پر آگئے۔ دوسرے دن بھلوا میرے پاس آیا اور بڑی رازداری سے کہنے لگا۔

”میں نے سپیرے سے بات کرلی ہے۔ ایک گھنٹے بعد میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔“

ایک گھنٹہ میں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ اس کے بعد بھلوا کے ساتھ سپیرے سے ملنے کے لیے چل پڑا۔ اس کا جھونپڑا بشن سنگھ کے ڈیرے سے جنوب کی جانب دو کوس دور جنگل میں واقع تھا۔

عجیب ڈراؤنی شکل کا یہ سپیرا تھا۔ کالا کلوٹا سا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور جسم کی ہڈیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ جسم پر گھٹنوں تک صرف ایک دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور بھلوا سے بنگالی میں باتیں کرنے لگا۔ پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

”ناگن دیوی یونہی کسی کو اپنے درشن نہیں دیتی۔ اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ رہ کر چلہ کاٹنا ہوگا۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟“

میں نے پوچھا۔ ”یہ چلہ کس قسم کا ہے؟“

”تمہیں تین راتیں ایک ندی کے کنارے آنکھیں بند کرکے بیٹھنا ہوگا اور یہ منتر دل میں پڑھنا ہوگا۔ اے ناگن دیوی! مجھے اپنے درشن دے۔ چوتھی رات ناگن دیوی تمہیں درشن دے گی اور پہلے سانپ کی شکل میں ہوگی اور پھنکار مارے گی۔ اس کی پھنکار پر تم آنکھیں کھول دو گے۔ جب تمہاری اور سانپ کی آنکھیں چار ہوں گی تو ناگن فوراً عورت کی شکل اختیار کرلے گی اور تم سے کہے گی۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔ اس وقت تم جو کچھ مانگو گے ناگن وہ تمہیں پیش کردے گی۔“

یہ بہت بڑا لالچ تھا۔ میں اس لالچ میں آگیا۔ میں نے کہا۔

”میں چلہ کاٹنے پر تیار ہوں۔“

سپیرے نے کہا۔

”ایک بار پھر سوچ لو۔ اگر تم نے چلہ ادھورا چھوڑ دیا اور بھاگ گئے تو جہاں بھی ہوگے ناگن وہاں آکر تمہیں ڈس لے گی۔“

میں نے کہا۔

”میں ہر حالت میں چلہ پورا کروں گا۔ میں آج رات کو ہی چلہ شروع کرنے پر تیار ہوں۔“

بشن سنگھ کے بنگالی نوکر نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا۔

”بھلوا! میں ابھی سے سپیرے بابا کے پاس رہوں گا اور رات کو چلہ شروع کردوں گا۔ تم سردار جی سے جاکر کہہ دینا کہ میں تین دنوں کے بعد واپس چٹا گانگ چلا گیا ہوں۔“

بھلوا میری دلچسپی اور شوق کو دیکھتے ہوئے راضی ہوگیا۔ کہنے لگا۔

”بابو! ایک بار چلہ شروع کیا تو اسے پورا کرنا۔ نہیں تو زندہ نہ بچوگے۔ ناگن تمہیں ڈھونڈ نکالے گی اور ڈس کر ہلاک کرڈالے گی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس کے بعد بھلوا چلا گیا۔ میں سپیرے بابا کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ سپیرا بھی میرے شوق کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

”تم بڑے بہادر لڑکے ہو۔ آج شام کو میں تمہیں وہاں لے چلوں گا جہاں بیٹھ کر تم چلہ شروع کروگے۔“

میں شام تک سپیرے کے پاس ہی رہا۔ سپیرا تھوڑی دیر کے بعد مجھے اپنے جھونپڑے کے باہر بٹھا کر جنگل میں چلا گیا۔ کہنے لگا۔ میں سانپ پکڑنے جارہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو اس نے ایک ہاتھ میں سانپ پکڑ رکھا تھا۔ سانپ کو اس نے دم سے پکڑا ہوا تھا اور اسے اٹھا کر چلا آرہا تھا۔ جھونپڑی میں آتے ہی اس نے سانپ کو پٹاری میں بند کردیا۔ کہنے لگا۔

”یہ بڑا زہریلا سانپ ہے۔ مجھے جنگل سے اس کی بو آگئی تھی۔ یہ سانپ کسی کسی سپیرے کے پاس ہوتا ہے۔ جس کے پاس یہ سانپ ہو اس کے اندر بہت طاقت آجاتی ہے۔“

جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو سپیرا مجھے لے کر وہاں سے کچھ دور جنگل میں ایک ندی کے پاس آگیا۔ ندی کا پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ چھوٹی سی ندی تھی۔ اس کے اوپر درخت جھکے ہوئے تھے۔ درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ سپیرے نے ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے مجھے بٹھا دیا اور بولا۔

”یہاں ساری رات بیٹھ کر تم چلہ کروگے۔ جب درختوں پر بولنے والے پرندے خاموش ہوجائیں تو تم آنکھیں بند کرکے دل میں یہ منتر تھوڑی تھوڑی دیر بعد دہراتے رہنا۔ اے ناگن دیوی! مجھے درشن دے۔ میں صبح کو آکر تمہیں لے جاؤں گا۔“

مجھے جنگل میں ندی کے کنارے اکیلا بٹھا کر سپیرا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اوپر درخت کی جانب دیکھا۔ درخت پر پرندے شور مچارہے تھے۔ میں نے اٹھ کر ندی کا پانی پیا۔ بڑا صاف اور میٹھا پانی تھا۔ اس کے بعد درخت کے نیچے چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ تھوڑا بہت کھانا میں سپیرے کے جھونپڑے میں ہی کھا کر آیا تھا۔ میں انتظار کرنے لگا کہ کب پرندے خاموش ہوتے ہیں۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد پرندے خاموش ہوگئے اور اس طرح خاموش ہوئے جیسے سارے کے سارے یکدم بے ہوش ہوگئے ہوں۔ جنگل کی فضا پر ایک ڈراؤنا سناٹا چھا گیا۔ مجھے ڈر لگنے لگا کسی وقت لگتا کہ کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے چلا آرہا ہے۔ میں چونک کر پیچھے دیکھتا۔ وہاں کوئی نظر نہ آتا۔ کسی وقت لگتا کہ مجھے سانپ کی سیٹی کی آواز آرہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی ہوجاتی۔ اب مجھے چلہ شروع کرنا تھا چنانچہ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دل میں یہ جملہ دہرایا۔

اے ناگن دیوی! مجھے درشن دے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل نے کہا۔ لاحول ولاقوۃ یہ تم کیا بک رہے ہو۔ تم مسلمان کی اولاد ہو۔ یہ کفر کیوں بکنے لگے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دل نے کہا اٹھ کر واپس چلے جاؤ لیکن دماغ نے کہا۔ ناگن عورت کو دیکھنے کا یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ جس طرح سے بھی ہو چلہ پورا کرلو۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور وہی جملہ دہرایا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے میری طرف بڑھ رہا ہے۔“

کاکسز بازار اور چٹا گانگ کے جنوب مشرقی جنگلوں کا سلسلہ مشرق میں سندر بن اور جنوب میں اساکان کے پہاڑی سلسلوں کے آگے تھائی لینڈ کی سرحدوں تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہ لاکھوں سال

پرانے جنگل اتنے گھنے گنجان اور دشوار گزار ہیں کہ جنگلی درندوں کو بھی گزرنے کے لیے راستا نہیں دیتے۔ ان جنگلوں میں دن کے وقت بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ یہ جنگل قدرت کی ہیبت اور جلال کے مظہر ہیں۔ ان جنگلوں میں سے اردگرد کے دیہات کے لوگ بھی گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

پرانے تجربہ کار شکاری بھی ان جنگلوں کی طرف نہیں آتے۔ میں زندگی میں صرف ایک بار ہی ان جنگلوں میں غلطی سے نکل آیا تھا اور مجھ پر یہاں کے دہشت ناک ماحول نے خوف سا طاری کر دیا تھا اور میں جن قدموں سے چل کر وہاں آیا تھا انہی قدموں سے واپس چلا گیا تھا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں میں کاکسز بازار سے کافی دور ایک جنگل میں ٹھیکیدار سردار بشن سنگھ کے ہاں ٹھہرا تھا۔

مجھے بنگال کے جنگل اور ان جنگلوں کی بارش دیکھنے کی خواہش امرتسر سے کھینچ کر وہاں لے آئی تھی۔ میری زندگی کی بڑی قیمتی خواہش تھی لیکن جو کوئی سنتا وہ مجھے احمق سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب سردار بشن سنگھ کو معلوم ہوا کہ میں اتنی دور صرف جنگل اور جنگلوں کی بارشیں دیکھنے آیا ہوں تو انہوں نے کہا۔

”تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ یہ جنگل کوئی کلکتے کا وکٹوریہ گارڈن یا تاج محل نہیں ہے کہ تم انہیں دیکھنے گھر سے نکل پڑے ہو۔“

مجھے یاد ہے میں نے سردار صاحب سے کہا تھا۔

”یہ جنگل میرے لیے وکٹوریہ گارڈن اور تاج محل سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔“

سردار صاحب کا وہاں لکڑی کی کٹائی کا ٹھیکہ تھا۔ میں روز ان کے کوارٹر سے جنگل کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ میں جنگل میں زیادہ آگے نہ جاؤں۔ ایک دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ میں جنگل کی سیر کر رہا تھا۔ سیر کرتے کرتے میں جنگل میں ذرا آگے نکل گیا۔ یہاں ایک چھوٹی سی ندی کو دیکھا جو درختوں کے درمیان سے ہو کر بہہ رہی تھی۔

درختوں کی شاخوں نے ندی پر چھت سی ڈال رکھی تھی۔ امرتسر کے کمپنی باغ میں بھی ایک اتنی ہی چوڑی نہر تھی جس میں ہم خوب چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ موسم گرما تھا۔ آسمان پر بادل تھے۔ میرا جی ندی میں چھلانگ لگانے کو چاہا لیکن یہ سوچ کر ڈر گیا کہ کہیں ندی میں کوئی سانپ نہ تیر رہا ہو۔

بنگال کے ان جنگلوں میں دوسرے مہلک حشرات الارض کے علاوہ سیکڑوں قسم کے سانپ بھی ہوتے ہیں۔ ندی کا پانی اس طرح بہہ رہا تھا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شفاف سطح پر گرے ہوئے پتے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ پانی بہہ رہا ہے۔ بڑی خاموشی تھی۔ کسی درخت پر کوئی پرندہ تک نہیں بول رہا تھا۔ فضا درختوں اور قسم قسم کی جنگلی بیلوں اور مرطوب زمین کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ جہاں ندی پر درختوں نے چھت ڈال رکھی تھی وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔

بڑا پراسرار ماحول تھا۔ اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ایسے لگا جیسے کوئی جھاڑیوں میں چلا آ رہا ہے۔ میں ڈر گیا کہ ضرور کوئی جنگلی ریچھ وغیرہ ہے۔ میں جلدی سے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا اور جس طرف سے آہٹ سنائی دی تھی اس طرف دیکھنے لگا۔

یہ جھاڑیاں ندی کے اس کنارے پر تھیں جس طرف میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں سے دو آدمیوں اور ایک عورت کو دیکھا۔ دونوں آدمی عورت کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اس طرف لا رہے تھے جس طرف ایک درخت کے پیچھے میں چھپا ہوا

تھا۔ میں جلدی سے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ جھاڑی کی شاخوں میں سے مجھے باہر کا منظر برابر نظر آ رہا تھا۔

دونوں آدمی عورت کو گھسیٹتے ہوئے میرے قریب سے گزرے تو میں نے دیکھا۔ وہ ایک لڑکی تھی جس کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہو گی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس نے نسواری رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی اور اس کے بال کھلے تھے۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی اور بنگالی زبان میں کچھ بولتی جا رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ آدمی لڑکی کو کہیں سے اغوا کر کے لائے ہیں اور اب اسے جنگل میں اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جا رہے ہیں۔

میری عمر بھی سولہ سترہ سال کی ہو گی۔ اس عمر میں ہی مجھے ہیرو بننے کا بڑا شوق تھا اور میں بغیر سوچے سمجھے خطروں کو مول لے لیا کرتا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میرے اندر کا ہیرو بیدار ہو گیا اور میں نے ان آدمیوں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکی کو بری طرح گھسیٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی۔ وہ بنگالی زبان میں لڑکی کو غصے میں کچھ کہتے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے اسے گالیاں دے رہے ہوں گے۔ میں تھوڑا فاصلہ ڈال کر جنگل میں ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ درختوں' جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک ٹیلے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ انہوں نے بدنصیب لڑکی کو زمین پر گرا کر اس کے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے باندھ دیئے اور اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور شاید گالیاں دیتے ٹیلے کی طرف بڑھے۔ ٹیلے کی ڈھلان کے پاس ایک کوٹھڑی سی تھی۔ انہوں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر لڑکی کو اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔

تالا لگانے کے بعد وہ کچھ دیر کوٹھڑی کے باہر کھڑے آپس میں کوئی صلاح مشورہ کرتے رہے پھر واپس جس طرف سے آئے تھے اسی طرف چل پڑے۔ میں انہیں آتا دیکھ کر ایک جگہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی آپس میں بنگلہ زبان میں باتیں کرتے میرے قریب سے گزر گئے۔ جب وہ کافی دور چلے گئے تو میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ایک خیال یہ بھی آیا کہ مجھے اس بک بک میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ پتا نہیں یہ لوگ قاتل قسم کے جرائم پیشہ لوگ ہیں اور لڑکی بھی ہو سکتا ہے ان ہی کے طبقے کی طوائف ٹائپ کی عورت ہو گی۔ میں خواہ مخواہ کی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں لیکن میرے نوجوانی کے گرم خون نے جوش مارا اور دل نے کہا کہ یہ عورت ہو سکتا ہے کسی غریب ماں باپ کی بیٹی ہو اور یہ جرائم پیشہ لوگ اسے اغوا کر کے لائے ہیں اور اسے ضرور شہر میں لے جا کر کسی قحبہ خانے میں فروخت کر دیں گے۔

اب اس لڑکی کی ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میرا انسانی فرض ہے کہ میں نے اس عورت کو مصیبت میں مبتلا دیکھا ہے تو اس کی ضرور مدد کروں۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ ایک جملہ کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا شروع دن سے ہی میری زندگی کا اصول رہا تھا اور اس نے میری زندگی کے تمام ایڈونچرز میں بڑا نمایاں کام انجام دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ جملہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں کبھی گھر سے بھاگ کر نہ نکلتا اور جتنے خطرناک سفر اور ایڈونچر میں نے اس نوجوانی کی عمر میں کیے ہیں شاید کبھی نہ کرتا اور اس قابل نہ ہوتا کہ آج آپ کو اپنے سنسنی خیز ایڈونچرز کے سچے واقعات سنا سکتا۔ قدرت نے مجھے کہانیاں

سنانے کے لیے پیدا کیا تھا اور وہ مجھ سے وہی کام لے رہی تھی جس کے لیے اس نے مجھے پیدا کیا تھا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ دونوں آدمی اس علاقے سے نکل گئے ہیں تو میں جھاڑیوں میں سے نکلا اور ٹیلے کے پاس کوٹھڑی کے دروازے پر آ کر رک گیا اور دروازے کی ایک درز میں سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور لڑکی کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی دبی دبی آواز آ رہی تھی۔ مجھے ڈر بھی تھا کہ کہیں دونوں آدمی واپس نہ آ جائیں۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں قریب ہی گئے ہوں۔ میں نے دروازے پر ہاتھ سے آہستہ سے ٹھک ٹھک کر کے اردو میں کہا۔

''تم کون ہو؟''

کوٹھڑی کے اندر سے لڑکی کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے اندر بالکل خاموشی چھا گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''میں تمہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہ لوگ کون تھے؟''

کوٹھڑی کے اندر سے لڑکی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جو کچھ کہا۔ میں اس کا مفہوم یہاں سلیس اردو میں لکھ رہا ہوں۔

''بھگوان کے لیے مجھے باہر نکالو۔ میں تم کو سب کچھ بتا دوں گی۔''

میں نے کہا۔

''گھبراؤ نہیں۔ تالا لگا ہوا ہے۔ میں تالا توڑ رہا ہوں۔''

میں نے ذرا قریب ہی سے ایک پتھر اٹھایا اور تالے پر زور سے دو تین بار مارا تو تالا ٹوٹ گیا۔ میں نے کنڈی کھول کر دروازہ کھول دیا۔ لڑکی بڑی سہمی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور دروازے کے پاس زمین پر بیٹھی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ کھول دیئے۔ لڑکی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اسے کہا۔

''میرے ساتھ آ جاؤ۔''

لڑکی مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر جلدی سے کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔ اس نے خوفزدہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''وہ لوگ کہاں ہیں؟''

میں نے کہا۔

''وہ اس طرف چلے گئے ہیں۔ میں تمہیں دوسری طرف سے ایک جگہ لے جاؤں گا۔ جہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

لڑکی میرے ساتھ چل پڑی۔ میں اسے اسی راستے سے واپس لے آیا جس راستے سے میں اس جنگل میں داخل ہوا تھا۔ یہ دس پندرہ منٹ کا راستہ تھا لیکن ہر لمحے مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں دونوں ڈاکو کسی طرف سے نکل کر سامنے نہ آ جائیں۔ ان میں سے ایک کے پاس بندوق بھی تھی۔ میں تیز تیز چل رہا تھا۔ لڑکی مجھ سے زیادہ تیز چل رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں چپل تھی جو کلکتہ شہر میں عام طور پر عورتیں پہنتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی کلکتے یا چٹا کانگ شہر کی رہنے والی ہے۔

اس کے ماتھے پر کیسری رنگ کی بندیا تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی ہندو ہے۔ میں اسے سردار بشن سنگھ کے کوارٹر میں لے آیا۔ سردار صاحب برآمدے کے باہر کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ میری طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں نے قریب جا کر سردار صاحب سے کہا۔

''اس لڑکی کو دو آدمی اغوا کر کے لائے تھے۔ انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا۔ میں اسے کوٹھڑی سے نکال کر لے آیا ہوں۔''

سردار بشن سنگھ نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر لڑکی کو غور سے دیکھا اور مجھے پنجابی میں کہا۔

''یہ کیا نئی مصیبت پکڑ کر لے آئے ہو۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی ضرور پھنساؤ گے۔''

میں نے کہا۔

''سردار جی! یہ لڑکی مجھے کسی شریف گھرانے کی لگتی ہے۔ میں اسے اس کے گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔''

سردار جی نے لڑکی سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔ تم کون ہو؟''

لڑکی نے اسی ٹوٹی پھوٹی بنگلہ نما اردو میں کہا۔ جس کا میں سلیس اردو میں یہاں ترجمہ کرتا ہوں۔

''میرا نام کملاوتی ہے۔ میں کلکتے کے درگا میا کے مندر کے پجاری کی بیٹی ہوں۔ میں صبح صبح مندر کے پیچھے ندی پر اشنان کرنے نکلی تھی کہ دو آدمیوں نے مجھے پکڑ کر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مجھے بے بس کر کے ایک گاڑی میں ڈالا اور شہر سے باہر ایک مکان میں لے جا کر بند کر دیا۔ رات کو انہوں نے مجھے مکان سے نکال کر ایک گاڑی میں باندھ کر ڈال دیا اور بندوق میری گردن کے ساتھ لگا کر مجھے راتوں رات ایک جنگل میں لے آئے۔ مجھے جنگل میں انہوں نے دو دن رکھا اور ایک رات کو وہاں سے بھی نکالا اور ایک گاڑی میں ڈال دیا۔

ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ صبح کو پھر اس جنگل میں آ گئی۔ وہاں تین اور آدمی مل گئے۔ مجھے ایک رات جنگل میں انہوں نے باندھ کر رکھا اور دوسرے دن جنگل میں ایک کوٹھڑی میں لا کر بند کر دیا۔ وہاں سے مجھے یہ بابو جی نکال کر یہاں لائے ہیں۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے کلکتے میرے پتا جی کے پاس پہنچا دو۔ پتا جی کا نہ جانے کیا حال ہو رہا ہوگا؟''

کملاوتی کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن میں نے محسوس کیا کہ سردار جی پر اس کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

''سن او کاکا۔ میں اس بک بک میں نہیں آؤں گا۔ تم اسے لے جانا چاہتے ہو تو کلکتے اس کے باپ کے پاس لے جاؤ۔ میرا کسی کو بتانا ہی نہیں کہ یہ میرے ڈیرے پر آئی تھی۔ کل میرا ٹرک مال لے کر کاکسز بازار جا رہا ہے۔ وہاں تک اسے لے کر چلے جانا۔ وہاں سے تمہیں چٹا کانگ جانے والی بس مل جائے گی۔ چٹا کانگ سے ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے چلے جانا۔''

پھر اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس کوارٹر کے اندر جا کر چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ تمہیں دو وقت کا کھانا مل جائے گا۔ کل صبح تک خبردار کوارٹر سے باہر نہ نکلنا۔''

اس کے بعد ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کاکا تم میرے سامنے والے کوارٹر میں چلے جاؤ۔ تم یہاں کسی سے لڑکی کے بارے میں بات نہیں کرو گے اور لڑکی کے کوارٹر میں بھی نہیں جاؤ گے۔ چلو چھیتی کرو۔ جاؤ میرے کوارٹر میں۔''

میں سردار جی کے کوارٹر کے کمرے میں اور لڑکی سردار جی کے دوسرے کوارٹر میں چلی گئی۔ نہ میں کوارٹر سے باہر نکلا نہ لڑکی کوارٹر سے باہر نکلی۔ دوپہر اور رات کا کھانا میں نے بھی کوارٹر کے اندر ہی کھایا۔ رات کو وہیں سو گیا۔ سردار جی باہر دیر تک بیٹھے پہرہ دیتے رہے۔ پھر وہ میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے۔

''خبردار! اگر تم نے لڑکی کے کوارٹر کا رخ کیا۔''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بات سردار جی نے مجھے کیوں کہی تھی۔ میرے دماغ میں یہ خیال تک نہیں آیا

تھا کہ میں رات کے وقت لڑکی کے کوارٹر میں جاؤں گا۔ رات گزر گئی۔ صبح چائے وغیرہ مجھے اور لڑکی دونوں کو سردار جی کے نوکر نے اپنے کوارٹر میں ہی دی۔ گیارہ بجے کے قریب سردار جی کا ٹرک آ گیا۔ ایک بجے کا کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سردار جی نے لڑکی کو کوارٹر میں سے نکالا۔ مجھے اور لڑکی کو ٹرک کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بٹھا دیا اور پنجابی میں کہا۔

”یہ ڈرائیور بنگالی ہے۔ یہ پنجابی نہیں سمجھتا اس لیے میں تمہیں پنجابی میں کہہ رہا ہوں۔ لڑکی کے بارے میں اس سے راستے میں کوئی بات نہ کرنا۔ یہ پوچھے بھی تو اسے جھاڑ کر چپ کرا دینا کہ تم کون ہوتے ہو لڑکی کے بارے میں پوچھنے والے۔“

پھر انہوں نے صدری کی جیب میں سے بٹوہ نکالا۔ اسے کھول کر اس میں سے دو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

”یہ رکھو۔ یہ راستے میں تمہارے کام آئیں گے۔“

اس کے بعد سردار جی آرا مشین کے پاس جا کر لکڑی کی چرائی کا معائنہ کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرک چیری ہوئی لکڑیوں کا مال لے کر چل پڑا۔ کاکسز بازار وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں نے لڑکی کملاوتی کو ساتھ لیا اور بس کے اڈے پر آ گیا۔ یہاں ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ہمیں چٹا کانگ جانے والی بس مل گئی اور ہم چٹا کانگ پہنچ گئے۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے ہم ریلوے اسٹیشن پر گئے معلوم ہوا کہ کلکتہ جانے والی گاڑی رات کے گیارہ بجے چلے گی۔ اتنی دیر تک ہم نے وہیں پلیٹ فارم پر ہی بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔

کملاوتی اب مجھ سے تھوڑی کھل گئی تھی۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ میں واقعی اسے اس کے باپ کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں تو بنگال میں کیسے آیا ہوں۔ میں نے اسے یہی کہا کہ بس بنگال دیکھنے کے شوق میں آ گیا تھا۔ کاکسز بازار میں سردار جی ہمارے والد کے ملنے والے تھے۔ میں ان کے پاس آ کر ٹھہرا ہوا تھا۔ کملاوتی تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد چپ ہو جاتی اور یوں پلیٹ فارم پر ادھر ادھر دیکھنے لگتی جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔

درمیانی شکل وصورت کی بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔ اس کا لباس میلا ہو گیا تھا۔ بالوں میں اس نے مجھ سے چھوٹی کنگھی لے کر ایک دو بار اپنے بالوں کو درست کر کے پیچھے جوڑا بنا لیا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اداس اور خاموش تھیں۔ جس طرح کہ تقریباً ہر دوسری تیسری عورت کی آنکھیں ہوتی تھیں۔ میری نوعمری کے زمانے میں تو بنگالی عورتوں کی آنکھیں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ اب وہاں کا ماحول بھی بھارت کے دوسرے بڑے شہروں کی لڑکیوں کی طرح بڑا بدل گیا ہوگا۔

اب تو بھارت میں عورتوں کے لباس کے بھی فیشن شو ہوتے ہیں اور لڑکیاں نیم عریاں لباس میں بازاروں اور شاپنگ سینٹروں میں عام چلتی پھرتی ہیں۔ آزادی سے پہلے بنگال کا واحد صوبہ ایسا تھا جہاں عورتوں کی اکثریت بڑی خاموش اور وفا شعار مشہور تھی۔ میں نے انہیں خود ایسا دیکھا ہے۔ بنگال کی عورتوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ امر بیل کی طرح اپنے خاوند سے چمٹ جاتی ہیں۔ خاوند چاہے انہیں جتنا بھی مارے پیٹے وہ ان سے کبھی الگ نہیں ہوتیں۔ سلہٹ میں مجھے ایک پنجابی ٹیکسی ڈرائیور ملا تھا۔ اس کی عمر اس وقت پچاس سال کے اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بنگال میں کب آیا تھا۔ کہنے لگا۔

”بیس برس کا تھا کہ کام کی تلاش میں کلکتے سے

آیا۔ یہاں ایک بنگالی لڑکی سے پیار ہو گیا۔ ہم نے شادی کر لی۔ تب سے لے کر آج تک بنگال میں ہی ہوں۔ کئی بار بیوی سے الگ ہونا چاہا مگر وہ مجھ سے ایسی چمٹی ہوئی تھی کہ الگ ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں اسے مارتا تھا۔ وہ مار کھاتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی اور مجھ سے چمٹتی جاتی تھی۔ میں تو کہتا ہوں کہ جو لوگ بنگال کا جادو کہتے ہیں وہ ہی عورت بنگال کا جادو ہے۔ یہ عورتیں آدمی پر خاص طور پر پنجابی پر جادو کر دیتی ہیں۔“

کملاوتی کی اداس اداس آنکھیں بھی مجھ پر اپنا تھوڑا تھوڑا جادو کر رہی تھیں مگر مجھ پر اس کے جادو کا اثر اس لیے زیادہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں پہلے ہی سے ایک جادوگرنی کے طلسم کا اسیر تھا۔ چٹا کانگ سے کلکتے تک کا سفر کافی لمبا سفر ہے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے چٹا گانگ سے ٹرین روانہ ہوئی۔ میں نے کملاوتی کو زنانہ ڈبے میں بٹھانے کے بجائے مردانہ ڈبے میں ہی اپنے ساتھ بٹھایا۔ میں نے ڈبے کی کونے والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ کونے میں کملاوتی کو بٹھا دیا اور خود کھڑکی کی طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ گویا میں نے ڈبے کے دوسرے مسافروں اور کملاوتی کے درمیان اپنے آپ کو حائل کر لیا تھا۔ عقلمندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ٹرین کے چلنے کے کچھ دیر بعد کملاوتی کو نیند آ گئی اور وہ دیوار سے سر ٹیک کر سو گئی لیکن بار بار اس کا سر نیچے کو ہو جاتا تھا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ بے چاری نہ جانے کب کی جاگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے لیٹنے کے لیے سیٹ پر جگہ بنا دی اور اسے سلا دیا۔ ساری رات وہ سوئی رہی۔ دن کے وقت یاد نہیں کون سا اسٹیشن آیا تو میں نے اسے جگا دیا۔ ہم نے ڈبے میں بیٹھے بیٹھے ناشتہ وغیرہ کیا۔ مٹی کے آبخوروں میں چائے پی۔ کملاوتی کھڑکی سے باہر نہیں دیکھتی تھی۔ ڈبے میں بھی وہ دوسرے مسافروں سے منہ چھپا کر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ یہاں وہ لوگ نہیں آئیں گے۔“

کملاوتی کا رنگ زرد سا پڑ گیا۔ کہنے لگی۔

”بھگوان کے لیے ان کا ذکر نہ کرو۔“

وہ ان لوگوں سے سخت ڈری ہوئی تھی۔ خدا جانے ان درندوں نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کیا تھا کہ ان کے ذکر سے کملاوتی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس زمانے میں ریل کے کرائے زیادہ نہیں ہوتے تھے یا یہ سمجھ لیں کہ اس زمانے میں روپے کی بڑی قیمت تھی۔ مجھے یاد ہے میں چھوٹا سا تھا اپنی والدہ کے ساتھ لاہور اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ اس وقت مجھے یاد ہے امرتسر سے لاہور کا ریل گاڑی کا واپسی کا کرایہ نو آنے ہوتا تھا۔ امرتسر سے بمبئی تک ریل گاڑی کا تھرڈ کلاس کا کرایہ اگر میں بھولتا نہیں تو بارہ تیرہ روپے ہوا کرتا تھا۔

یہ ذکر میں اس لیے لے بیٹھا ہوں کہ کلکتہ پہنچنے کے بعد بھی میرے پاس سردار صاحب کے دیئے ہوئے پیسوں میں سے کافی روپے باقی بچ گئے تھے۔ ہماری ٹرین کلکتے کے سیالدہ اسٹیشن پر رکی تھی۔ میں نے کملاوتی سے پوچھا۔

”تمہارے پتا جی کا مندر کہاں ہے؟“

اس نے کسی علاقے کا نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ پھر کہنے لگی۔

”میں رکشا والے کو بتا دوں گی۔“

میں نے ایک خالی رکشے کو روکا۔ کملاوتی نے بنگالی زبان میں اسے درگا دیوی کے مندر کا ایڈریس بتایا اور ہم رکشے میں سوار ہو گئے۔ کلکتہ شہر کی سڑکوں پر بھی اس زمانے میں ابھی ٹریفک کا سیلاب نہیں آیا

تھا۔ سڑکوں پر کاریں ضرور چلتی تھیں مگر ان کا اتنا ہجوم نہیں تھا جو آج کل نظر آتا ہے۔

میں کلکتے کئی بار آیا تھا لیکن کلکتہ اتنا بڑا شہر ہے کہ میں اتنی آوارہ گردی کرنے کے باوجود اس شہر کا صرف ایک حصہ ہی دیکھ سکا تھا۔ ابھی تین حصے شہر باقی تھا۔ کملاوتی کو لے کر رکشا کلکتے کے ان تیسرے حصوں میں سے گزر رہا تھا جو میرے لیے اجنبی تھے۔ پھر دریا کا کنارہ آ گیا لیکن دریا کافی فاصلے پر تھا اور سڑک اس کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ پھر رکشا ایک سرسبز گھاس والے میدان کے پہلو سے ہوتا ہوا ایک چھوٹی سی بستی میں آ گیا جہاں پرانے پرانے دو دو تین تین منزلہ ڈھلوان چھتوں والے مکان تھے۔ اس بستی کے باہر ایک جگہ درختوں کے اوپر مجھے کیسری رنگ کا تکونا جھنڈا لہراتا دکھائی دیا۔ کملاوتی نے رکشا وہاں چھوڑ دیا' کہنے لگی۔

''وہ میرے پتا جی کا مندر ہے۔''

اور اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کا مکان مندر کے پیچھے تھا۔ وہ دوڑ کر اپنے مکان کی طرف گئی تو وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مکان پر تالا پڑا ہوا تھا۔

O.....O.....O

معلوم ہوا کہ کملاوتی کا باپ کلکتہ چھوڑ کر بردوان چلا گیا ہے۔ کملاوتی نے آنسو بھری آنکھیں پونچھتے ہوئے بتایا کہ بردوان میں اس کی پھوپو رہتی ہیں۔ پتا جی اس کے ہاں گئے ہوں گے۔ سوائے اس کے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہاں سے واپس سیالدہ اسٹیشن پر آ گئے اور بردوان جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

کملاوتی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کہ اس کا باپ اس کی پھوپھو کے ہاں ہی ہو گا۔ اسے فکر تھی کہ پتا جی کہیں وہاں سے بھی کسی اور طرف نہ نکل گئے ہوں۔ کہنے لگی۔

''وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہیں گے۔ انہیں مجھ سے بڑا پیار ہے۔ میرے غائب ہو جانے سے انہیں بے حد صدمہ ہوا ہو گا۔''

بردوان اسٹیشن کے نام سے مجھے نیو تھیٹرز کی فلم دیوداس کا وہ منظر یاد آ گیا جب فلم کا ہیرو دیوداس (سہگل) اپنی محبوبہ پاروتی (جمنا) سے آخری بار ملاقات کرنے کلکتے سے بردوان جاتا ہے۔ وہ ایک بیل گاڑی میں بیٹھا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ بیل گاڑی کے نیچے لالٹین جل رہی ہے۔ بیل گاڑی ایک جنگل میں سے گزر رہی ہے۔ دیوداس گاڑی بان سے پوچھتا ہے۔

''کیوں بھائی! بردوان کب آئے گا؟''

گاڑی بان کہتا ہے۔

''بس دو کوس رہ گئے ہیں۔''

دیوداس زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے وہ کہتا ہے۔

''یہ تیرے دو کوس کب ہوں گے۔''

گاڑی بان پوچھتا ہے۔

''کیا کہا بابو جی۔''

سہگل کہتا ہے۔

''کچھ نہیں بھائی۔ جلدی چلو۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔''

گاڑی بان گانے لگتا ہے۔

نہ پی کی نگریا آئے ہے
نہ چین کریجوا پائے ہے
رات اندھیری رستا دور
تھک کر ہوا مسافر چور
دھیرے دھیرے تیرا جیون
دیپک بجھتا جائے ہے
نہ پی کی نگریا آئے ہے

یہ گیت آرزو لکھنوی نے لکھا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۳۸۔۳۹ء کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ روحانی بلندیوں کا زمانہ تھا۔ خاص طور پر نیو تھیٹرز کی فلمیں انسان کے دل میں گداز پیدا کرتی تھیں۔ انسان ان فلموں سے نیک زندگی بسر کرنے کا سبق سیکھتا تھا۔

یہ فلمیں تصنع اور جنسی ہیجان سے پاک ہوتی تھیں۔ آرزو لکھنوی اور کیدار شرما ان فلموں کے گیت نگار تھے۔ کیدار شرما نے نیو تھیٹرز کی دو ایک ابتدائی فلموں کے گیت لکھے۔ لیکن آرزو لکھنوی نیو تھیٹرز کے لیے مستقل طور پر گیت لکھتے رہے اور اس وقت نیو تھیٹرز سے ان کا ساتھ چھوٹا جب نیو تھیٹرز کی فلم کمپنی ہی ختم ہو گئی۔

آرزو صاحب اس کے بعد بمبئی آ گئے جہاں مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس ملاقات کا ذکر میں تفصیل سے اپنے ایک مضمون میں کر چکا ہوں۔

یہ لکھنے کا میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت میں اس بنگالی لڑکی کے بارے میں نہیں بلکہ بردوان کے نام سے دیوداس کی ہیروئن پاروتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کتنی پاکیزہ محبتیں تھیں ان لوگوں کی۔ کتنی روحانی بلندیاں ہوتی تھیں ان کرداروں کے چہروں اور ان کی باتوں میں۔ وہ سارے کا سارا غیر مادی اور روحانیت کا دور تھا۔ ہر شے اپنی اصل حقیقت پر قائم تھی۔

کسی اخلاقی قدر کو زوال نہیں آیا تھا۔ کوئی پھول اپنی حقیقی خوشبو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ کسی پھول پر کیمیکلز نہیں چھڑکا جاتا تھا۔ کیمیکلز کی بلا ابھی زمین کی گہرائیوں میں ہی دفن تھی۔

میں اپنے خوب صورت خیالوں سے اس وقت چونکا جب بردوان جانے والی گاڑی آ گئی۔ میں بنگالی لڑکی کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ بردوان کا اسٹیشن آیا تو ہم ٹرین سے اتر کر لڑکی کی پھوپو کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں شوق بھری نگاہوں سے بردوان کی سڑک کے ایک ایک درخت کو دیکھ رہا تھا۔ کیا خبر ان درختوں کے نیچے سے دیوداس فلم کے ہیرو کی بیل گاڑی گزری ہو۔ اب میں اس بنگالی لڑکی سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں طے کر لیا تھا کہ اسے اس کی پھوپو کے پاس پہنچا کر میں واپس کلکتے جاؤں گا اور نیو تھیٹرز کے اسٹوڈیوز میں کسی طریقے سے سہگل صاحب اور مس جمنا دیوی سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ملاقات نہ ہو سکی تو دور ہی سے دیکھ کر اپنے شوق کی تسکین کر لوں گا۔

خوش قسمتی سے بنگالی لڑکی کا پجاری باپ اپنی بہن کے گھر پر مل گیا۔ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے مل کر شدت جذبات سے بے اختیار رو پڑے۔ پجاری میرا شکریہ ادا کر رہا تھا اور میں وہاں سے بھاگ کر اسٹیشن پہنچنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ آخر مجھے موقع مل گیا اور میں کوئی بہانہ بنا کر ان سے جدا ہو گیا اور سیدھا بردوان کے ریلوے اسٹیشن پر آ کر بیٹھ گیا اور کلکتہ کی طرف جانے والی ریل گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ بردوان سے آگے بڑا اسٹیشن آسن سول ہے۔

آسن سول صوبہ بنگال کا آخری بڑا شہر ہے۔ اس کے آگے بہار کا صوبہ شروع ہو جاتا ہے۔ آسن سول جنکشن ہے۔ یہاں سے آگے ریلوے لائن دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک ریلوے لائن بنارس کان پور سے ہو کر لکھنؤ جاتی ہے اور دوسری لائن بنارس سے پٹنہ گیاہ اور گورکھپور سے ہوتی ہوئی لکھنؤ

سے جا کر مل جاتی ہے۔

اس طرح بردوان کے اسٹیشن پر دو اطراف سے ریل گاڑیاں آتی ہیں اور یہاں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت صبح سے رات گئے تک لگی رہتی ہے۔ اس زمانے میں بھی بردوان ایک اہم اسٹیشن تھا اور اب تو سنا ہے کہ بہت بڑا شہر بن گیا ہے۔

چنانچہ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور کلکتہ جانے والی ٹرین آ گئی۔ اس ٹرین نے مجھے تیسرے پہر کلکتے پہنچایا۔ اب یہ سوال میرے سامنے تھا کہ میں کلکتے میں کس جگہ بسیرا کروں۔ میرے پاس کافی پیسے تھے۔ مگر اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں کسی ہوٹل میں زیادہ دن تک قیام کرسکوں۔ میں خانہ بدوش سیلانی بلکہ آوارہ گرد قسم کا نوجوان تھا اور ہوٹل میں ٹھہرنا ویسے بھی میری طاقت سے باہر تھا۔

کلکتے میں میرے دو ہی ٹھکانے تھے۔ ایک ٹھکانا ذکریا اسٹریٹ کے امرتسری کشمیری شال بافوں، پٹ گروں اور شال مرچنٹس میں ہمارے لوہ گڑھ والے پھوپھا کا مکان تھا۔ وہاں یہ مصیبت تھی کہ وہ لوگ مجھے دیکھتے ہی پکڑ کر بٹھا لیتے تھے اور پیچھے امرتسر میں والد صاحب کو تار دے دیتے کہ حمید کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔ کسی آدمی کو بھیج کر اسے منگوا لیں۔

ایک دو بار میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا چنانچہ وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کلکتے میں میرا دوسرا ٹھکانہ میرے دوست جان محمد کا گھر تھا۔ یہ گھر نہیں تھا بلکہ ڈیڑھ کمرے کا ایک بوسیدہ سا فلیٹ تھا جو لوئر چیت پور روڈ پر سراج بلڈنگ کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ جان محمد کے انکل کا کلکتے میں سلولائڈ کا کاروبار تھا اور جان محمد اپنے انکل کی جانب سے وہاں نگران کار مقرر تھا۔

ظاہر ہے میں نے جان محمد کے پاس ہی جانے کا فیصلہ کیا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کلکتے میں ہی ہے یا کاروباری دوروں کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ یہ لوئر چیت پور روڈ اس کے فلیٹ پر جا کر معلوم ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے ایک چوراہے سے ٹرام پکڑی اور لوئر چیت پور روڈ کے سراج بلڈنگ والے چوک میں آ کر اتر گیا۔ سامنے سراج بلڈنگ تھی۔

یہ بڑی پرانی بلڈنگ تھی اور اس کے محرابی دروازے کی ڈیوڑھی میں سے ہو کر اوپر دوسری منزل کو راستا جاتا تھا۔ محرابی دروازے کے باہر ایک جانب مٹھائی کی دکان تھی اور دوسری طرف پان سگریٹ والے بنگالی کی دکان تھی جہاں ریڈیو پر ہر وقت بنگالی گانے بجتے رہتے تھے۔

پان سگریٹ کی اس دکان پر میں نے پہلی دفعہ رابندر ناتھ ٹیگور کے رابندر سنگیت کے علاوہ مشہور مسلمان بنگالی شاعر نذرالاسلام کا نذر گیتی کا سنگیت سنا تھا۔ کلکتے کے بنگالی مسلمانوں میں نذرالاسلام کے انقلابی گیت بے حد مقبول تھے۔

نذرالاسلام کی نظموں میں اسلام کی عظمت اور جذبہ جہاد کا ذکر نمایاں تھا۔ اس کی نظمیں بڑی پرجوش اور جذبات انگیز تھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری اگر پرسکون لہروں کے ساتھ بہتی ندی تھی تو قاضی نذرالاسلام کی شاعری طوفانی سمندر کی بپھری ہوئی موجیں تھیں۔ میرے امرتسری اور محلے دار دوست جان محمد کو بنگالی آتی تھی۔ وہ مجھے نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ کر کے سنایا کرتا تھا۔

سراج بلڈنگ کے باہر پان سگریٹ والی دکان کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند تھی وہ دکان کی فضا میں پھیلی ہوئی پان کے تمباکو اور قوام کی خوشبو تھی۔ میں تمباکو والا پان نہیں کھاتا تھا مگر مجھے اس کی خوشبو بڑی اچھی لگتی تھی۔ میں اکثر اس دکان پر

پاسنگ شو یا قینچی کا ایک سگریٹ لے کر صرف وہاں کی خوشبو کے لیے دیر تک کھڑا رہتا اور مجھے لگتا جیسے خوشبوئیں مجھ سے ہمکلام ہیں۔

اس وقت بھی جب میں ٹرام سے اتر کر پان کی دکان کے قریب سے گزرا تو ان خوشبوؤں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے اس وقت یہ معلوم کرنے کی جلدی تھی کہ جس شخص کے فلیٹ پر مجھے بسیرا کرنا ہے وہ وہاں موجود ہے یا کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔

میں بلڈنگ کے اندر سے سیڑھیاں چڑھ کر جان کے فلیٹ پر آیا تو دیکھا کہ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہے اور جان محمد سلولائڈ کی شیٹیں گن رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کام چھوڑ دیا اور اٹھ کر ملا۔

''تم کب آئے؟''

میں نے کہا۔

''بس ہاوڑہ اسٹیشن سے سیدھا تمہارے پاس آرہا ہوں۔''

''گھر سے بھاگ کر آئے ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

''بھاگ کر ہی آ سکتا تھا ویسے مجھے کون کلکتے آنے دیتا ہے۔''

جان شیٹوں کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ سلولائیڈ کی شیٹیں گنو۔''

اور اس نے پچاس ساٹھ کے قریب شیٹیں نکال کر میرے آگے رکھ دیں۔ میں بھی بیٹھ گیا اور شیٹیں گننے میں لگ گیا۔ جب میں نے ساری شیٹیں گن لیں تو اسے بتا دیا کہ یہ اتنی ہیں۔ جان نے اپنی گنی ہوئی شیٹوں میں انہیں جمع کر کے ایک کاپی پر لکھ لیا اور کاپی ایک طرف رکھ کر بولا۔

''ٹھہرو میں تمہارے لیے چائے منگواتا ہوں۔''

اس نے اپنے بنگالی ملازم کو آواز دے کر بلایا اور کہا کہ بار والے سے دو چائے اور بند مکھن لے آؤ۔ آج اتنی مدت گزر جانے کے بعد وہ چائے اور بند مکھن یاد آتے ہیں تو دل تھام کر رہ جاتا ہوں۔ ایسی سچی اور پاکیزہ لذتیں قیام پاکستان کے بعد کراچی میں نصیب ہوئیں۔ وہ بھی تھوڑی مدت کے لیے اس کے بعد نہ کس چائے میں وہ خوشبو رہی اور نہ بند مکھن میں وہ لذت دیکھی۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی چیزوں کی اصلیت غائب ہوتی گئی اور ملاوٹ شروع ہو گئی۔

جان محمد مجھ سے عمر میں تین چار سال بڑا تھا۔ وہ سگریٹ کی بجائے بیڑی پیتا تھا۔ اس زمانے میں پان کا یکہ مارکہ بیڑی بڑی مشہور تھی۔ جان یہی بیڑی پیتا تھا۔ میں نے بھی سگریٹ چھوڑ کر بیڑی پینی شروع کر دی مگر میرا مزاج بیڑی کے موافق نہیں تھا۔ خاص طور پر مجھے اس کی بو بہت ناپسند تھی۔ چنانچہ میں نے ایک ہفتے تک تو اسے گوارا کیا۔ پھر بیڑی چھوڑ دی۔ میں نے جان سے کہا کہ میں ماسٹر کے ایل سہگل، نواب پنچ ملک اور جمنا دیوی ہیروئن سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔

''ان سے ملنا مشکل ہے۔ تمہیں کوئی اسٹوڈیو کے اندر نہیں جانے دے گا۔''

میں نے کہا۔

''میں اسٹوڈیو کے اندر نہیں جاؤں گا۔ جب وہ باہر نکلیں گے تو انہیں مل لوں گا۔''

وہ کہنے لگا۔

''وہ کار میں ہوں گے اور بڑی تیزی سے نکل جائیں گے۔ تم انہیں دیکھتے رہ جاؤ گے۔''

میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے وہ مجھے دیکھ کر کار روک لیں۔''

جان بڑا ہنسا۔ کہنے لگا۔

"کیوں؟ تم ان کے چاچے لگتے ہو کہ تمہارے لیے وہ کاررو ک لیں گے؟ ارے ان لوگوں کو چھوڑو۔ یہ فلموں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ عام زندگی میں کچھ نہیں ہوتے۔ مجھے دیکھ لو۔ میں بھی ان کی فلمیں شوق سے دیکھتا ہوں۔ مگر میرا دل کبھی ان سے ملنے کو نہیں چاہا حالانکہ اسٹوڈیو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"یار! تم مجھے اتنا بتا دو کہ نیو تھیٹرز کا اسٹوڈیو کہاں ہے۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیسے کیوں نہیں کرتا۔"

جان بولا۔

"خواجہ قمر بٹ تمہارا رشتے دار ہے ناں؟ وہی جن کی امجدیہ ہوٹل کے پاس کشمیری شالوں کی دکان ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ کیوں؟"

جان نے کہا۔

"اس کی فلم ایکٹروں سے بڑی واقفیت ہے۔ تم اس کو کہو۔ وہ تمہیں ان سب ایکٹروں سے ملادے گا۔"

خواجہ قمر الدین بٹ کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہمارا بڑا قریبی رشتے دار تھا۔ اس میں ایک بڑی اچھی بات تھی کہ وہ کلکتہ میں مقیم ہمارے دوسرے رشتہ داروں سے بہت مختلف تھا۔ وہ کھانے پینے والا آدمی تھا۔ خوب صورت گورا چٹا تھا۔ عمر پچاس کے قریب تھی لیکن تیس سال کا لگتا تھا۔ بڑا خوش خوراک اور خوش لباس تھا۔ ہمیشہ جالی کے لٹھے کی شلوار آٹھ پونڈ کی دو گھوڑا بوسکی کی قمیص اور فلیکس پمپ شوز پہنتا تھا۔

ہاتھوں میں قیمتی پتھروں والی سونے چاندی کی انگوٹھیاں اور گلے میں سونے کی باریک زنجیر ہوتی۔ کریون اے کے سگریٹ پیتا تھا جس کا گول ڈبا ہر وقت اس کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ شراب کا عادی نہیں تھا لیکن محفل لگ جائے تو خوب پیتا تھا۔ اس میں جو میرے حساب سے سب سے اچھی بات تھی وہ یہ تھی کہ جب بھی میں گھر سے بھاگ کر کلکتے آتا اور وہ مجھے مل جاتا تو ہرگز ہرگز مجھے پکڑ کر بٹھاتا نہیں تھا اور نہ میرے گھر امرتسر کوئی خط لکھتا تھا کہ میں نے برخوردار کو پکڑ کر بٹھا لیا ہے۔ کوئی بھروسے کا آدمی بھیج کر اسے منگوالیں۔ بلکہ جب پہلی بار میں گھر سے بھاگ کر کلکتے آیا تو وہ مون لائٹ سینما کے پاس مجھے مل گیا۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

میں نے ڈر کے مارے کہہ دیا۔

"ہاں لالہ جی۔"

وہ بڑا خوش ہوا اور میری پیٹھ ٹھونک کر بولا۔

"شاباش! کشمیریوں کے پتروں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پیسے چوری کر کے تو نہیں لیے تھے؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔"

کہنے لگا۔ "بس چوری کبھی نہ کرنا۔ بہنوں کا گلہ توڑ کر چاہے پیسے نکال لینا۔ کہاں ٹھہرے ہو؟"

میں نے اسے جان محمد کا بتایا تو کہنے لگا۔

"کھانا کھایا تم نے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

بولا۔ "یہاں کیا کر رہے ہو؟ فلم دیکھنے آئے ہو؟ فلم دیکھنی ہے تو چترلیکھا جا کر دیکھو۔ اس میں کیدار شرما ایک نئی گانے والی لڑکی لایا ہے۔ پکے گانے کی

استاد ہے۔ میں کہتا ہوں ایسا گلا پھیرتی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔"

اس نے جیب سے مجھے دس روپے نکال کر دیئے اور کہا۔

"جاؤ' سینما میں جا کر دیکھو۔ چترلیکھا فلم وہیں لگی ہے۔ بارہواں ہفتہ جا رہا ہے۔"

کلکتے میں فلم چترلیکھا جس سینما گھر میں لگی ہوئی تھی میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ ڈلہوزی اسکوئر سے ذرا آگے میرا خیال ہے کہ یہ سینما ہاؤس تھا۔ اس کا ہال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی تین گیلریاں تھیں جو نصف دائرے کی شکل میں تھیں۔ سنا ہے کہ تھیٹر کے زمانے میں وہاں میڈن تھیٹرز کے کھیل ہوا کرتے تھے۔ جب جان نے مجھے خواجہ قمر بٹ سے ملنے کو کہا تو میں نے سوچا کہ وہ تو بڑا اچھا رشتہ دار ہے' وہ مجھے ضرور سہگل اور جمنا سے ملوادے گا۔ میں خواجہ قمر بٹ کی دکان پر جاتے ہوئے گھبراتا تھا کہ وہ امجدیہ ہوٹل کے پاس ذکریا اسٹریٹ میں ہے اور وہاں مجھے میرے دوسرے رشتے داروں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو وہ مجھے ضرور پکڑ لیں گے۔ مجھے یاد ہے یہ لوگ مجھے اس طرح ایک دم پکڑ لیتے تھے جس طرح کھیس ڈال کر چوری کا مرغا پکڑا جاتا ہے۔ یہ اپنی طرف سے میرے خیر خواہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ میں اگر اسی طرح گھر سے بھاگتا رہا تو بگڑ جاؤں گا۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ جن کو بگڑنا ہوتا ہے وہ گھر بیٹھے بیٹھے بگڑ جاتے ہیں۔

خواجہ قمر بٹ سے ملنا اب ضروری ہو گیا تھا۔

ایک دن میں شام کے وقت اپنے آپ کو چھپا کر چلتا ہوا امجدیہ ہوٹل کے قریب پہنچا تو اتفاق سے خواجہ صاحب ہوٹل میں بیٹھے چائے کا کپ سامنے رکھے سگریٹ کا کش لگا رہے تھے۔ میں جلدی سے ہوٹل کے اندر چلا گیا اور سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ بڑی محبت سے لگا ہوا زرد رنگ کا بنارسی پان ایک تھالی میں ان کے سامنے پڑا تھا۔ خواجہ صاحب مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور پہلا سوال ہی یہی کیا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو ناں؟"

میں نے بھی بڑے فخر سے کہا۔

"جی ہاں' لالہ جی۔"

"شاباش! کھانا کھا لیا ہے؟"

وہ کھانے کا ضرور پوچھتے تھے۔ میں نے کہا' جی ہاں۔ میں اپنے دوست جان محمد کے ہاں سراج بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ خواجہ قمر الدین نے بڑے سلیقے سے پان کو تھالی میں پڑے پڑے ایک ہی ہاتھ کی انگلیوں سے لپیٹ کر منہ میں ڈالا اور انگلیوں پر لگا ہوا کتھا اپنے بائیں کان کے اوپر گرے ہوئے بالوں سے پونچھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔"

میں نے کہا۔ "جی نہیں' لالہ جی! آپ نے مجھے جو فلم دیکھنے کے لیے پیسے دیئے تھے وہ میرے پاس ہیں۔"

"چترلیکھا دیکھی فلم؟ اب مجھے یاد آ گیا ہے۔ جس عورت نے اس فلم میں پکے گانے گائے ہیں اس کا نام رام دلاری ہے۔ تم جاؤ جاؤ بھگوان بنے والے گانے میں کیسا گلا پھیرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی میں نے فلم نہیں دیکھی۔ ابھی میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ مجھے نیو تھیٹرز کے اسٹوڈیو میں ماسٹر سہگل اور مس جمنا سے ملا دیں۔ جان کہتا تھا کہ آپ کی ان سب ایکٹروں سے بڑی واقفیت ہے۔"

خواجہ صاحب نے کریون اے کا کش لگایا اور بولے۔

”اوئے وہ لوگ تو میرے بڑے یار ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں کل تمہیں اسٹوڈیو لے چلوں گا۔ تم اس وقت یہاں ہوٹل میں آجانا۔ یہ لوگ اسٹوڈیو میں شام کے بعد ہی آتے ہیں۔ تمہیں سب سے ملاؤں گا۔“

میں بڑا خوش خوش سراج بلڈنگ میں واپس آ گیا اور جان کو سب بتا دیا۔ وہ بھی خوش ہوا اور کہنے لگا۔

”میں نے کہا تھا نا یہ کام خواجہ صاحب ہی کر سکتے ہیں۔“

اگلے روز میں شام ہوتے ہی امجد یہ ہوٹل پہنچ گیا۔ خواجہ صاحب وعدے کے مطابق وہاں اپنے کچھ بے تکلف دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”چلو میرے آوارہ گرد راج کمار۔“ اس زمانے میں بلکہ اس زمانے سے ذرا پہلے، یہ میرے بچپن کی بات ہے، ایک فلم پرل ٹاکیز میں لگی تھی جس کا نام تھا ”آوارہ راج کمار۔“

مجھے اتنا یاد ہے یہ فلم میں نے پرل ٹاکیز میں دیکھی تھی۔ اس میں شاہو معاہوک نے ہیرو کا کام کیا تھا۔ شاہو معاہوک اس وقت چھوٹا تھا۔

یہ فلم بڑی چلی تھی اور بڑی مشہور ہوئی تھی۔ میں سولہ سترہ سال کا ہو گیا تھا اور قمرالدین بٹ کو یہ فلم ابھی تک یاد تھی۔ اس زمانے کی فلمیں بڑی سادہ ہوتی تھیں۔ فلم میں کام کرنے والی کسی بھی عورت کے جسم کا کوئی بھی حصہ لباس سے باہر نکلا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ سادہ لوگ تھے اور سیدھی سادی فلمی کہانیاں ہوتی تھیں۔ کسی میں دیہات کے اسکول ماسٹر کی کہانی ہوتی تھی، کسی میں بہن بھائی کی محبت کی کہانی ہوتی تھی اور کسی میں باپ کی بیٹی سے محبت کا قصہ ہوتا تھا۔

صرف واڈیا موو ی ٹون کی ”ہنٹر والی“ قسم کی بعض فلمیں ایسی ہوتی تھیں جن میں عورت ذرا کھل کر ڈانس کرتی تھی۔ یقین کریں اس ڈانس کو دیکھ کر بھی ذہن میں کوئی واہیات خیال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

شاید یہ اس زمانے کی فضا کا اثر بھی تھا۔ اس زمانے کی فضا میں روحانیت رچی ہوئی تھی۔ خواجہ قمرالدین بٹ مجھے ساتھ لے کر نیو تھیٹرز کے اسٹوڈیوز میں پہنچ گئے۔ گیٹ کے چوکیدار سے لے کر اسٹوڈیو کے ملازموں تک ہر کوئی خواجہ صاحب سے علیک سلیک لیتا تھا۔ آفس میں جا کر معلوم ہوا کہ سہگل اور جمنا دیوی دونوں کسی فلم کی شوٹنگ کرنے آسام کے علاقے میں گئے ہوئے ہیں۔

میں سہگل اور جمنا دیوی سے ملنے کی حسرت دل میں لیے سراج بلڈنگ آ گیا۔ اب میں ان لوگوں کی کلکتے واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ہفتے کے بعد میں نے ایک فلمی اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ نیو تھیٹرز کا فلمی یونٹ شوٹنگ کے بعد آسام سے واپس آ گیا ہے لیکن جمنا دیوی کچھ روز ابھی دارجلنگ میں قیام کریں گی اور ماسٹر سہگل اپنی فلمی مصروفیات کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے ہیں، جہاں وہ اپنے کالج روڈ والے فلیٹ میں قیام کریں گے۔

اب میرا دل کلکتے میں نہیں لگتا تھا۔ میں نے اپنے دوست جان سے کہا کہ میں سہگل سے ملنے بمبئی جا رہا ہوں۔ اس نے کہا تمہاری مرضی۔ چنانچہ میں ایک روز ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ بمبئی میں میرا ایک ٹھکانہ ہو سکتا تھا۔ یہ ٹھکانہ لاہور والے اشرف صاحب کا آٹو اسٹور تھا جو لیمنگٹن روڈ پر واقع تھا اور جہاں میں پہلی مرتبہ گھر سے بھاگ کر گیا تھا تو اشرف صاحب نے مجھ سے ذکر کیے بغیر میرے گھر خط لکھ دیا تھا کہ آپ کا لڑکا میرے پاس ٹھہرا ہوا ہے، کسی کو

بھیج کر اسے لے جائیں۔

اشرف صاحب نے بڑا نیکی کا کام کیا تھا مگر میرا ایڈونچر برباد ہو گیا تھا اور گھر والے بمبئی پہنچ کر مجھے واپس امرتسر لے گئے تھے اور مجھے بڑی مار پڑی تھی۔ اس وجہ سے میں اشرف صاحب کے آٹو اسٹور کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ چپکے سے میرے گھر خط لکھ دیں گے اور میں پکڑا جاؤں گا۔ دوسری کون سی جگہ ہو سکتی ہے جہاں میں ٹھہر سکتا تھا۔ ٹرین بمبئی کی طرف اڑی جا رہی تھی اور میں یہی سوچ رہا تھا۔

بمبئی میں کسی کے ہاں ٹھہرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ بمبئی کی فضا بڑی کاروباری قسم کی تھی۔ متوسط طبقے کا ہر آدمی اپنی جگہ مجبور تھا اور دو تین دن سے زیادہ کسی کو اپنے ہاں مہمان رکھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس شہر کا کوئی اپنا کلچرل بیک گراؤنڈ نہیں تھا، جس طرح کہ کلکتے کے پیچھے پورا بنگلہ لٹریچر اور بنگلہ میوزک اور بنگلہ کلچر تھا۔

بمبئی اب تو صوبہ مہاراشٹر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس زمانے میں یعنی 39-1938 میں یہ شہر گجرات کاٹھیاواڑ کے زیر اثر تھا اور گجراتی عام بولی جاتی تھی۔ ویسے بمبئی میں اینگلو انڈین، پارسی، مراٹھے، بنگالی، پنجابی اور مدراسی لوگ بھی مدتوں سے آباد چلے آ رہے تھے۔

اس شہر کو کاسموپولیٹن شہر کہا جاتا تھا کہ وہاں کا کلچر ملا جلا تھا۔ بمبئی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ شہر جدوجہد کا شہر ہے اور یہاں کاروباری اور خاص طور پر فلمی دنیا میں بطور اداکار، رائٹر یا پروڈیوسر کے کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے، فاقے کرنے پڑتے ہیں، فٹ پاتھ پر سونا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ آدمی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

اس کا تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ جب پہلی بار میں فلم کا ہیرو بننے گھر سے بھاگ کر بمبئی گیا تھا تو اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی ہو گی مجھے وہاں فاقے بھی آ گئے تھے اور میں کئی راتیں فٹ پاتھ پر بھی سویا تھا۔ پہلے تو مجھے فٹ پاتھ پر سوتے ہوئے سخت شرم آئی تھی مگر جب مجھ پر نیند نے شدید غلبہ کیا اور میں نے سیکڑوں لوگوں کو صاف ستھرے چمکیلے فٹ پاتھ پر قطاروں کی صورت میں سوتے ہوئے دیکھا تو میں بھی ایک جگہ فٹ پاتھ پر لیٹ گیا۔ اس رات ثابت ہو گیا کہ اصل چیز نیند ہوتی ہے بستر نہیں۔ اگر نیند آ رہی ہو تو آدمی فٹ پاتھ پر بھی سو جاتا ہے۔ اگر نیندیں اڑ چکی ہوں تو پھر ریشمی بچھونے پر بھی آدمی ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔

میرے بچپن کے استاد مجھے کہا کرتے تھے کہ خدا سے نیند مانگنا، بستر کبھی نہ مانگنا۔ میں نے اپنے پہلے سفر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ بمبئی بڑا طوطا چشم شہر ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ایک بہت بارونق سڑک پر چلتے چلتے مجھے پیاس لگی تو میں نے سوڈا واٹر کی ایک دکان پر جا کر پانی مانگا تو دکاندار نے کہا۔

”پانی نہیں ہے۔ سوڈا واٹر ہے۔“

مجھے اس کا یہ جملہ پورے کا پورا ابھی تک یاد ہے۔ اب یہ پتا نہیں وہاں کیا حال ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں، بمبئی میں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا تھا۔ اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو آپ کو کھانے پینے کو بھی مل جائے گا اور سونے کے لیے جگہ بھی مل جائے گی۔ اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو آپ کو فاقہ کرنا ہو گا اور فٹ پاتھ پر سونا ہو گا۔

بعض شہر غریب پرور ہوتے ہیں جیسا کہ ہمارا لاہور شہر ہے۔ اس زمانے میں بمبئی غریب پرور نہیں

تھا، بڑا سنگدل شہر تھا۔ لیمنگٹن روڈ والے ٹواسٹور کے مالک اشرف صاحب ایسے نیک دل لوگ بمبئی میں خال خال ہی ملتے تھے۔

کلکتے سے چلی ہوئی ریل گاڑی بمبئی شہر کے مضافات میں داخل ہوچکی تھی اور مجھے ابھی تک پتا نہیں تھا کہ میں بمبئی میں کہاں ٹھہروں گا۔ میرے پاس اتنے پیسے ضرور تھے کہ میں کسی معمولی سے ہوٹل میں تین چار دن تک ٹھہر سکتا تھا' لیکن میں یہ پیسے بمبئی کے دوسرے اخراجات کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔

ٹرین بمبئی کے بڑے اسٹیشن بوری بندر پہنچ گئی اور میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا تھا۔ آخر یہی سوچا کہ ایک دن کسی تھرڈ کلاس ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں اس کے بعد کوئی جگہ تلاش کروں گا۔ اسٹیشن پر ہوٹلوں کے ایجنٹ موجود ہوتے تھے۔ دوسرے مسافروں کی طرح انہوں نے مجھے بھی اکیلا جان کر گھیر لیا۔ کوئی اپنے ہوٹل کی تعریف میں کچھ کہتا کوئی کچھ آخر ایک آدمی نے کہا۔

''رام بھروسے ہوٹل میں چلو بابو۔ پانچ روپے کرایہ ہوگا۔ کھانا پینا بھی بڑا استا مل جائے گا۔''

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

رام بھروسے ہوٹل کا نام اور اس کی بوسیدہ عمارت کی شکل صورت آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ ہوٹل بمبئی کے کسی گنجان آبادی والے علاقے میں واقع تھا۔ مجھے اس علاقے کا نام نہ اس وقت معلوم تھا نہ آج معلوم ہے۔ دو منزلہ پرانی عمارت تھی جس کے نیچے ایک دکان نما دفتر میں ایک لالہ جی رجسٹر لیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے رجسٹر میں میرا نام اور میرے شہر کا نام اور ایڈریس لکھا' پانچ روپے لیے اور چابی دے کر کہا۔

اوپر چڑھ کر بائیں باجو والا مالا ہے۔''

مالا یعنی کمرہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں ایک چارپائی پر گندا سا بستر بچھا ہوا تھا' کیا کرتا؟ مجبوراً اور بڑی مشکل سے میں نے وہاں رات بسر کی اور دوسرے دن رام بھروسے کو چھوڑ کر میں اللہ کے بھروسے پر فٹ پاتھ پر چل پڑا۔ ذہن صرف یہی سوچ رہا تھا کہ کہاں ٹھہرا جاسکتا ہے۔

اچانک مجھے چرنی روڈ والے نیک دل حکیم صاحب کا خیال آ گیا۔ بمبئی میں ایک دفعہ فاقے کی حالت میں' میں حکیم صاحب کا بورڈ دیکھ کر ان کے پاس چلا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے کھانا بھی کھلایا تھا اور مجھے اپنے لوہے کے چٹوں میں دوائیاں کوٹنے پر ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ میں دکان کے باہر بیٹھ کر دوائیاں کوٹتا' ڈیوڑھی والے نلکے کے پاس بیٹھ کر پرانی بوتلیں دھوکر صاف کرتا۔ اگر دوائیوں کی بوتلوں اور ڈبوں پر کوئی لیبل اکھڑ گیا ہوتا تو اسے گوند سے چپکاتا۔ حکیم صاحب نے دکان کے ایک چھوٹے کمرے کو اخبار بینی کی لائبریری میں تبدیل کررکھا تھا۔ یہاں ایک بڑا سا بیضوی میز بچھا ہوا تھا جس کے گرد لوہے کی پرانی کرسیاں لگی تھیں۔ محلے کے بڑے بوڑھے شام کو یہاں آکر اخبار وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی حکیم صاحب کے مطب میں مسلم لیگ کا کوئی لیڈر بھی آتا تھا۔ حکیم صاحب انہیں خاص طور پر لائبریری دکھاتے تھے۔ اس روز لائبریری کی صفائی بھی مجھے کرنی پڑتی تھی۔ رات کو میں اسی لائبریری کے بیضوی میز پر سوتا تھا۔ مجھے ایک میلا سا سرہانہ اور چادر ملی ہوئی تھی جسے میں صبح لپیٹ کر لائبریری کی ایک الماری میں رکھ دیتا تھا۔ حکیم صاحب کا آرڈر تھا کہ چھت کا پنکھا رات کے دس بجے کے بعد بند کردیا جائے گا۔ بمبئی میں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور وہاں کا موسم گرمیوں میں اکثر خوشگوار رہتا ہے اور رات کو چونکہ سمندر کی طرف سے ہوا چلتی ہے اس لیے رات کو

پنکھے کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ مگر میرے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بعض اخبار کے کیڑے دیر تک بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے تھے اور میں چادر اور سرہانہ لیے ایک طرف بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہتا تھا کہ کب وہ اخبار کا مطالعہ ختم کرکے لائبریری کی جان چھوڑیں اور میں میز پر چادر بچھا کر سوؤں۔ میں دن بھر کی مشقت کا بڑا تھکا ہوا ہوتا تھا اور کونے میں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تھا۔ میں دس بجے کی بجائے رات کے نو بجے ہی چھت کا پنکھا بند کردیتا مگر دو ایک بوڑھے بند پنکھے میں بھی بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے تھے۔ میں دل میں دعائیں مانگتا کہ بجلی چلی جائے مگر یہ انگریزوں کا زمانہ تھا اور بجلی سال میں کبھی کبھار ہی جاتی تھی۔

گیارہ سوا گیارہ بجے اخبار کے بوڑھے کیڑے عینک اتار کر جیب میں رکھتے۔ بڑی آہستہ آہستہ اخبار کو تہہ کرکے ایک طرف رکھتے۔ اخبار کو رکھتے رکھتے بھی وہ اس کی کوئی نہ کوئی خبر پڑھتے جاتے تھے۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلتے تو میں خدا کا شکر ادا کرتا۔ جلدی سے دروازہ بند کرکے کنڈی لگاتا اور میز پر سرہانہ رکھ کر بس میز پر گر پڑتا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہتا کہ میں کب سویا تھا۔

میں کوئی تین چار سال کے بعد حکیم صاحب کے پاس جارہا تھا۔

دل میں بار بار ایک ہی دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے حکیم صاحب زندہ ہوں۔ حکیم صاحب زندہ تھے مگر پہلے سے زیادہ بوڑھے اور کمزور ہوگئے تھے۔ عینک ناک پر کچھ اور نیچے ڈھلک آئی تھی اور آنکھوں کے حلقے زیادہ گہرے ہوگئے تھے۔ اب خیال آتا ہے کہ حکیم صاحب شاید کوئی کشتہ وغیرہ کھاتے تھے۔ آدمی بڑے شریف اور خوش اخلاق تھے مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ انہیں میرا نام بھی یاد تھا۔ کہنے لگے۔

''ارے! تم تو بڑے ہوگئے ہو۔ اب بھی گھر سے بھاگ کر بمبئی ایکٹر بننے آئے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں حکیم صاحب میں نے ایکٹر بننے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ اب میں ایک ایکٹر سے ملنے آیا ہوں۔''

''اچھا؟'' حکیم صاحب نے عینک کے اوپر سے میری طرف گھور کر پوچھا۔ ''کون ہے وہ ایکٹر؟ ضرور موتی لعل ہوگا۔''

اس زمانے میں موتی لعل بطور ہیرو سب سے مشہور تھا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں' میں ماسٹر سہگل سے ملنے آیا ہوں۔'' حکیم صاحب بولے۔ ''ارے' وہ تو کلکتے میں ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں کلکتے سے ہی آیا ہوں۔ میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ ماسٹر سہگل آج کل بمبئی میں ہے۔''

حکیم صاحب نے افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ارے کیوں اپنی عمر برباد کررہا ہے۔ یہ وقت تمہارے پڑھنے کا ہے' کوئی ہنر سیکھنے کا ہے۔ کب تک یہ آوارہ گردیاں کرتا رہے گا۔''

میں نے کہا۔ ''حکیم صاحب میں نویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔ اسکول میں چھٹیاں تھیں اس لیے سیر کرنے نکل پڑا۔''

حکیم صاحب کہنے لگے۔ ''اب میرے پاس تمہارے لیے کوئی کام وغیرہ تو نہیں ہے۔ دو ملازم پہلے سے کام کررہے ہیں۔ چار چھ دن رہنا ہے تو یہاں رہ لینا۔ گھر میں جو پکتا ہے ہمارے ساتھ تم بھی کھالیا کرنا اور ہاں بھائی' رات کو لائبریری میں ہی سونا پڑے گا۔''

میرے ساتھ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ آج کل تو بڑے سوٹ کیس کو بھی اٹیچی کیس کہتے ہیں۔ ان دنوں اٹیچی کیس بریف کیس سائز کا ہوا کرتا تھا جس میں دنیا جہان کی چیزیں آ جاتی تھیں۔ میرے اٹیچی کیس میں دو جوڑے کپڑوں کے، ٹوتھ پیسٹ برش، شیونگ کا سامان، میری تھوڑی تھوڑی داڑھی بڑھ آتی جس کی میں فوراً شیو کر دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی قینچی، ایک چھوٹی نوٹ بک اور پنسل، کنگھی اور رات کو لگانے کی ایک کریم ہوتی تھی جس کا نام کولائیز ڈ ویکس تھا۔

اس کی رات کی رانی ایسی خوشبو مجھے بڑی پسند تھی۔ ویسے تو میں کوئی کریم پاؤڈر وغیرہ نہیں لگاتا تھا مگر یہ کریم تھوڑی سی رات کو ضرور لگا کر سوتا تھا۔ ساری رات مجھے اس کی دھیمی دھیمی خوشبو آتی رہتی تھی۔ بس اس سے زیادہ مجھے اس کریم سے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

میں نے اپنا اٹیچی کیس لائبریری والے کمرے کی الماری میں رکھ دیا۔ لائبریری کی حالت پہلے سے زیادہ خستہ ہو گئی تھی۔ لوہے کی کرسیوں کا روغن اتر چکا تھا اور درمیان میں جو میز بچھی ہوئی تھی اس کا رنگ بھی اترنے لگا تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا۔

''میں سہگل صاحب کے فلیٹ پر ان سے ملنے جا رہا ہوں وہ کالج روڈ پر رہتے ہیں۔''

حکیم صاحب بولے۔ ''ارے تمہیں معلوم ہے کہ کالج روڈ کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اب یاد نہیں رہا۔''

کہنے لگے۔ ''ٹکٹ لے کر لوکل ٹرین پر بیٹھ جانا اور مونتگا اسٹیشن پر اتر جانا۔ کالج روڈ مونتگا اسٹیشن کی دوسری طرف ہے۔''

جب میں جانے لگا تو بولے۔

''ارے کیوں در بدری کرنے جا رہے ہو۔ یہ ایکٹر لوگ ہرایرے غیرے کو نہیں ملا کرتے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں حکیم صاحب! میں نے سہگل کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ بڑا سادہ طبیعت والا ہے اور ہر کسی سے مل لیتا ہے۔''

حکیم صاحب عینک کو ناک کے اوپر چڑھاتے ہوئے بولے۔

''اچھا بھائی چلا جا، جا کر دیکھ لے۔ پیسے ہیں ٹکٹ کے تمہارے پاس؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں ہیں۔''

میں چرنی روڈ سے سیدھا ایک لوکل اسٹیشن پر آیا۔ ٹکٹ لیا اور مونتگا کی طرف جانے والی لوکل ٹرین میں بیٹھ گیا۔ لوکل ٹرین بھی بمبئی کی ایک خاص چیز ہوا کرتی تھی۔ یہ بمبئی شہر کے شاید آس پاس دائرے کی شکل میں چلتی تھی اور بمبئی کے بڑے بڑے اور مشہور علاقوں سے گزر کر جہاں سے چلتی تھی وہیں واپس آ جاتی تھی۔ لوکل ٹرین کا ایک اپنا کلچر تھا۔ اس ٹرین میں تھوڑی دور کی سواریاں بیٹھتی تھیں۔ یہ ساری سواریاں شہر کی ہوتی تھیں۔ ان میں کوئی شہر سے باہر کسی دوسرے شہر کو جانے والا مسافر نہیں ہوتا تھا۔ اس میں سیٹیں بھی تھیں اور آمنے سامنے کے دروازوں کے درمیان لوہے کے راڈ بھی لگے ہوتے تھے جنہیں پکڑ کر مسافر کھڑے رہتے تھے اور اگلے اسٹیشن پر اتر جاتے تھے۔ اس ٹرین میں سامان رکھنے اور سونے والی کوئی برتھ نہیں ہوتی تھی۔ اس ٹرین میں تقریباً دوسرے تیسرے اسٹیشن پر سے کوئی نہ کوئی دوائیاں، گولیاں اور سر درد کی دوائی بیچنے والا سوار ہو جاتا تھا اور جب تک اگلا اسٹیشن آتا تھا وہ اپنی تقریر بھی کر لیتا تھا اور اپنی دوائی کی تمام خاصیتیں بتا کر دس بارہ آنے کی گولیاں فروخت کر کے دوسرے تیسرے

اسٹیشن پر اتر بھی جاتا تھا۔ لوکل ٹرین میں موسمیاں بیچنے والی مرہٹہ عورتیں بھی آتی تھیں۔ وہ کسی نہ کسی اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو کر موسمیوں کا ٹوکرا نیچے رکھ کر موسمیاں بیچتی تھیں۔ یہ موسمیاں بمبئی کی خاص سوغات تھیں۔ ان کا رنگ سبز اور چھلکا پتلا ہوتا تھا اور بڑی مشکل سے چھیلی جاتی تھیں۔

یہ بالکل کیسری رنگ کی ہوتی تھیں اور بڑی میٹھی ہوتی تھیں۔ موسمیاں بیچنے والی مرہٹہ عورتوں کی آنکھیں بھی کیسری رنگ کی ہوتی تھیں اور ماتھے پر اسی رنگ کا تلک لگا ہوتا تھا۔ ناک میں بڑی سی نتھ ہوتی اور تیل میں بسے ہوئے بالوں کو کھینچ کر پیچھے جوڑا کیا ہوتا تھا۔ جوڑے میں چاہے باسی ہی سہی لیکن سفید پھولوں کا ایک آدھ ہار ضرور سجا ہوتا تھا۔ یہ سانولے اور گہرے سانولے رنگ کی بڑی محنت کش بلکہ جفاکش عورتیں تھیں۔ مجھے ان مرہٹہ عورتوں کی ساڑھیوں کے رنگ اور جوڑے میں لگے ہوئے سفید پھول بڑے اچھے لگتے تھے۔ مہاراشٹر کی خواتین کی ساڑھی دور سے پہچانی جاتی ہے۔ ان ساڑھیوں کے رنگ بڑے شوخ ہوتے ہیں۔ سبز، سرخ ساڑھی پر نیلے یا سیاہ رنگ کا بارڈر ہوتا تھا۔ موسمیاں بیچنے والی مرہٹہ عورتوں کا ساڑھی باندھنے کا بھی اپنا خاص انداز ہوتا تھا۔ ساڑھی باندھنے کے اپنے اس انداز کی وجہ سے مرہٹہ عورت ہزاروں عورتوں میں صاف پہچانی جاتی ہے۔ بعض موسمیاں بیچنے والی عورتیں سگریٹ بھی پیتی تھیں اور ان کے ٹوکرے میں پیلے ہاتھی یا چار مینار سگریٹ کی ڈبی بھی نظر آ جاتی تھی۔ پان تو اکثر عورتیں کھاتی تھیں۔ بمبئی میں اس زمانے میں چار مینار اور پیلا ہاتھی عوام کے مقبول سگریٹ تھے۔ چار مینار کی ڈبی پر حیدرآباد دکن کی عمارت چار مینار کی تصویر ہوتی تھی۔ پیلا ہاتھی ذرا لائٹ سگریٹ تھا مگر چار مینار بڑا سخت سگریٹ تھا۔ بالکل ہمارے کے ٹو کی طرح۔ فلم ڈائریکٹر اے آر کاردار کے دیرینہ ساتھی ایم صادق صاحب کو بمبئی میں میں نے یہی سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔ بڑے کم گو اور شائستہ مزاج فلم ڈائریکٹر تھے۔ ایک بار میں گھر سے بھاگ کر ایکٹر بننے کے شوق میں ان کے پاس بھی چلا گیا تھا۔ بمبئی میں ان کا فلیٹ میرن ڈرائیو کی ایک بلڈنگ میں دوسری یا تیسری منزل پر تھا۔ مجھے انہوں نے کھانا کھلایا تھا اور دوسرے دن اپنے ساتھ کاردار اسٹوڈیو میں بھی لے گئے تھے پھر انہوں نے سمجھایا کہ مجھے ابھی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے اس کے بعد بمبئی آ کر ان سے ملوں۔ مجھے یاد ہے انہوں نے مجھے انیس روپے بمبئی سے امرتسر تک ریل کے کرایہ وغیرہ کے لیے دیئے تھے اور میں بوری بندر کے اسٹیشن سے رات کے نو بجے ٹرین میں بیٹھ کر امرتسر چلا آیا تھا۔

بمبئی کی لوکل ٹرینیں بجلی کے ذریعے چلتی تھیں اور ان کی اسپیڈ بڑی تیز ہوتی تھی۔ کمپارٹمنٹ کی ہر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اگر ٹرین میں آگ لگ جائے تو لوگ باہر نہ نکل سکیں۔

لوکل ٹرین ریلوے لائن کے آس پاس گرے پڑے ردی کاغذوں کو اڑاتی بڑی تیز رفتاری سے شہر کی اونچی اونچی بلڈنگوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ جب ٹرین مونتگا کے اسٹیشن پر رکی تو میں اتر گیا۔ سیڑھیوں والا ریلوے پل عبور کر کے اسٹیشن کی دوسری طرف آ گیا۔ ایک آدمی سے کالج روڈ کا پوچھا۔ اس نے کوٹھیوں کے درمیان سے گزرتی چھوٹی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس سڑک پر چل پڑا۔ کچھ دور جا کر ایک آدمی سے پوچھا کہ یہاں سہگل صاحب کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس نے ایک عمارت کی

طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اس بلڈنگ میں سہگل ٹھہرتا ہے۔ جا کر معلوم کرلو۔"

میں نے جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ سہگل شوٹنگ کے لیے کشمیر گیا ہوا ہے ایک مہینے بعد آئے گا۔ میں نے کہا ایسے سہگل کی ایسی کی تیسی۔ ایرانی ہوٹل میں چل کے چائے کا ایک کوپ پیو چار مینار کا سگریٹ سلگاؤ' پکڑو پنجاب میل اور چلو امرتسر کے کمپنی باغ میں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ کالج روڈ سے نکل کر ایک ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا ایک کوپ پیا' چار مینار کا سگریٹ سلگایا اور لوکل ٹرین پکڑ کر سیدھا حکیم صاحب کے ہاں آگیا۔ حکیم صاحب نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"ارے مل آئے سہگل سے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں مل آیا ہوں۔ اب واپس پنجاب جا رہا ہوں۔"

حکیم صاحب مجھے حسب عادت نصیحتیں کرنے لگے کہ اب گھر جا کر ساری توجہ اسکول کی پڑھائی کی طرف دینا' یہ عمر پھر ہاتھ نہ آئے گی' وغیرہ وغیرہ۔ میں نے پیسوں کا جائزہ لیا۔ میرے پاس پندرہ سولہ روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ بمبئی سے امرتسر تک ٹرین میں تھرڈ کلاس کا کرایہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ پہلے چودہ پندرہ روپے ہوتا تھا اب انیس روپے کے قریب ہو گیا تھا۔ میرے پاس کرایہ پورا نہیں تھا۔ حکیم صاحب سے کچھ روپے لینا میری طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ پہلے سوچا کہ بغیر ٹکٹ کے گاڑی میں بیٹھ جاتا ہوں' جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پھر خیال آیا کہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ بمبئی سے امرتسر تک بڑا لمبا سفر ہے۔ راستے میں کسی بھی جگہ ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرنے آسکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ بمبئی سے دلی کا ٹکٹ لے لیتا ہوں اور دلی سے امرتسر بغیر ٹکٹ کے بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بوری بندر سے رات کے نو بجے پنجاب میل چلتی تھی۔ یہ بمبئی سے پشاور تک جاتی تھی۔ میں نے دلی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور پنجاب میل میں بیٹھ گیا۔ ٹرین چلی تو شکر ادا کیا کہ بمبئی کی فلمی دنیا کی بک بک سے نکل رہا ہوں۔ دلی پہنچ کر اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ راستے میں کسی جگہ کوئی ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرنے نہیں آیا تھا۔ اب آگے مجھے بغیر ٹکٹ سفر کرنا تھا۔ اس کام میں میں بڑا ماہر تھا اور مجھے یہ پسند بھی بہت تھا۔ ایک پلیٹ فارم پر لاہور جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ پنجاب میل کے چھوٹنے کے آدھ گھنٹہ بعد چلتی تھی۔ میں ٹکٹ کے بغیر ہی اس کے تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ میں دروازے کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ اگر ٹی ٹی کسی اسٹیشن پر اندر آجائے تو میں آنکھ بچا کر دروازے میں سے باہر نکل جاؤں۔ ٹرین ساری رات چلتی رہی۔ صبح ایک اسٹیشن پر رکی تو ایک ٹی ٹی ہمارے ڈبے میں آگیا۔ پتا نہیں کون سا اسٹیشن تھا جیسے ہی ٹی ٹی میرے قریب سے ہو کر آگے گیا میں بڑے آرام سے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ پلیٹ فارم پر مڑتے ہی ٹرین کے آخری ڈبے کی طرف چل پڑا۔ میں تیز تیز چل رہا تھا کیونکہ وہ کوئی چھوٹا اسٹیشن تھا اور ٹرین نے وہاں زیادہ دیر نہیں رکنا تھا۔ تھرڈ کلاس کا ایک ڈبا نظر آیا میں اس میں سوار ہو گیا اور دروازے میں کھڑا رہا اور پیچھے دیکھتا رہا کہ ٹی ٹی نیچے اترتا ہے یا نہیں۔ پنجاب شروع ہو گیا تھا۔ مجھے بڑا حوصلہ تھا کہ اب امرتسر زیادہ دور نہیں ہے۔ ٹرین تھوڑی دیر کے بعد ہی چل پڑی۔ میں پھر بھی دروازے میں کھڑا پیچھے دیکھتا رہا۔ جب ٹرین اسٹیشن سے نکل گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب ٹی ٹی نیچے نہیں اترے گا۔ بعض ٹی

ٹی یہ کرتے تھے کہ چلتی ٹرین میں ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں سوار ہو جاتے تھے میں دیر تک دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ ٹرین نے بھی کافی اسپیڈ پکڑ لی تھی۔ میں دروازے کے قریب ہی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگلا اسٹیشن لدھیانہ تھا۔ یہ کافی بڑا جنکشن تھا۔ جیسے ہی ٹرین رکی میں جلدی سے پلیٹ فارم پر اتر گیا اور چل پھر کر ٹرین کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دور سے اس ڈبے میں نگاہ ڈالی جس ڈبے میں ٹی ٹی داخل ہوا تھا۔ وہ دروازے میں سے باہر نکل کر چل رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو گیا کیونکہ کبھی کبھی ٹی ٹی پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے بھی کسی مسافر کا ٹکٹ چیک کر لیا کرتے تھے مگر ایسا وہ اس وقت کرتے تھے جب انہیں کسی مسافر پر شک ہو جائے کہ بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہے۔

ٹی ٹی پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف چلا گیا' شاید اسے لدھیانے سے کسی دوسری ٹرین میں واپس دلی جانا تھا۔ لدھیانہ بڑا اسٹیشن تھا۔ یہاں ٹرین زیادہ دیر رکتی تھی۔ میں کتابوں کے اسٹال پر رسالے وغیرہ دیکھنے لگا لیکن ٹی ٹی کو میں نے اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ پلیٹ فارم کے گیٹ پر دوسرے ٹکٹ چیکر سے باتیں کر رہا تھا پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا جب تک انجن نے سیٹی نہیں بجائی میں کتابوں' رسالوں کے اسٹال پر ہی کھڑا رہا۔ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے کو میں نے تاڑ لیا تھا' جب ٹرین کھسکنے لگی تو میں بھی ڈبے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا لیکن ٹی ٹی کو برابر دیکھ رہا تھا کہ کہیں یہ دوڑ کر ٹرین میں سوار تو نہیں ہوتا مگر وہ گیٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ میں دوڑ کر ڈبے میں چڑھ گیا۔

ٹرین کا اگلا اسٹاپ جالندھر تھا۔ جالندھر سے بھی ایک ٹی ٹی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ وہ انٹر کلاس کے ڈبے میں چڑھا تھا' میرا ڈبا تھرڈ کلاس کا تھا اور اس سے دو تین ڈبے چھوڑ کر تھا۔ امرتسر تک میری ٹی ٹی سے ہی آنکھ مچولی ہوتی رہی اور ٹی ٹی کے ساتھ ساتھ میں بھی ڈبے بدلتا رہا۔ جب مانانوالہ اسٹیشن گزر گیا اور ٹرین امرتسر کی حدود میں داخل ہو گئی تو میں دلیر ہو گیا۔ اب میں کسی بھی جگہ ٹرین سے اتر کر پیدل بھی امرتسر جا سکتا تھا۔ ٹرین تیز رفتاری سے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ پھر چالیس کھوہ بھی گزر گئے اور ایک طرف امرود کے باغات اور دوسری طرف شریف پورے کی آبادی شروع ہو گئی۔ یہاں کبھی کبھی آؤٹر سگنل ڈاؤن نہیں ہوتا تھا تو ٹرین شریف پورے کے پاس رک جاتی تھی۔ میں دعا مانگتا رہا کہ ٹرین آؤٹر سگنل پر رک جائے اور میں یہیں اتر کر شریف پورے کے ریلوے پھاٹک سے ہوتا ہوا اپنے محلے میں چلا جاؤں۔

O......O......O

ہمارا محلہ شریف پورے کے قریب ہی تھا مگر ٹرین وہاں نہ رکی۔ سیدھی پلیٹ فارم پر جا کر رکی۔ میں ڈبے کے دوسرے دروازے میں سے ریلوے لائن پر اتر گیا اور دوسری جانب کی ریلوے لائن پار کر کے دوسرے پلیٹ فارم پر چڑھ کر ریلوے یارڈ کی طرف جلدی جلدی چلنے لگا۔ ریلوے یارڈ میں سے گزر کر سامنے والی دیوار کے ساتھ ساتھ ریگو برج کی طرف رخ کر لیا میرے ساتھ جو چھوٹا اٹیچی کیس تھا یہ اس بات کی علامت تھی کہ میں ٹرین سے اترا ہوں۔ یہ اٹیچی کیس مجھے پھنسا سکتا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ میں لٹکانے کی بجائے اپنے سینے کے ساتھ لگایا اور یوں بے نیازی سے سیٹی بجاتا چلنے لگا جیسے میں یونہی سیر کرتا ہوا ریلوے یارڈ میں آگیا ہوں۔

میری قسمت اچھی تھی کہ کسی نے مجھ سے ٹکٹ کا نہ پوچھا۔ وہاں ایک جگہ آنے جانے والے لوگوں

نے یا ریلوے کے آدمیوں نے دیوار توڑ کر ایک شگاف ڈال رکھا تھا۔ میں جلدی سے اس میں سے گزر کر باہر گول باغ والی سڑک پر نکل آیا۔ سڑک پر آنے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا اور گول باغ میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے سکندر گیٹ سے گزر کر بال بازار میں آ گیا۔ اب میں اپنے محلے میں تھا۔ گھر پہنچ کر والد صاحب نے جو طبیعت صاف کی اس کا میں کافی حد تک عادی ہو چکا تھا۔ والدہ اور بہنیں تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں مگر والد صاحب نے کوچوان والا سانٹا پکڑ لیا اور میرے گرد ہو گئے۔

میں سر بازوؤں میں دے کر بڑے آرام سے مار کھاتا رہا۔ میرا جسم والد صاحب کے سانٹے پر لگ گیا تھا مجھ پر اس کا زیادہ اثر نہیں ہوتا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں کمپنی باغ میں پھر رہا تھا مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ ایک ایک درخت مجھ سے میرا حال پوچھ رہا تھا۔ کسی ایک درخت نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ان آوارہ گردیوں میں اپنی قیمتی عمر کیوں برباد کر رہے ہو۔ یہ عمر تمہارے پڑھنے کی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کی ہے۔ سب درخت جانتے تھے کہ جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے قدرت نے مجھے پیدا کیا ہے وہ تعلیم مجھے درخت دے رہے تھے۔ کمپنی باغ میرا اسکول تھا' میرا کالج تھا' میری یونیورسٹی تھی ہر درخت میرے لیے استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ کمپنی باغ کے یہ درخت' ان درختوں کے درمیان سکون سے بہنے والی نہر اور نہر کے کنارے ناشپاتی اور آلوچے کے باغ مجھے وہ تعلیم دے رہے تھے جو مجھے دنیا کی کوئی یونیورسٹی' کوئی کالج' کوئی اسکول' کوئی استاد نہیں دے سکتا تھا۔ یہ میرے وہ استاد تھے' وہ پروفیسر تھے جن سے لیکچر سنائی نہیں دیتے تھے' جن کی کتابیں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن ہر کتاب کا مفہوم ہر درخت کی شاخ پر' ہر شاخ کے پھول پھول پر روشن نظر آتا تھا۔ یہ سنا سنایا علم نہیں تھا۔ یہ وہ علم تھا جو سامنے نظر آتا تھا۔ علم کی باتیں سننا کچھ اور ہوتا ہے' علم کو اپنے سامنے دیکھنا کچھ اور بات ہے۔ کمپنی باغ میری یونیورسٹی تھی اور میں اس اوپن یونیورسٹی کے باغ میں بیٹھا ایک ایک پتے سے' ایک ایک پھول سے' پھولوں پر چمکتے شبنم کے موتیوں سے علم حاصل کر رہا تھا۔ جس طالب علم کو ایسی یونیورسٹی مل جائے اسے کسی دوسرے اسکول میں داخل ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

لیکن گھر والوں نے پکڑ کر مجھے ایک بار پھر اسکول میں داخل کرا دیا۔ میرا ایک سال پھر ضائع ہو گیا تھا۔ اس دفعہ مجھے امرتسر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں نویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ یہ اسکول ہمارے محلے میں ہی تھا اور ماسٹر عبدالقیوم صاحب اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ دراز قد' بھرا بھرا جسم' گورا چٹا رنگ' سیاہ داڑھی ان کے چہرے پر بڑی بجتی تھی۔ شلوار قمیص اور اچکن کے ساتھ سر پر نسواری جناح کیپ پہنتے تھے۔ چہرے پر ہر وقت ایک معصوم سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ بڑی دلکش اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا خوب صورت چہرہ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے' وہ مجھے بڑے اچھے لگتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے ان کا نام بھی یاد رہ گیا ہے۔ وہ کلاس میں داخل ہوتے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی اور لڑکے مؤدب ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ بھی لڑکوں سے بڑی شفقت کا سلوک کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی بید وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کبھی انہیں کسی لڑکے کو سزا دیتے نہیں دیکھا تھا۔ سوچتا ہوں۔ یہ لوگ' یہ چہرے کہاں چلے گئے' کہاں غائب ہو گئے۔ کیا وہ پھر کبھی نظر آئیں گے؟ کیا اس حیات ارضی سے آگے' خیابانِ عقبیٰ میں' خیال و خواب کا کوئی بہار آفریں چمن ایسا ہے کہ جہاں ہم ان مسکراتے ہوئے نورانی چہروں کو پھر سے دیکھ سکیں گے؟

کچھ سمجھ میں آتا ہے بہت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

گھر میں اگر میرا کوئی ہمدم و ہم خیال تھا تو وہ میرا چھوٹا بھائی مقصود تھا۔ جس کا میں آرٹسٹ بھائی کے نام سے اکثر ذکر کیا کرتا ہوں مگر وہ خود والد صاحب کے زیر عتاب رہتا تھا کیونکہ اسے مصوری کا شوق تھا اور بقول والد صاحب کے وہ کوئی مفید ہنر سیکھنے یا کوئی نوکری کرنے کی بجائے رنگ روغن سے بے کار قسم کی تصویریں اور سینریاں بناتا رہتا تھا مگر وہ اکھڑ اور غصیلے مزاج کا تھا اور گالیاں بہت دیتا تھا گھر میں سوائے میرے وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ ڈرائنگ بورڈ پہ بڑا سا گتہ یا ڈرائنگ کاغذ لگا کر وہ پنسل سے کوئی اسکیچ یا واٹر کلر میں کوئی سینری بناتا رہتا تھا۔ میری طرح اور خاندان کے دوسرے کشمیری لڑکوں کی طرح آرٹسٹ بھائی کو کھانے پینے اور عمدہ کپڑے پہننے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ گھر میں جس وقت جو کچھ ملتا کھا لیتا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ میں یاد کرتا ہوں تو مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے اسے گھر میں یا باہر کبھی کھانا کھاتے دیکھا ہو۔ مجھے بالکل نہیں پتا کہ وہ چمچ سے چاول کھاتا تھا یا ہاتھ سے کھاتا تھا۔ لباس میں وہ صرف سفید کرتہ اور تنگ موری کا پاجامہ پہنتا تھا۔ ہمیشہ باٹا کے سفید فلیٹ شو یعنی ربر کے بوٹ پہنتا تھا۔ ان بوٹوں کو وہ ہر تیسرے چوتھے روز سفید رنگ گھول کر لگاتا۔ صحن میں گملوں کے پاس اس کے پالش کیے ہوئے گیلے بوٹ اور تسمے دھوپ میں پڑے ہوتے تھے۔ بے حد تیز اور نازک مزاج تھا۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔ تصویر بنا رہا ہوتا تو سوائے میرے گھر کا کوئی آدمی اس کے پیچھے کھڑے ہو کر اسے تصویر بناتے دیکھتا تھا تو انہیں گالی وغیرہ تو دے نہیں سکتا تھا بس برش تھالی میں رکھ کر اٹھ کر چلا جاتا تھا گھر والوں کے علاوہ اگر کوئی اسے تصویر بناتے دیکھتا تو اسے کوئی لحاظ کیے بغیر جھڑک دیتا تھا کہ تم کیا دیکھ رہے ہو اوئے؟

آرٹسٹ بھائی کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ قیام پاکستان کے بعد جب وہ کوہ مری کے سیروز سنیما میں بطور پینٹر ملازم ہو گیا تھا تو مجھے بڑے پیار بھرے خط لکھا کرتا تھا۔ میرے افسانوں کی منظر نگاری کا وہ عاشق تھا۔ خود بھی اندر سے بڑا رومانیت پسند تھا' بے حد صفائی پسند تھا۔ کوہ مری کی برفباری میں بھی وہ ہر روز نہاتا' گھر میں دھلی ہوئی یا دھوبی کی دھلی ہوئی سفید قمیص' سفید کرتا اور بے داغ سفید ربر کے شوز پہن کر کام شروع کرتا تھا۔ اس نے ساری زندگی پتلون نہیں پہنی تھی اور دھوتی نہیں باندھی تھی۔ مجھ سے زیادہ گورا' چوڑا چکلا اور دراز قد تھا۔ ڈھولک بڑی اچھی بجا لیتا تھا۔ گانا اسے نہیں آتا تھا لیکن گھر میں کبھی کسی تقریب کے موقع پر ڈھولکی گھٹنے کے نیچے دبا کر بجاتے ہوئے گردن ایک طرف ڈالے کسی کسی وقت کوئی پنجابی لوک گیت یا سہگل کا کوئی گانا گانے لگتا تھا۔ اس کا ماتھا بڑا روشن اور فراخ تھا۔ سگریٹ ہمیشہ کیپسٹن کے پیتا تھا۔ میں لڑکپن میں بڑا اچھا گایا کرتا تھا اور آرٹسٹ بھائی میرے ساتھ بڑی اچھی اور ٹھمک دار ڈھولک بجاتا۔ میرے ساتھ وہ کسی ہنسی مذاق کی بات پر کھل کر ہنس بھی لیتا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اکھڑ مزاج ہونے کے باوجود وہ بڑا شرمیلا تھا۔ خاندان میں بھی وہ کسی لڑکی سے کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ تنہائی پسند تھا سوائے میرے' محلے میں اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی۔ ہم دونوں اکٹھے کبھی کبھی صبح کی سیر کرنے کمپنی باغ یا چالیس کنوؤں پر جایا کرتے تھے۔ سیر سے

واپسی پر ایک آدھ پھول ضرور اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور پھول والا ہاتھ جہانگیر بادشاہ کی طرح اس کے منہ کے قریب ہوتا تھا اور بڑے نپے تلے قدموں سے میرے ساتھ چل رہا ہوتا تھا۔ مصوری اس نے محض اپنے شوق کی وجہ سے سیکھی تھی اور یہ عطیہ اسے قدرت کی طرف سے ملا تھا لیکن کچھ عرصہ وہ ہال بازار میں ایک دکان پر جس کا نام سلور اسٹوڈیو تھا پینٹنگ سیکھنے پر ملازم بھی ہوگیا تھا۔ بعد میں اس نے امرتسر کے مشہور پینٹر اور خطاط سردار پینٹر کی باقاعدہ شاگردی اختیار کرلی تھی۔ سردار پینٹر نے پاکستان بن جانے کے بعد میو اسپتال کے چوک میں اپنی پینٹری کی دکان کھول لی تھی۔ مقصود یعنی آرٹسٹ بھائی وہاں بھی اس کے پاس جایا کرتا تھا۔ سردار پینٹر نے اپنی دکان کے باہر بورڈ پر لکھوا رکھا تھا۔

”بال سے باریک اور ہاتھی سے موٹا لکھنے والے امرتسر کے مشہور سردار پینٹر کی یہی دکان ہے۔“

سردار پینٹر انگریزی اور اردو کی بڑی اعلیٰ اور معیاری لیٹرنگ کرتا تھا۔ امرتسر میں وہ جس زمانے میں پرل ٹاکیز کا ہیڈ پینٹر تھا' آرٹسٹ بھائی اس زمانے میں بھی اس کا شاگرد تھا۔ آرٹسٹ بھائی کے کوہ مری سے میرے نام لکھے ہوئے خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ بڑے رومانٹک اور ادبی خطوط ہیں۔ میری طرح وہ بھی قدرت کے مناظر' جنگلوں' بارشوں' گالزوردی کے سیب کے درخت اور میکسم گورکی کی آپ بیتی کا عاشق تھا۔ اپنے خطوں میں اس نے بڑے رومانوی انداز میں جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں اور بارشوں کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہ سوائے کوئٹہ کے اور کبھی کسی شہر نہیں گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ ہماری آپس میں محبت بھی بہت تھی اور ہماری لڑائیاں بھی بہت ہوتی تھیں۔ ان لڑائیوں میں ہم ایک دوسرے کو گالی وغیرہ نہیں دیتے تھے۔ لڑتے وقت بالکل کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ بس ایک دوسرے کو پہاڑی بکروں کی طرح ٹکریں مارتے رہتے تھے اور لہولہان ہوجاتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ بمشکل ایک ڈیڑھ سال لاہور میں ہمارے ساتھ رہا۔ پھر وہ کوہ مری جاکر سیروز سینما میں بطور ہیڈ پینٹر ملازم ہوگیا اور پھر کوہ مری کا ہی ہوکر رہ گیا۔ بیس پچیس برس تک کوہ مری میں رہا۔ سردیوں میں وہ راولپنڈی والے سیروز سینما میں آجاتا اور گرمیاں شروع ہوتے ہی کوہ مری چلا جاتا۔ اس نے سوائے میرے سب سے ناتا توڑ لیا تھا۔

گھر والوں میں سے کوئی اس سے ملنے جاتا بھی تو نہیں ملتا تھا۔ موت سے ایک دو برس پہلے اس نے مجھ سے بھی رشتہ توڑ لیا تھا۔ کوہ مری اور راولپنڈی میں بھی وہ کسی سے نہیں ملتا تھا۔ سینما کے گیٹ کیپر حنیف خان کے سوائے اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔

گھر والوں کو اگر اسے کوئی خاص پیغام پہنچانا ہوتا تھا تو حنیف خان کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا۔ وہ کسی کا ٹیلی فون بھی نہیں سنتا تھا۔ حنیف خان سنتا تھا اور بتا دیتا تھا کہ ”استاد جی' کوہ نور ٹیکسٹائل کے ڈیزائن پرسوں بھجوانے ہیں۔“

ان تھک محنتی تھا۔ جمبو جہازی سائز کے سینما کے بورڈوں پر مچان پر چڑھ کر سارا سارا دن اور کبھی کبھار رات رات بھر رنگ بھرتا رہتا تھا۔ ہاتھ بڑا صاف تھا۔ اس کے بورڈ مری اور راولپنڈی میں بڑے مشہور ہوتے تھے۔ شادی اس نے نہیں کی تھی۔ کسی لڑکی سے کبھی عشق بھی نہیں کیا تھا۔ دن کے وقت کوہ مری کی مال روڈ پر کبھی نہیں نکلتا تھا۔ رات کو بارہ بجے کے بعد جب کوہ مری کی سڑکیں سنسان ہوجاتی تھیں تو لوگ بتاتے ہیں کہ مقصود

صاحب کو اکثر مال روڈ پر یا گرجا گھر والی سڑک پر سگریٹ سلگائے ٹہلتے دیکھا گیا۔

عجب مانوس اجنبی تھا

میں جب بھی بمبئی' کلکتہ' رنگون یا کولمبو کی آوارہ گردیوں سے واپس امرتسر آتا تو مجھے لے کر کمپنی باغ میں آجاتا ہم کسی گراؤنڈ میں بیٹھ جاتے اور وہ مجھ سے جنوب مشرقی انڈیا کی بارشوں' جنگلوں اور بارشوں میں بھیگتے خاموش ریلوے اسٹیشنوں اور سمندروں کی باتیں سنا کرتا مگر اس نے خود ان علاقوں کی آوارہ گردی کرنے کے شوق کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھ میں تو کئی عیب ہیں' خود غرضی بھی کرتا ہوں' جھوٹ بھی بول لیتا ہوں مگر مقصود میں ایک بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ کسی سے ڈرتا بھی نہیں تھا۔ بات منہ پر کہہ دیتا تھا۔ اپنے کام کا ماہر تھا۔ بے حد قناعت پسند تھا۔ روپے پیسے سے اسے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ جو کوئی ضرورت مند آکر جتنے پیسے مانگتا اس کو جیب سے نکال کر دے دیتا تھا۔ بٹوہ اس نے کبھی نہیں رکھا تھا۔ نوٹ کاغذوں کی طرح اس کی جیب میں ٹھونسے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک نوٹ باہر نکالتا تو دو نیچے گر پڑتے تھے۔ تین وقت کا کھانا ہوٹل میں کھاتا تھا' جو تھوڑا بہت لین دین کا حساب ہوتا تھا وہ تنخواہ ملنے پر اس کا شاگرد حنیف خان خود ہی کرتا تھا۔ مقصود اسے چھ سات سو روپے دے دیتا تھا اور وہ ہوٹل اور سگریٹ والے کا حساب چکا کر باقی پیسے آرٹسٹ بھائی کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔ اپنی ساری زندگی اس نے سفید پاجامے کرتے اور سفید باٹا کے بوٹ میں گزار دی۔ سردیوں میں ایک گرم کوٹ پہن لیا کرتا تھا۔ کوہ مری کی سردیوں میں بھی کبھی کوئی کمبل یا دھسہ وغیرہ نہیں لیتا تھا۔ ساری زندگی اس نے سر پر ٹوپی پہنی نہ گلوبند وغیرہ لپیٹا۔ برفباری میں بھی اس کا سر بغیر کسی گرم ٹوپی وغیرہ کے ہوتا تھا۔ یہ بھائی میرا پہلا اور شاید آخری دوست تھا۔ اس کا ذکر شروع ہوجائے تو جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر کرتا رہوں۔ آپ اگر بور ہوگئے ہوں تو مجھے معاف کردیجیے گا۔

گورنمنٹ ہائی اسکول میں نویں جماعت پاس کی اور دسویں جماعت میں پہنچ گیا۔ بڑی مشکل سے دسویں جماعت میں دو تین مہینے پڑھا تھا کہ پاؤں کے چکر نے پھر ہلنا شروع کردیا۔ اس دفعہ بنگال کے ترناری اور رجنی گندھا کے سفید پھولوں اور دھرم تلہ اور لوئر چیت پور روڈ کی پان سگریٹ کی دکانوں سے طلوع ہوتی زردے اور قوام کی خوشبوؤں اور وکٹوریہ میموریل کی جھیل میں کھلے ہوئے بارش میں بھیگتے کنول کے پھولوں اور اداس آنکھوں والی دیوداسیوں نے ایک بار پھر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میں نے ایک روز بڑی بہن سے کچھ پیسے لیے اور ہاوڑہ میل میں بیٹھ کر کلکتے کی طرف روانہ ہوگیا۔

کلکتے کے ریل کے سفر کا اپنا ایک کلچر تھا' اس کی اپنی خوشبوئیں تھیں۔ یہ کلچر اور خوشبوئیں پنجاب سے نکلتے ہی اور سہارن پور کے آتے ہی شروع ہوجاتی تھیں۔ سہارن پور کے گنے بڑے مشہور تھے۔ بہت بڑا شہر تھا' ٹرین اسٹیشن بھی بہت بڑا تھا۔ کئی پلیٹ فارم تھے۔ سہارن پور کے بعض علماء ہر سال امرتسر میں ہمارے محلے کی مسجد جان محمد میں معراج شریف کے مبارک موقع پر وعظ کرنے آیا کرتے تھے۔ ان کا وعظ سننے کے لیے شہر کے کونے کونے سے لوگ مسجد میں آیا کرتے اور مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ سہارن پور کے بعد مرادآباد کا شہر آتا ہے جہاں کے پیتل کے برتن اور شاعر جگر مرادآبادی بہت مشہور تھے۔ اس کے بعد اہم شہر بریلی آتا ہے۔ بریلی کے

بعد شاہجہاں پور اور پھر ہندوستان میں اسلامی تہذیب وثقافت کا علمبردار لکھنؤ شہر آتا ہے۔ لکھنؤ کا اسٹیشن بہت ہی خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔ لکھنؤ کے بعد بنارس کا شہر آتا ہے۔ یہاں دریائے گنگا کے کنارے عالمگیری مسجد کے مینار دور سے نظر آجاتے تھے۔ اس کے بعد ٹرین صوبہ بہار میں داخل ہوجاتی تھی اور بہار کا مشہور تاریخی شہر گیاہ آتا ہے جہاں ایک درخت کے نیچے ایک روایت کے مطابق مہاتما گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہ ایک چھوٹا اسٹیشن تھا اور اس کے صرف دو پلیٹ فارم تھے' ایک ٹرین کی ایک طرف دوسرا دوسری طرف۔ اس کے بعد آسنسول کے اسٹیشن سے بنگال شروع ہوجاتا تھا۔ اس طویل سفر کے دوران زبان بدل جاتی تھی' لباس اور کلچر تبدیل ہوجاتا تھا۔

اس بار میں کسی فلم کمپنی کی ایکٹریس یا ایکٹر سے ملنے نہیں جارہا تھا۔ صرف بنگال کی بارشیں' شام کے وقت دریائے ہگلی کی طرف سے آتی ٹھنڈی ہوا اور موتیے کے سفید گجرے اور اداس آنکھوں والی دیوداسیوں کا طلسم مجھے کھینچ کر لیے جارہا تھا۔

O......O......O

شاید یہ بنگال کا جادو تھا جو مجھے بار بار کھینچ کر کلکتے کی طرف لے جاتا تھا۔ میں جادو ٹونے پر یقین نہیں رکھتا اور یہ میرے ایمان کے خلاف بھی ہے لیکن میں نے جوگیوں اور سادھوؤں کو حیرت انگیز شعبدہ بازیاں کرتے ضرور دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ دو ایک ایسی بدروحوں کو بھی دیکھا تھا جو اپنے گناہوں کی پاداش میں مادی دنیا میں ہی بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ ان میں ایسی بدروحیں بھی تھیں جن پر ان کی مادی فطرت ابھی تک غالب تھی اور جو انسانوں کو تنگ کرتی تھیں اور ایسی بدروحیں بھی تھیں جو انسانوں کی مدد کرتی تھیں اور یوں دنیا میں کیے گئے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کررہی تھیں ان میں سے ایک ترشنا کی بدروح بھی تھی جو مجھے اپنے مرے ہوئے دادا کے ساتھ گنج باسودہ جاتے ہوئے ٹرین میں ملی تھی۔ اس نے دو ایک بار مشکل وقت میں میری مدد کی تھی۔ ترشنا کی بدروح انسانی شکل میں میرے سامنے آتی تھی۔ وہ خوب صورت' سنجیدہ اور خاموش چہرے والی ہندو لڑکی کی بدروح تھی۔ شروع میں جب مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ بھٹکی ہوئی بدروح ہے تو مجھے اس سے محبت بھی ہوگئی تھی لیکن جب اس کی اصلیت ظاہر ہوئی تو محبت کی بجائے مجھے اس سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس نے آخری بار مجھ سے جدا ہوتے وقت کہا تھا۔

''اگر تمہیں کبھی میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو تمہارے شہر امرتسر میں ستیلا مندر ہے۔ اس کے پیچھے ایک شمشان گھاٹ ہے جہاں ہندو اپنے مردے جلاتے ہیں۔ تم رات کے وقت جب ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہو گھاٹ کے چبوترے پر جاکر بیٹھ جانا۔ میرا تصور کرکے مجھے تین بار آہستہ سے آواز دینا' میں تمہارے پاس آجاؤں گی۔''

لیکن جب میں امرتسر میں تھا تو خواہش کے باوجود میں نے کبھی شمشان گھاٹ کا رخ نہیں کیا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔

جیسا کہ پہلے آپ کو بتاچکا ہوں۔ اس بار میں کلکتے کی فلم ایکٹریس یا فلم ایکٹر سے ملنے نہیں جارہا تھا بلکہ بنگال کی موسلا دھار بارشیں' وہاں کے جنگل' باغ اور موتیے کے گجروں اور اداس آنکھوں والی دیوداسیوں کی کشش مجھے لے جارہی تھی۔ آپ اسی کشش کو بنگال کا جادو بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں انڈیا کے تمام صوبوں میں پھرا ہوں۔ ہر صوبے کے لوگوں

کو قریب سے دیکھا ہے۔ عجیب بات ہے کہ صوبہ بنگال کے مرد شروع ہی سے انقلابی اور دہشت گرد مشہور ہیں جبکہ ان کی عورتیں عام طور پر کم گو' خدمت گزار' فرمانبردار اور ہر قسم کی مصیبت اور زیادتی کو برداشت کرنے والی ہوتی ہیں۔ ان کی چال میں بھی بھارت کے دوسرے صوبوں خاص طور پر تامل ناڈو کی عورتوں کی طرح تیزی اور طراری نہیں ہوتی۔ بنگال کی عورتیں بڑی اچھی بہنیں' بڑی اچھی بیویاں اور بڑی اچھی مائیں مشہور ہیں۔ اسی لیے وہاں ساس بہو کے جھگڑے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ دردمندی' ایثار اور اندر ہی اندر غم کھاتے رہنے کا جذبہ ان کے میوزک میں بھی ہے۔ ان کی موسیقی کی بنیاد ہی درد بھرے سروں پر ہے۔ یہاں تک کہ ان کے خوشیوں کے گیتوں میں بھی درد وسوز کی ایک لہر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بنگال کے مزاج کی یہی آب وہوا تھی جس نے لڑکپن ہی میں مجھ پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور میں بار بار کلکتے کی طرف دوڑتا تھا۔

اس بار بھی میں کلکتے پہنچ کر سیدھا اپنے امرتسری دوست جان محمد کے فلیٹ پر آگیا۔ وہ کلکتے میں ہی تھا' یہ میں نے امرتسر میں معلوم کرلیا تھا۔ مجھے دیکھ کر جان نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہ کیا۔ وہ میری آوارہ گردیوں سے بخوبی آشنا تھا کہنے لگا۔

''تم بڑے صحیح وقت پر آئے ہو۔ میٹرو سینما میں اسی ہفتے نیو تھیٹرز کی فلم ''مکتی'' لگی ہے۔ آج اس کا چھ بجے والا شو دیکھیں گے۔''

''مکتی'' فلم ابھی امرتسر میں نہیں لگی تھی مگر اس کے گانے میں نے سنے تھے۔ مسلم امرتسر کے زمانے میں ہمارے محلے کے ہال بازار میں گراموفون ریکارڈوں کی ایک دکان ہوا کرتی تھی۔ لمبی دکان تھی۔ دکان میں ٹھنڈا ٹھنڈا اندھیرا سا رہتا تھا۔ میں ایم اے

اوہائی اسکول جاتے ہوئے اس دکان کے قریب سے گزرتا تو اندر گراموفون پر کوئی نہ کوئی ریکارڈ لگا ہوتا۔ کبھی سہگل کی، کبھی کملا جھریا کی، کبھی کالو قوال، کبھی بھائی چھیلا پٹیالے والا اور کبھی کانن دیوی، اوما دیوی اور پنکج ملک کے گانے کی آواز آتی۔ اگر کوئی میری پسند کا گانا ہوتا تو میں دکان کے باہر رک جاتا اور سارا گانا سن کر اسکول جاتا۔ جس زمانے میں، میں تیسری یا چوتھی مرتبہ کلکتے بھاگ کر گیا، اس دکان میں مکتی فلم کے ریکارڈ اکثر بجا کرتے تھے۔ اس فلم کا ایک گانا مجھے بہت پسند تھا۔ یہ گانا پنکج ملک نے گایا تھا اور بڑا ہو کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ گانا آرزو لکھنوی صاحب نے لکھا تھا۔ اس گانے کا مکھڑا تھا۔

کون دیس ہے جانا بابو
کون دیس ہے جانا
کھڑے کھڑے کیا سوچ رہا ہے
ہوا کہاں سے آتا بابو
کون دیس ہے جانا

بعد میں جب میری ایڈونچرس آوارہ گردیوں کا زمانہ شروع ہوا تو ایک بار میں بمبئی کے بال کیٹر گارڈن میں اپنے دوست ظہور الحسن ڈار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمارے ساتھ ہی اسی زمانے کا ایک مشہور فلمی شاعر بھی بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ بالوں کو اس طرح سر ہلا کر جھٹک دیتا تھا جیسے اس کے بالوں میں چیونٹیاں چڑھ گئی ہوں۔ اس فلمی شاعر نے بتایا کہ آرزو لکھنوی صاحب کلکتہ چھوڑ کر بمبئی آ گئے ہیں اور آج کل سہراب مودی صاحب کی فلم "پتھروں کا سوداگر" کے گانے لکھ رہے ہیں۔ عمر میں میں ان دونوں سے چھوٹا تھا۔ آرزو صاحب کا نام سن کر میں ان سے ملنے کو بے تاب ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"ابھی ان سے چل کر ملتے ہیں۔"

چنانچہ ہم اسی وقت آرزو لکھنوی صاحب سے ملنے چل پڑے تھے اور ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ کافی بوڑھے ہو رہے تھے۔ بمبئی کے گنجان محلے کے ایک درمیانے درجے کے فلیٹ میں فرش پر تیلیوں کی چٹائی بچھائے بیٹھے تھے۔ اردگرد بید کی آرام کرسیاں بھی لگی تھیں۔ آرزو صاحب ایک پیالی چمچ سے دلیا کھا رہے تھے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے آرزو صاحب سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔ سچویشن پر گیت لکھنے کی بات چلی تو انہوں نے ایک خاص سچویشن کا ذکر کرتے ہوئے "ڈاکٹر" فلم کے لیے لکھا ہوا اپنا ایک گیت بھی سنایا۔ جو فلم کی ہیروئن اپنے کم سن بھائی کے ساتھ مل کر ایک باغ میں گاتی ہے۔

تتلی، یہ تتلی یہ رنگیلی تتلی

آرزو صاحب نے اسی گیت میں تتلی کو اڑتے ہوئے پھول سے تشبیہ دی تھی جو مجھے اس زمانے میں بھی بے حد اچھی لگی تھی۔

جب آرزو صاحب کلکتے میں تھے تو میں کوشش کے باوجود ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا تھا اور اس دفعہ تو میں کلکتے صرف اس کی بارشوں اور موتیے کے گجروں والی دیوداسیوں سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے آیا تھا۔ اب میں واپس وہاں آتا ہوں جہاں سے میں نے یہ بات شروع کی تھی۔ جان محمد کی زبانی جب مجھے معلوم ہوا کہ "مکتی" فلم میٹرو یا شاید پیراڈائز سینما میں چل رہی ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے جان سے کہا۔

"بس یہ ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی چھ بجے والا شو دیکھیں گے۔"

"مکتی" فلم ڈائریکٹر پی سی بروا نے بنائی تھی۔ اس

میں جمنا ہیروئن تھی اور پنکج ملک کے علاوہ پی سی بروا یعنی فلم کے ڈائریکٹر نے بھی بطور ہیرو کام کیا تھا۔ چھوٹے قد کا دبلا پتلا فلسفی ٹائپ کا آدمی تھا۔ آنکھوں میں ہر وقت کسی نظر نہ آنے والے کو دیکھنے کی تلاش کا تجسس رہتا تھا۔ پوری کہانی مجھے یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ فلم کا ہیرو اپنی محبت میں ناکام ہونے کے بعد شہر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل جاتا ہے، وہاں ایک ہاتھی سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ عجیب خواب کے ماحول ایسی فلم تھی۔ ویسے تو بچپن کا گزرا ہوا سارا زمانہ ہی خواب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ فلم ایسی تھی جیسے میں نے خواب کے اندر کوئی خواب دیکھا ہو۔ ہم دونوں دوست خوب تیار ہو کر فلم دیکھنے چل دیے۔ سینما ہاؤس کے باہر کافی رش تھا۔ ٹکٹوں کی بلیک بھی ہو رہی تھی۔ سینما ہاؤس کا ایک گیٹ کیپر جان محمد کا واقف تھا۔ اس نے ہمیں سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لا کر دے دیے اور ہم سینما ہاؤس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہال کی بتیاں روشن تھیں۔ ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں اور سگریٹ بیچنے والے کرسیوں کی قطاروں کے درمیان پھنس کر چلتے ہوئے سودا بیچ رہے تھے۔ ہال میں ائرکنڈیشنڈ کی ٹھنڈی خوشبو کے ساتھ ساتھ سگریٹ، بیڑی اور پان کے قواموں کی مختلف خوشبوئیں اس زمانے کے سینما ہالوں کا لازمی جزو تھے۔ جس طرح ہسپتالوں میں ڈیٹول اور مختلف دوائیوں کی خوشبوئیں پھیلی رہتی ہیں اور یہی خوشبوئیں ہسپتال کی پہچان ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس زمانے کے سینما ہالوں میں پان، سگریٹ کی خوشبوئیں پھیلی ہوتی تھیں اور یہی سینما ہالوں کی پہچان ہوتی تھیں۔ یہی سینما ہالوں کی اصل روح ہوتی تھی۔ جب سے سینما ہالوں میں سگریٹ پینا منع کر دیا گیا ہے۔ سینما گھروں کی اصل روح غائب ہو گئی ہے۔ عصر حاضر نے انسان کے ساتھ یہی کیا ہے کہ اس کی روح غائب کر دی ہے۔ یہاں مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ میں یہ شعر آپ کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

رات کے نو بج رہے تھے جب ہم فلم دیکھ کر واپس آئے۔ سراج بلڈنگ کے نیچے ایک ہوٹل تھا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ جان پوچھنے لگا۔

"اس دفعہ تم کس مار پر کلکتے آئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "صرف بنگال کی سیر کرنے۔"

جان ہنس پڑا کہنے لگا۔

"یار لگتا ہے تم پر بھی بنگال کے جادو کا اثر ہو گیا ہے۔"

جان رات کو تخت پوش پر سوتا تھا۔ تخت پوش کے قریب ہی ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا ایک صوفہ پڑا تھا میں اس پر سوتا تھا۔ سونے سے پہلے جان نے تخت پوش کا طبلہ بجاتے ہوئے مجھے مکتی فلم کا گانا کون دیس ہے جانا بابو سنایا۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔ مجھے بچپن ہی سے صبح صبح اٹھنے کی عادت تھی، میں بلا ناغہ کمپنی باغ اور کبھی چالیس کھوہ سیر کرنے جاتا تھا۔ میں صبح صبح اٹھ کر نیچے لوئر چیت پور روڈ پر آ گیا۔ ابھی ٹرامیں چلنی شروع نہیں ہوئی تھیں، سڑک خالی پڑی تھی۔ سیر کرتے کرتے میں زکریا اسٹریٹ سے بھی آگے نکل آیا۔ یہ بنگالی ہندوؤں کا محلہ تھا۔ رہائشی فلیٹوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی اور کسی کسی فلیٹ میں سے کسی مرد یا عورت کے ہارمونیم پر بنگلہ بھجن گانے کی آواز آ رہی تھی۔

میں مون لائٹ سینما کے عقب سے ہوتے ہوئے ایک بازار میں آ گیا جہاں تھوڑے تھوڑے

فاصلے پر لکشمی دیوی کے دو مندر تھے۔ ان مندروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ جھنڈیاں لگی تھیں۔ مندروں کے دروازے پر گیندے اور موتیے کے پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ عورتیں مرد لکشمی دیوی کی پوجا کے لیے مندروں کی طرف جا رہی تھیں۔ میں ڈلہوزی اسکوائر کا چکر لگا کر سراج بلڈنگ میں واپس آ گیا۔ جان سلولائڈ کی شیٹوں کو ترتیب سے ایک طرف لگا رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر بولا۔

''چلو ناشتہ کر آتے ہیں۔''

ہم نیچے ہوٹل میں آ کر ناشتہ کرنے لگے۔ جان نے بتایا کہ کلکتے میں یہ لکشمی پوجا کے دن ہیں اور اسی تہوار پر لکشمی دیوی کے مندروں میں چار دن تک بڑی رونق رہتی ہے۔ ہندو دیو مالا میں لکشمی دیوی دولت کی دیوی ہے۔ ہندو لوگ دولت کے حصول کے لیے لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ جان کہنے لگا۔

''کولوٹولا اسٹریٹ میں لکشمی دیوی کا بڑا مندر ہے۔''

''اسی مندر میں کسی زمانے میں اچھوت لڑکیوں کو لکشمی دیوی کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ بعض کٹر توہم پرست ہندو سیٹھ کاروبار میں لاکھوں کے منافع کی خاطر منت مانتے تھے کہ اگر مجھے کاروبار میں منافع ہوا تو میں ایک اچھوت کنیا کو دیوی جی کی بھینٹ چڑھاؤں گا۔ کئی لوگ کسی یتیم اور لاوارث اچھوت لڑکی کو اپنے جال میں پھنسا کر مندر لے آتے تھے اور بڑے پجاری کی مدد سے اسے لکشمی دیوی پر قربان کرنے کے بعد دیوی کی مورتی کے آگے ہاتھ باندھ کر پکارتے کہ اے دیوی! میں نے تیری خوشی کی خاطر ایک اچھوت لڑکی تمہارے بھینٹ چڑھا دی ہے اب مجھے دولت سے مالا مال کر دے۔ بعد میں انگریزوں نے اس رسم کو سختی سے کچل دیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اب بھی چوری چھپے کبھی کبھی دیوی کی خوشنودی کی خاطر یا دولت حاصل کرنے کے لیے کسی بے سہارا اچھوت لڑکی کو دیوی کے بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بڑا ظلم ہے کیا اچھوت اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتے؟''

جان بولا۔ ''کرتے ہیں لیکن معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور پھر بھینٹ چڑھانے والے پیچھے ذرا بھی ثبوت نہیں چھوڑتے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ لڑکی گم ہو گئی ہے یا اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اچھوتوں کو کون پوچھتا ہے۔ ایک دو اخباروں میں خبر چھپتی ہے اور پھر لوگ بھول جاتے ہیں۔''

میں نے جان سے پوچھا۔

''کیا تم نے کبھی کسی لڑکی کو دیوی کے بھینٹ چڑھتے دیکھا ہے؟''

جان نے کہا۔ ''کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ کولوٹولا والے اس مہا لکشمی کے مندر میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اور جس رات کسی لڑکی کو قربان کیا جاتا ہے اس رات تو کسی غیر مسلم کو بھی دیوی کے پوجا پاٹھ والے کمرے کی جانب جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ مندر کے پجاری سے مل کر کیا جاتا ہے۔'' میں نے جان سے کہا۔

''جان! میں یہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ تمہاری مندروں سے بڑی کاروباری دوستی ہے۔ تم ایک مدت سے یہاں رہ رہے ہو۔ اس کا کھوج لگاؤ کہ کب کوئی لڑکی دیوی کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔''

جان کہنے لگا۔ ''ارے برسوں بعد کبھی ایسا ہوتا ہے۔ میرا ایک ہندو دوست ہے وہ اپنے محلے کے مندر کے پجاری کا بیٹا ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ یہ لکشمی پوجا کے تہوار کے دن ہیں ہو سکتا ہے

کہیں کسی اچھوت لڑکی کو دیوی کے بھینٹ چڑھایا جا رہا ہو۔ اس قسم کی وارداتیں اس تہوار کے موقع پر ہی ہوتی ہیں۔ میں آج ہی پجاری کے بیٹے سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے محض اپنے تجسس کی تسکین کی خاطر جان سے کہہ دیا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کی وارداتیں انتہائی خفیہ طریقے سے ہوتی ہیں اور جہاں ہوتی ہیں وہاں کسی باہر کے آدمی کا جانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جان رات کو اپنے ہندو دوست سے ملنے چلا گیا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔ ''کمال ہے یار! تم نے ایسے موقع پر بات کی ہے کہ اس تہوار پر واقعی ایک لڑکی کی قربانی دی جا رہی ہے۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔

''کہاں؟ کب؟ کیا یہ قربانی بڑے مندر میں دی جا رہی ہے؟''

جان بولا۔ ''بتاتا ہوں بتاتا ہوں۔ ذرا مجھے ایک بیڑی تو سلگا لینے دو۔''

جان نے جیب سے پان بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور بولا۔ ''یہ جو میرا بنگالی لڑکا دوست ہے اس کا نام ست پال ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا یہ اپنے محلے کے لکشمی مندر کے پجاری کا بیٹا ہے اور باپ کے ساتھ مندر میں ہی پوجا پاٹھ کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ جب میں نے اس سے بات کی تو وہ حیران سا ہو کر میرا منہ دیکھنے لگا۔ بولا۔ تمہیں یہ خیال کیسے آ گیا؟ میں نے اسے تمہارا بتایا کہ میرا دوست امرتسر سے آیا ہے اس کو قربانی کی رسم دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ ست پال بولا۔ ''عجیب بات ہے کہ تم نے ایسے وقت میں بھینٹ پوجا کا پوچھا ہے۔ جب واقعی ایک لڑکی کو

لکشمی ماتا کی بھینٹ چڑھانے کے لیے جنگل میں پہنچادیا گیا ہے۔“

میں نے جان سے پوچھا۔”اسے جنگل میں کس لیے پہنچایا گیا ہے؟“ تب جان نے بتایا کہ چونکہ اس قسم کی قربانی دینا ملک کے قانون کے خلاف ہے اور انگریز نے اس کی سزا پھانسی رکھی ہے اس لیے جب بھی کوئی دولت مند سیٹھ بھاری رشوت دے کر لکشمی مندر کے کسی پجاری کو اس کام پر راضی کرلیتا ہے تو یہ مذموم رسم بڑے خفیہ طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ جان نے کہا۔

”ست پال نے بتایا ہے کہ اس بار یہ قربانی یہاں سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ایک جنگل میں واقع لکشمی دیوی کے ایک گمنام سے مندر میں دی جائے گی سیٹھ کے آدمیوں نے ایک اچھوت لڑکی کو اغوا کرکے جنگل والے مندر میں پجاری کے پاس پہنچادیا ہے جس نے اسے مندر کے قریب ہی ایک ٹیلے کے غار میں چھپادیا ہے۔ چار دن تک وہاں اس لڑکی کی کڑی نگرانی میں آؤ بھگت ہوگی۔ اسے اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے کھلائے جائیں گے۔ صبح شام اسے اشنان کرایا جائے گا اور پانچویں روز آدھی رات کو اسے لکشمی دیوی کے اس استھان کے آگے زبردستی لٹا کر ذبح کردیا جائے گا۔“

میں نے کہا۔”کیا تم مجھے اس جنگل والے مندر تک پہنچا سکتے ہو؟“

جان نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا جو موت کے منہ میں جانے کی تیاری کررہے ہو۔ ست پال نے مجھے کہا ہے کہ اپنے دوست کو ہرگز ہرگز وہاں مت جانے دینا۔ اگر مندر کے آدمیوں میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا تو وہ کسی صورت میں بھی تمہارے دوست کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بھلا وہ لوگ یہ کیسے برداشت کرسکتے ہیں کہ قتل کی اس واردات کا کوئی عینی گواہ بنے۔ اس خیال کو دل سے نکال دو۔“

مگر میں اپنے دل میں فیصلہ کرچکا تھا کہ انسانی قربانی کا یہ خوفناک منظر اگر دیکھ سکا تو ضرور دیکھ کر رہوں گا۔ میں نے جان کو صاف صاف بتادیا کہ میں جنگل والے مندر میں کسی جگہ چھپ کر انسانی قربانی کا یہ منظر ضرور دیکھوں گا چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوجائے۔

”تم بے شک میرے ساتھ نہ جانا‘ مجھے یہ بتادو کہ یہ جنگل کہاں پر ہے اور لکشمی کا مندر اس جنگل میں کس جگہ پر واقع ہے۔“

جان کو یہ سب کچھ مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا لیکن اس نے بے وقوفی سے کام لیتے ہوئے مجھے بتادیا۔ کہنے لگا۔

”کلکتے سے ہزاری باغ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کندر گام کا ریلوے اسٹیشن آتا ہے۔ یہ کلکتے سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ کندر گام اتر کر تمہیں شمال کی طرف جانا ہوگا آگے ایک بڑی ندی آجائے گی۔ اسی ندی کے پار ایک گھنا جنگل شروع ہوتا ہے جو سندر بن کی ایک شاخ ہے۔ اسی جنگل میں رام ناتھ نام کا ایک تالاب ہے۔

یہ تالاب رام لچھمن کے زمانے کا بتایا جاتا ہے۔ جس لکشمی مندر میں اچھوت لڑکی کو قربان کیا جارہا ہے وہ اس تالاب کے ساتھ ہی ہے۔ مگر بہت چوکس اور ہوشیار ہوکر وہاں جانا ہوگا۔ تم سے ذرا سی بھی بھول چوک ہوئی تو زندہ واپس نہ آسکو گے۔ میں تو تمہیں اب بھی یہی کہوں گا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو۔“

میں نے جواب دیا۔”میں پوری احتیاط سے کام لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ تم نے کہا تھا کہ قربان کی جانے

والی اچھوت لڑکی کو اغوا کرکے وہاں پہنچادیا گیا ہے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ لڑکی وہاں کس جگہ پر چھپا کر رکھی گئی ہوگی؟“

جان بولا۔”یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس کا کھوج تمہیں وہاں پہنچ کر خود ہی لگانا ہوگا۔“

میں چپ ہوگیا۔ جان نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

”امرتسریوں والی اندھا دھند دلیری کا کام نہ کرو۔ کہیں مارے نہ جاؤ۔“

میں نے کہا۔”میں تو اسے ایک ایڈونچر سمجھ کر کررہا ہوں باقی اللہ مالک ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ ہزاری باغ جانے والی ٹرین کلکتے سے کس وقت روانہ ہوتی ہے۔“

جان بولا۔”ہزاری باغ کا شہر بنارس جبل پور روٹ پر ہے۔ اس طرف گاڑیاں جاتی ہی رہتی ہیں۔ ویسے ایک گاڑی صبح چھ بج کر پندرہ منٹ پر جاتی ہے۔ یہ گاڑی تمہارے لیے ٹھیک رہے گی تم دن کے وقت ہی کندر گام پہنچ جاؤ گے۔“

گھر سے میں تھوڑے بہت پیسے لے کر اپنی آوارہ گردیوں کے ایڈونچر پر نکلتا تھا کبھی میں یہ پیسے والد صاحب کی صدری کی جیب سے اڑالیا کرتا تھا اور کبھی اپنی بڑی بہنوں کے آگے مختلف بہانے بنا کر حاصل کرلیتا تھا۔ اس بار بھی میرے پاس پچاس پچپن کے قریب روپے تھے۔ اس زمانے میں یہ رقم کافی ہوتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ صرف بارہ تیرہ روپے تو امرتسر سے کلکتے کا کرایہ ہی تھا۔ میں نے یہ پیسے جان کے پاس رکھوادیے تھے۔ عجیب بات ہے میں نے کلکتے کی طرف کبھی بغیر ٹکٹ کے ریل میں سفر نہیں کیا تھا۔ میں نے جان سے پندرہ بیس روپے لے کر رکھ لیے اور دوسرے دن صبح صبح رکشے پر بیٹھ کر کلکتے کے ہاوڑہ اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

یہ قیام پاکستان سے چھ سات سال پہلے کا زمانہ تھا۔ برصغیر کی آبادی ابھی اتنی نہیں بڑھی تھی۔ ریلوے اسٹیشنوں پر ٹرین کے آنے جانے کے وقت مسافروں کا رش ضرور ہوتا تھا مگر آج کے زمانے والا حال نہیں تھا۔ بڑا نارمل سا رش ہوتا تھا۔ ٹرین کے جانے کے بعد پلیٹ فارم خالی خالی سے ہوجاتے تھے۔ انگریزی حکومت کے قاعدے اصول بڑے سخت تھے۔

ٹرینیں عام طور پر وقت پر چلتی تھیں۔ جس ٹرین میں بیٹھ کر مجھے کندر گام جانا تھا وہ بھی ٹھیک ٹائم پر روانہ ہوئی۔ کوئلے کے انجن والی گاڑیاں چلتی تھیں۔ انجنوں میں سے خوب دھواں اور بھاپ نکلتی تھی۔ کلکتے سے پشاور تک چلنے والی ہاوڑہ ایکسپریس کی رفتار تو بڑی تیز ہوتی تھی۔ جہاں سے شور مچاتی دھواں اڑاتی گزرتی تھی وہاں کی زمین ہل جاتی تھی۔ جس ٹرین پر میں سوار ہوا تھا وہ ہاوڑہ ایکسپریس نہیں تھی اور صرف دلی تک جارہی تھی۔

میرا سفر ڈیڑھ سو میل کا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ مون سون کا سیزن گزر چکا تھا۔ پھر بھی ہفتہ دس دن میں ایک بار موسلادھار بارشیں ہوجاتی تھیں۔ جن اصحاب نے بنگال کا سفر کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ بنگال کا سارا علاقہ ندی نالوں‘ تالابوں اور چھوٹے بڑے جنگلات سے بھرا پڑا ہے۔

مغربی بنگال کا سندر بن تو شیروں‘ ہاتھیوں اور دوسرے درندوں اور دشوار گزار جنگلوں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ان علاقوں میں تقریباً سارا سال بارشیں ہوتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے بڑے بڑے جنگل بن گئے ہیں۔ سبزے کو جب اور کہیں جگہ نہیں ملتی تو مکانوں کی دیوار پر چڑھ جاتا ہے۔

کلکتے میں برسات کے موسم میں بہت حبس ہو جاتا ہے لیکن شام کو دریائے ہگلی کی طرف سے خوشگوار ہوا ضرور چلتی ہے۔

دیہات میں ڈھلوان چھتوں والے جھونپڑا نما بوسیدہ مکان ہوتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے دیہات کی دونوں جانب تالاب ضرور ہوتا تھا جس میں مچھلیاں پالی جاتی تھیں۔ یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا تھا کہ ٹرین ریلوے ٹریک پر سے گزر رہی ہے اور نیچے کھیتوں میں کالے کالے ننگے بنگالی لڑکے ٹرین کے متوازی بھاگتے جا رہے ہیں۔ جنگلوں میں تو دیار، سال اور مہاگنی کے دیو قامت درختوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ دیہات میں جگہ جگہ ناریل، املی اور نیم کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں تاڑ کے درخت اپنی چھتریوں کے ساتھ سب سے الگ کھڑے ہوتے ہیں۔

تاڑ کے درختوں کے جھنڈ نہیں ہوتے۔ یہ ستون کی طرح بالکل سیدھے اور اونچے ہوتے ہیں۔ ان کے تنے پر کوئی شاخ نہیں ہوتی اوپر جا کر لمبوترے پتوں کی چھتری سی بنی ہوتی ہے۔ ناریل کے بعض درخت جھکے ہوئے اور ٹیڑھے بھی ہوتے ہیں مگر تاڑ کے درخت بالکل سیدھے اوپر تک گئے ہوتے ہیں۔

ناریل کے درختوں پر تو ناریل لگتے ہیں لیکن تاڑ کے درختوں پر کوئی پھل نہیں لگتا۔ جنگلی اور دیہاتی لوگ درخت کے اوپر چڑھ کر اس کی ایک موٹی شاخ کو کاٹ کر اس کے آگے مٹی کا ایک کٹورا باندھ دیتے ہیں۔ کٹی ہوئی شاخ میں سے ساری رات سفید رنگ کی میٹھی تاڑی قطرہ قطرہ ٹپکتی رہتی ہے۔ صبح تک کٹورا کافی بھر جاتا ہے۔ صبح اسے اتار لیا جاتا ہے اور لوگ اسے بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ یہ جگر کے لیے مفید ہوتی ہے۔ اس وقت تک اس تاڑی میں ذرا سا بھی نشہ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تاڑی ہمیشہ سورج نکلنے سے پہلے درخت سے اتار کر پینی چاہیے۔

سورج نکلنے کے بعد دھوپ اور گرمی کی وجہ سے اس میں نشہ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے شہروں کے غریب مزدوروں کے محلوں میں جو تاڑی بطور شراب بکتی ہے وہ تاڑ کے درخت کی چھال سے کشید کی جاتی ہے اور نہایت گھٹیا قسم کی شراب ہوتی ہے۔ ان شہروں میں تاڑی خانوں کے آگے سڑک کے کنارے ہاتھ سے رکشا چلانے والے، فیکٹریوں اور زیر تعمیر عمارتوں پر کام کرنے والے مزدور لوگ اور ان کی عورتیں آمنے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ مٹی کے آبخوروں سے شراب پیتے ہیں۔ پاس ہی زمین پر پتے پر نمک یا بھنے ہوئے چنے رکھے ہوتے ہیں۔ تاڑی پیتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتے جاتے ہیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے لگتا ہے کہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔

ایک جنگل میں سے گزرتے ہوئے مجھے صبح صبح تاڑ کے درخت سے اتری ہوئی تازہ تازہ تاڑی پینے کا اتفاق ہوا تھا۔ بالکل دہی کی میٹھی لسی کی طرح کا ذائقہ تھا اور اس میں کوئی نشہ نہیں تھا۔ معذرت چاہتا ہوں۔ جنگلوں، بارشوں اور درختوں کا ذکر آتا ہے تو میں اپنے اصل موضوع سے بھٹک جاتا ہوں۔

(باقی آئندہ)